سیاست شرعیہ

مولانا رئیس احمد جعفری (ندوی)

★

ادارۂ ثقافت اسلامیہ پاکستان
۲ کلب روڈ - لاهور

جملہ حقوق بحق ادارۂ ثقافت اسلامیہ محفوظ

پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۵۹ء

تعداد ایک ہزار

طابع
الامان پریس، بیرون موری گیٹ
لاہور

ناشر
محمد اشرف ڈار، سیکرٹری
ادارۂ ثقافت اسلامیہ
لاہور

سیاست شرعیہ

علامہ خلاف کی کتاب "السیاست الشرعیۃ" کا
خاکہ مترجم کی تلخیص، اور ضروری حذف واضافہ
۔ــــ اور ترمیم و تغیر کے ساتھ!

GOVT. BENGALI COLLEGE LIBRARY
Acc. No. 1548
28 JUN 1970
KARACHI.

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھے؟

جہاں گیر و جہاں بان و جہاں دار و جہاں آرا

•

افتتاحیہ! ۱۷ تا ۱۸

اجتہاد! ۱۹ تا ۳۵

اویانِ عالم اور دینِ اسلام کا اساسی اور بنیادی فرق!
کتاب وسنت۔
خلفائے راشدین کا طرزِ عمل۔
خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کا اجتہاد۔
حضرت عمرؓ کے اجتہادات۔
حضرت عثمانؓ کا انداز اجتہاد۔
حضرت علیؓ کی شانِ اجتہاد،
اجتہاد پر پابندیاں،
ایک نئی اصطلاح استحسان۔
جمود اور تعطل کا دور۔
سیاست شرعیہ کی تعریف۔
امام قرافیؒ کا ارشاد۔
علامہ ابن قیم کے خیالات۔

تدریجی ارتقاء ۳۶ تا ۴۸
عربوں کے نظامِ حکمرانی پر ایک نظر!
عربوں کا نظامِ سیاست اسلام سے پہلے۔

عہد رسالت مآب -
خلفائے راشدین کا عہد گرامی -
عرب کی تقسیم صوبوں میں -
حاکموں کی شخصیت اور اُن کے فرائض -
مجلس شیوخ کا حصہ امور دولت میں -
ایوان حکومت اور پارلیمنٹ کی حیثیت سے -
ریاست کی متعدد قسمیں -
امارت عامہ اور امارت خاصہ -
عہد بنو اُمیہ کا نظم مملکت -
عہد عباسیہ کی تبدیلیاں -
مصر کا عرب نظام حکومت -
عربوں کی رواداری -
جوہر صقلی کا طرزِ عمل -
عہد ممالیک کی بنیادی تبدیلیاں -

اسلام کی سیاست ٦٩ تا ٨٠
عدل، مساوات، شوریٰ !
حکومت و دولت -
سیاست خارجیہ -
اسلام اور مصالح انسانی -
اسلامی قوانین کیوں نافذ نہیں ہوتے ؟

اسلامی حکومت کا آئین و دستور

اسلامی حکومت کے اصول اور دائرہ کار! ۸۱ تا ۱۰۹

اسلامی حکومت، اس کی وجہ ھیئت اور بنیاد و اساس ۔

قرآن شوریٰ کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

از روئے احادیث شوریٰ کی اہمیت ۔

حکومت کا کسے حق ہے؟

رسول اللہ ؐ نے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا ۔

قریش کی امامت نہ نص ہے نہ جزو دین ۔

ارباب حکومت اور اُمت ۔

خلفائے راشدین کا طرز عمل ۔

اختیارات کا واحد سرچشمہ ۔

اصول اور تفصیل ۔

پھر یہ انحطاط و تنزل کیوں ۔؟

افراد قوم کے حقوق کیا ہیں ۔؟

ذاتی آزادی ۔

حریت ذات ۔

حریت مسکن ۔

حریت ملکیت

حق ملکیت کا استقرار ۔

فکر و عقیدہ کی آزادی ۔

غیر مسلموں کی آزادیٔ فکر و عقیدہ ۔

رائے کی آزادی۔
حریت تعلیم۔
مساواتِ عامہ۔
اسلام کا امتیاز خاص۔

۱۱۰ تا ۱۳۳ اسلامی مملکت میں۔
اقتدار و اختیار کا سرچشمہ کون ہے؟
اقتدار و اختیار کی کشمکش۔
ایسا کیوں ہوتا ہے؟
علاج .... مگر ناقص۔
ایک اور تجزیہ۔
علاج یا مرض؟
صحیح علاج اسلام ہے۔
شرعی حکومت۔
خداوندی قانون۔
اہل اجتہاد۔
تدوین احکام و قضایا۔
رجال تشریح اور مجتہدات ائمہ۔
خدا کا قانون اسلامی۔
فردی یا اجتماعی۔
جمعیۃ الجبلہ:
اختیارات قضا اور رجال قضا۔

حضرت ابو بکرؓ کا طرزِ عمل -
حضرت عمرؓ کا طرزِ کار -
قضاۃ کا تقرر -
تعدی اور تصرف سے نجات -
اختیارات تنفیذ -
وقت کی ضرورت -

۱۳۴ تا ۱۴۸
مسئلہ خلافت!
خلافت، امارت، امامت!
نصب خلافت کا وجوب -
شروط معتبرہ کیا ہیں؟
کیا امام اپنا ولی عہد مقرر کر سکتا ہے؟
خلیفہ کی حیثیت -
اسلام کا نظام خلافت کیا ہے -
خلیفۃ اللہ یا خلیفۂ رسولؐ -
اُمت کی بالادستی -

۱۴۹ تا ۱۸۴
حکومت اسلامیہ کی خارجہ پالیسی اور اُس کی تشکیل!
عصر حاضر کے تعلقات خارجہ -
قوانین امن و صلح -
قانون جنگ و امن -
اسلام کیا کہتا ہے -

GOVT. BENGALI COLLEGE LIBRARY
Acc. No. ....
KARACHI.

حکومت اسلامیہ اور غیر مسلم ممالک ۔
چند قابل غور دلیلیں ۔
حدیث قتال ۔
کافروں سے ربط و تعلق کی ممانعت ۔
جبری تبلیغ ۔
ذمیوں کے ساتھ رعایت ۔
ذمیوں کی امان کب ٹوٹتی ہے ؟
مسلم اور غیر مسلم ۔
آیات قتال کی تشریح ۔
آیات قرآنی سے استدلال ۔
ناجائز مقاتلہ ۔
خطبۂ حجۃ الوداع ۔
دولت اسلامیہ کی سیاست خارجیہ کے اصول ۔
غیر مسلموں سے تعلق اور علاقہ کی بنیاد ۔
دارالاسلام و دارالحرب ۔
افکار و آراء کا اہم فرق ۔
ہر دو افکار پر محاکمہ ۔
قرآن کریم کی چند آیتیں ۔
آیات قتال کی نوعیت ۔
حدیث نبوی سے کیا ثابت ہوتا ہے ؟
کافروں سے پیمان دوستی ۔

امام رازی کا قول کافروں سے موالات کے بارے میں۔
امام ابن تیمیہ کے ارشادات ۔
سنّتِ رسولؐ کی تائید ۔
ناسخ و منسوخ کی حیثیت ۔
مشرکین کا ظلم و جور ۔
صحابہ کی لڑائیاں ۔
قوی اور ضعیف کی کش مکش ۔

اسلام اور جنگ

۱۸۷ تا ۲۰۳ قتال وجدال اور جنگ و پیکار کے احکام و ہدایات ۔!
اسلام کے جنگی احکام ۔
حربی احکام شرعی نقطہ نظر سے ۔
غیر جنگ جو طبقہ ۔
عذاب دینے کی ممانعت ۔
محصورین جنگ کے ساتھ سلوک ۔
مقابلہ اور موازنہ ۔

غزواتِ نبوی

۲۰۴ تا ۲۲۸ اسلام کے جنگی احکام، غزواتِ نبوی کی روشنی میں!
ہجرت ۔
غزوۂ بدر ۔
غزوۂ بنی قینقاع
غزوۃ السویق

GOVT. BENGALI COLLEGE LIBRARY
Acc. No. 1548
28 JUN 1970
KARACHI.

غزوۂ اُحد -

غزوۂ بیر معونہ -

غزوۂ بنی النضیر (یہود)

غزوۂ ذات الرقاع -

غزوۃ الخندق یا غزوۂ احزاب -

غزوۂ بنی قریظہ -

غزوۂ ذی قرد -

غزوۂ بنی المصطلق -

بیعتِ رضوان -

غزوۂ خیبر -

غزوۂ وادی القریٰ -

مکاتیب نبوی -

عمرۃ القضاء -

خالد بن ولید کا مع ہمراہیوں کے اسلام لانا -

قریش اور رسول اللہ صلعم کے درمیان صلح کی شکست اور فتح

مکہ سنہ ۸ھ میں -

غزوۂ موتہ -

غزوۂ حنین -

طائف کا محاصرہ -

صلح و امن سے متعلق،

اسلام کے احکام و ہدایات!

مسلم اور غیر مسلم کے مابین ربط و تعلق -

غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں سہولتیں۔
میراث کے مسئلہ میں ذمی اور مسلموں کی مساوات۔
اعتقادات وعبادات کی حریت۔
غیر مسلموں سے مسلمانوں کے عہد نامے۔
امام ابو یوسف کی رائے۔
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا مکتوب۔
امام ابو یوسف کی ایک اور روایت۔
حیرت انگیز فیصلہ۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکتوب۔
غیر مسلموں سے تجارتی تعلقات۔
بات کا بتنگڑ۔

مملکت اسلامی کا مالی نظام اور اس مالی نظام کے وسائل و ذرائع! ۲۴۴ تا ۲۹۲
محاصل اور ٹیکس۔
ذرائع آمدنی کی بنیاد۔
مالیات اسلامی کی بنیاد و اساس۔
زکوٰۃ اور جزیہ۔
خراج کی نوعیت۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کا نفاذ۔
درآمد و برآمد کے محاصل۔
محاصل کے شرائط۔

ٹیکس اور ڈاکہ۔
محاصل اسلامی کی نوعیت۔
حضرت عمر رضؓ کا ایک سوال۔
عدل اور شرائط اقتصاد۔
نمونہ اور اسوہ۔

۲۶۳ تا ۲۷۸ دولتِ اسلامیہ آفکار
مالی وسائل و ذرائع!
زکوٰۃ۔
زکوٰۃ کس مال پر جائز ہے۔
زکوٰۃ کے ضروری شرائط۔
زکوٰۃ مفروضہ کی قسمیں۔
خراج۔
خراج اور عشر کی نوعیت۔
حضرت عمر رضؓ کا ایک اہم اجتہاد۔
خراجی زمین کی قسمیں۔
جزیہ۔
جزیہ کی اصل کیا ہے۔
جزیہ کی تعیین اور فقہاء اسلام کی تصریح۔
جزیہ کے بارے میں فرمان رسالت ؐ۔
عشور۔
خمس غنائم کی اصلیت۔

قاضی ابویوسف کی رائے ۔

۲۷۹ تا ۲۹۳
دولتِ اسلامیہ اور اس کے مصارف
نوعیت، تعین، تشریح!

حکومت کے مصارف اور اُن کی نوعیت ۔
حدیث نبوی کی تصریحات ۔
اموال زکوٰۃ کے مصارف ۔
کتاب الخراج کا اقتباس ۔
قاضی ابویوسف کا قول ۔
فئے کی اصلیت و حقیقت ۔
حضرت عمرؓ کا مسلک ۔
قاضی ابویوسف کی رائے ۔
دولتِ اسلامیہ کی آمدنی اور مصارف ۔
بیت المال کی آمدنی کی قسمیں ۔
اللہ کا حق ۔
حقیقت بالغہ ۔

۲۹۴ تا ۳۰۲
حکومتِ اسلامیہ کا مالیہ
آمدنی اور مصارف کی نوعیت ۔!

صدقہ و زکوٰۃ کے محصل ۔
زکوٰۃ کی فراہمی اور وصولی ۔
اموال خفی و جلی ۔
حکمت و مصلحت ۔

دول اسلامیہ کی تاریخ ۔

بیت المال

٣٠٣ تا ٣١١

موارد اسلامیہ کی تاریخ کا ایک مختصر جائزہ!
حضرت عمرؓ کا عہد فرمانروائی ۔
علامہ ابن خلدون کا قول ۔
حد بندی ۔
حسن کارکردگی ۔
بداوت اور حضارت ۔
بنو عباسؓ کا اقتدار ۔
بنو عباس کا زوال و انحطاط ۔

افتتاحیہ

پاکستان صرف ایک آزاد ملک ہی نہیں ہے۔ وہ ایک عوامی حکومت (جمہوریہ) کا بھی حامل ہے، اور یہ عوامی حکومت یعنی جمہوریہ، خود رائے، خود سر اور خود مختار نہیں ہے، بلکہ از روئے آئین و دستور "اسلامیہ" بھی ہے۔ یعنی اس کے قوانین، اس کا نظم مملکت، اس کے تعزیرات و قوانین ہر چیز "اسلامی" ہے، کتاب سنت کی تابع ہے۔

یوں تو علمی حلقوں میں ایک عرصہ دراز سے یہ سوال زیر بحث رہا ہے۔ کہ اسلامی حکومت کیا چیز ہوتی ہے؟ کس طرح تشکیل پذیر ہوتی ہے؟ اس کے نوامیس و شرائع کیا ہوتے ہیں؟ اس کا انداز ترکیب و ترتیب کیا ہوتا ہے؟ لیکن یہ ایک علمی سوال تھا، علمی ہی انداز میں اس کا جواب دیا جاتا رہا۔ لیکن اب معاملہ قول سے گزر کر عمل تک آگیا ہے۔ اب تک ملت اسلامیہ حسرت تعبیر کی شکوہ سنج تھی۔ اب اسے موقع ہے کہ اپنی قسمت بنائے، اپنی حکومت قائم کرے، اپنی راہ عمل متعین کرے، اپنے اصول حیات، اقدار، زندگی۔ قوانین ملی اور ضوابط قومی بنائے۔ اور ان پر عمل کرے۔ اور اپنے عمل سے دنیا کو یہ بتا دے کہ اسلام کی حکومت کس طرح بن سکتی ہے؟ اس کے حدود کیا ہوتے ہیں؟ اور ان حدود کو کیونکر بر سر عمل لایا جاتا ہے۔؟

اس سلسلہ میں ہم مصر کے ممنون ہیں۔ ماضی قریب ہی وہاں سے دو بلند پایہ کتابیں اس موضوع پر شائع ہوئیں۔ ایک ڈاکٹر حسن ابراہیم اور پروفیسر علی ابراہیم کی۔

"النظم الاسلامیۃ" دوسری علامہ عبدالوہاب خلاف مفتش محاکم شرعیہ مصر کی؛ جس کا نام "السیاست الشرعیہ" ہے۔

اس آخری کتاب کا تمام وکمال ترجمہ میں نے کیا تھا، پھر مناسب معلوم ہوا کہ اس ترجمہ کی قدر وقیمت اور افادیت واہمیت بڑھ جائے گی۔ اگر اس کے مباحث میں "النظم الاسلامیہ" کے بعض مباحث کی پیوندکاری بھی کردی جائے۔ اس طرح مسائل زیر بحث زیادہ واضح ہو جائیں گے اور پڑھنے والا نسبتاً زیادہ انشراح قلب کے ساتھ ان مسائل کی صحیح نوعیت سے واقف ہو سکے گا۔

ایک مسلمان ملک میں اسلامی نظام حیات اور نظم مملکت کا مسئلہ صرف جذباتی ہی نہیں عملی بھی ہے۔ اسے صرف وعظ وپند سے حل نہیں کیا جاسکتا، نہ اسے جبر وجور کے ذریعہ روبہ عمل لایا جاسکتا ہے، یہ صرف افہام وتفہیم ہی سے حل ہو سکتا ہے اور اس کی صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ پوری تفصیل اور وضاحت سے یہ بتا دیا جائے کہ حکومت اسلامیہ یا حکومت الہیہ کے حدود وشرائط کیا ہیں؟ جب تک یہ تصویر اپنے خد وخال کے ساتھ نظر کے سامنے نہیں آجاتی، اس وقت تک غلط فہمیاں بھی باقی رہیں گی۔ اور غلط کاریاں بھی عالم وجود میں آتی رہیں گی۔ لیکن اگر یہ تصویر اپنے پورے آب ورنگ کے ساتھ نظر کے سامنے آجائے تو پھر نہ غلط فہمی کا کوئی امکان باقی رہ جائے گا اور نہ غلط روی کا بیں نے اس کتاب میں یہی کوشش کی ہے کہ اسلامی نظام حکومت کا صحیح نقشہ نظروں کے سامنے آجائے، یہ مسئلہ ان لوگوں کے لئے بھی قابل غور ہے جو برسر اقتدار طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان حضرات کے لئے بھی جو حزب مخالف کے روح رواں ہیں۔ اور ان اصحاب کیلئے بھی جو صرف "پبلک" ہیں اور وہ شخص جو مسلمان ہے اسے اس مسئلہ پر غور کر کے ایک آخری رائے قائم کر لینی چاہیئے۔

رئیس احمد جعفری

رفیق ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

۱۷ اکتوبر ۱۹۵۶ء

اِجتہاد

ادیانِ عالم اور دینِ اسلام کا اساسی اور بنیادی فرق

دنیا کے تمام مذاہب، اپنے پیروؤں اور ماننے والوں سے، سب سے پہلے جو چیز چھینتے ہیں وہ ہے متاعِ فکر و نظر۔ نصرانیت، یہودیت، بدھ مت، جین مت، ہندو دھرم ان سب کے مطالعہ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ ان مذاہب میں تحقیق و اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ ان کے برعکس اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو قدم قدم پر تفکر اور تعقل کی دعوت دیتا ہے، جو بار بار اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں یعنی مسلمانوں اور کافروں کو اس پر ابھارتا ہے کہ وہ جو راستہ اختیار کریں، سوچ سمجھ کر اختیار کریں۔ جس عقیدہ کو اپنائیں، اسے اچھی طرح چھان پھٹک لیں۔ جس نظامِ دینی کی پیروی اختیار کریں، اسے پورے طور پر جانچ لیں۔ وہ لوگوں کے ذہن و دماغ پر پہرہ نہیں لگاتا، انہیں موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے ذہن سے کام لیں۔ اپنے دماغ کی رہنمائی میں رہروی کریں۔

اجتہاد ــــــــ اسلام کا سب سے بڑا تحفہ ہے جو اس نے دنیائے انسانیت کو عطا فرمایا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایسی قوم بنا دیا جس نے مختصر ترین عرصہ میں دنیا پر اپنی سلطانی کا سکہ جما لیا۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے چھوڑنے کے بعد وہ ادبار و انحطاط کے گڑھے میں گر گئے۔ جب تک ان کی قوتِ اجتہاد قائم رہی وہ خیرِ اُمم بنے رہے۔ جس دن اس قوت سے محروم ہوئے کچھ نہ رہ گئے۔ آئیے دیکھیں اس راستہ کی طرف اسلام

دنیا کے تمام مذاہب، اپنے پیروؤں اور ماننے والوں سے، سب سے پہلے جو چیز چھینتے ہیں وہ ہے متاعِ فکر و نظر۔ نصرانیت، یہودیت، بدھ مت، جین مت، ہندو دھرم ان سب کے مطالعہ سے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ ان مذاہب میں تحقیق و اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ ان کے برعکس اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو قدم قدم پر تفکر اور تعقّل کی دعوت دیتا ہے، جو بار بار اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں یعنی مسلمانوں اور کافروں کو اس پر ابھارتا ہے کہ وہ جو راستہ اختیار کریں، سوچ سمجھ کر اختیار کریں جس عقیدہ کو اپنائیں، اسے اچھی طرح چھان پھٹک لیں جس نظامِ دینی کی پیروی اختیار کریں، اسے پورے طور پر جانچ لیں، وہ لوگوں کے ذہن و دماغ پر پہرہ نہیں لگاتا۔ انہیں موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے ذہن سے کام لیں۔ اپنے دماغ کی رہنمائی میں رہروی کریں۔

اجتہاد ——— اسلام کا سب سے بڑا تحفہ ہے جو اس نے دنیائے انسانیت کو عطا فرمایا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایسی قوم بنا دیا جس نے مختصر ترین عرصہ میں دنیا پر اپنی سلطانی کا سکہ جما لیا۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے چھوڑنے کے بعد وہ ادبار و انحطاط کے گڑھے میں گر گئے جب تک ان کی قوتِ اجتہاد قائم رہی وہ "خیر الامم" بنے رہے۔ جس دن اس قوت سے محروم ہوئے کچھ نہ رہ گئے۔ آیئے! دیکھیں اس راستہ کی طرف اسلام

کس طرح رہنمائی کرتا ہے۔؟

کتاب وسنت

جناب رسالت مآب اپنی زندگی میں مرجع مسلمین تھے، جب ک
کو کچھ دریافت کرنا ہوتا۔ حاضر ہوتا اور پوچھ لیتا۔ خدا کی طر
سے وحی کی صورت میں جو کچھ نازل ہوتا تھا، وہی رسول اکرم کی زبان پر آکر قانون بن
تھا ہر وہ سوال جو قضا سے متعلق ہو یا تشریع سے تعلق رکھتا ہو یا تنقید سے اس کا لگاؤ
اسی روشنی میں حل کیا جاتا تھا۔

جب رسول اللہؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ نے اپنی امت کے لئے
ہادی اور رہنا چھوڑے۔

(۱) کتاب اللہ

(۲) سنتِ نبوی

آپ اپنے پیچھے ایک مینارۂ نور بھی چھوڑ گئے، جو اجتہاد کے نام سے معروف ہے
جب کسی مسئلہ کا حل کتاب سنت سے نہ ہوتا ہو تو اجتہاد سے کام لیا جا سکتا ہے۔ رسول
اکرمؐ نے طریقِ اجتہاد کی رہنمائی بھی فرمائی۔ اور اپنے قول، عمل اور اقرار سے اس کی طرف
دعوت دی، آپ جب احکام بھیجتے تھے، تو بالعموم ان کے ساتھ ان کے مصالح اور
علل بھی ارشاد فرما دیتے تھے، اس طرح احکام اور ان کے مصالح میں ایک قسم کا ربط پیدا
ہو جاتا تھا۔ ان کی غرض وغائت واضح ہو جاتی تھی۔

مثلاً فرمایا کہ بلّی کا جھوٹا ناپاک نہیں ہوتا، اور اس کی وجہ بھی ارشاد فرمادی ک
ان جانوروں میں ہے جو "گھریلو بن چکے ہیں" اور اس طرح کی دوسری مثالیں "نظائر"
کا کام دیتی ہیں، ان سے حکم کی علت معلوم ہو جاتی ہے، یہ طرز گویا اجتہاد کی طرف
براہِ راست رہنمائی ہے۔

اگر ہم اس طرح کے احکام اور ان کے مصالح وعلل پیش نگاہ رکھیں تو اسی نوعیت

کے دوسرے معاملات میں ہم ان سے "نظائر" کا کام لے سکتے ہیں۔ اور ہر ایسے مسئلہ میں جس کے بارے میں نص خاموش ہو، ایسے ہی مصالح اور علل کو سامنے رکھ کر اجتہاد کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ نے حسب موقع و ضرورت اپنے صحابہ کو اجتہاد کی ہدایت کی اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے فرمایا کہ اگر مجتہد نے صحیح اجتہاد کیا تو اسے دو اجر ملیں گے، اور اگر غلط کیا تو ایک اجر ملیگا۔

ایسا بھی ہوا کہ آپ نے کسی بات کی ممانعت فرمائی، پھر جب حالات بدل گئے تو آپ نے اجازت بھی مرحمت فرما دی۔ مثلاً آپ نے فرمایا ـــــ "میں نے تمہیں زیارت قبور کی ممانعت کی تھی، لیکن اب تم زیارت قبور کر سکتے ہو ـــــ"!

اسی طرح جب دو صحابی سفر کو نکلے، نماز کا وقت آگیا، پانی نہ ملنے کے سبب انہوں نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی، ابھی نماز کا وقت تھا کہ پانی دستیاب ہو گیا، ان میں سے ایک نے وضو کر کے دوبارہ نماز ادا کی، دوسرے نے ایسا نہیں کیا، رسول اللہ کے سامنے جب یہ مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے دونوں کے فعل کو جائز قرار دیا جن صحابی نے دوبارہ نماز نہیں پڑھی تھی، ان سے فرمایا "تم نے ٹھیک کیا تمہاری نماز ہو گئی، جنہوں نے دوبارہ نماز پڑھی تھی ان سے فرمایا" تمہیں دوہرا ثواب ملیگا"!

ان واقعات سے اور اس طرح کی مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرع کی غرض و غائت مصلحت وقت پر مبنی ہے، ہمیشہ تقاضائے حالات کے مطابق شرعی احکام خدا کی طرف سے نازل اور نافذ ہوئے، اس سے ثابت ہو گیا کہ اگر کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جس کے بارے میں نص نہ موجود ہو تو حالات و مصالح کے لحاظ سے اجتہاد سے کام لیا جا سکتا ہے۔

خلفائے راشدین کا طرزِ عمل

وفات رسول کے بعد یہی وہ راستہ تھا جس پر خلفائے راشدین چلے، انہوں نے حکومت کے

معاملات عامہ میں کوئی نص نہیں دیکھی تو اجتہاد رائے سے کام لیا، ان کا اصول یہ تھا
کہ سب سے پہلے مسئلہ زیر بحث میں وہ نص کی تلاش کرتے تھے، پھر قول رسولؐ اور سنت رسول
کی جستجو کرتے تھے۔ اگر یہ دیکھتے تھے کہ کتاب و سنت میں کوئی حکم نہیں ملتا تو اجتہاد و
سے کام لیتے تھے، کسی حالت میں وہ دین کی روح اور اصل کے خلاف نہیں جاتے
تھے، ہر حالت میں اسے پیش نظر رکھتے تھے۔ پھر اُمت کے لئے جو کچھ مناسب سمجھتے تھے
اسے اپنے اجتہاد کے مطابق بر وکار لاتے تھے۔

ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی نے اجتہاد کیا، وہ اجتہاد نہ صرف یہ کہ دوسرے کے
اجتہاد سے الگ ہے بلکہ ظاہر نص سے بھی مخالف ہے لیکن مجتہد کو یہ الزام کبھی نہیں د
جاتا تھا کہ وہ حق پر نہیں ہے یا غلط راستہ پر گام فرسا ہے۔ اس لئے کہ اصل غائت تو
تھی کہ امت کی مصلحت اور خدا کے بتائے ہوئے عدل کو بر سر کار لایا جائے۔ اور اس
کے وسائل میں ایک وسیلہ یہ بھی تھا۔ کہ اگر ضرورت اجتہاد ہو تو اجتہاد و رائے اور وسعت
نظر سے بھی کام لیا جائے۔

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ کا اجتہاد

حضرت ابوبکر نے اجتہاد کیا، آپ مسلمانوں کے
لئے حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنا گئے۔ ایک اجتہاد
یہ تھا، دوسرا اجتہاد حضرت عمرؓ کا تھا، انہوں نے کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا چھ آدمی
کو نامزد کر دیا، کہ انہی میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنا لیا جائے، دونوں کا اجتہاد ایک
دوسرے سے الگ ہے اور فعل رسولؐ بھی مختلف ہے، سب جانتے ہیں کہ رسول اللہ
نہ حضرت ابوبکرؓ کی طرح کسی کو خلیفہ بنایا۔ نہ حضرت عمر کی طرح خلافت کے لئے چھ
آدمی مقرر کئے۔ اب غور کیجئے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر میں سے کسی پر بھی یہ الزام نہیں
لگایا گیا کہ انہوں نے خلاف شرع کام کیا۔ اس لئے ہر دو بزرگوں نے امت کی مصلحت
اور حالات کے مطابق اجتہاد سے کام لیا۔

حضرت عمرؓ کے اجتہادات

حضرت عمرؓ نے اپنے اجتہاد سے تین طلاقوں کو کلمۂ واحد کے ساتھ جائز ٹھہرایا یعنی اگر کسی شخص نے ایک ہی وقت میں تین طلاقیں اپنی بیوی کو دے دیں تو آپ نے انہیں نافذ مان لیا۔ حالانکہ آپ سے قرآن حکیم کا یہ ارشاد مخفی نہیں تھا کہ الطلاق مرتان اور آپ یہ بھی جانتے تھے کہ رسول اللہؐ کے دور میں اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اور خود آپ کے زمانۂ خلافت کے بڑے حصہ میں ایک وقت میں دی ہوئی تین طلاقیں ایک طلاق کا حکم رکھتی تھیں. آپ کو یہ بھی علم تھا کہ عہد نبوی میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔ رسول اللہؐ نے اس سے فرمایا: ہم تمہارے درمیان موجود ہیں اور تم کتاب اللہ سے کھیل کرتے ہو؟ غرض ان باتوں میں کوئی بھی حضرت عمرؓ سے مخفی نہیں تھی، لیکن آپ نے دیکھا لوگ یہ کھیل زیادہ کھیلنے لگے ہیں۔ تو آپ نے کہا کہ پھر انہیں اس کے نتائج بھی بھگتنے چاہئیں۔ مقصد یہی تھا کہ یہ کھیل بند ہو جائے یا کم تو بہر حال ہو جائے چنانچہ آپ نے خود فرمایا:۔

”جس کام میں لوگوں کو دھیرج سے کام لینا چاہیئے اس میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں تو ہم ان پر عائد ہی کیوں نہ کر دیں؟“

چنانچہ بالآخر آپ نے عائد کر دیا۔

اسی پر اظہار خیال کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ نے کہا ہے:۔

”عہد عمرؓ کی سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ یک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو عائد مان کر فیصلہ کر دیا جائے۔ چنانچہ فیصلہ کر کے آپ نے تحلیل کا دروازہ بند کر دیا۔ تاکہ لوگ حلالہ سے باز رہیں؟“

حضرت عثمانؓ کا عرفانی اجتہاد

حضرت عثمانؓ نے بھی اجتہاد کیا، فریضۂ جمعہ کے لئے آپ نے اذان ثانی کی ”جدت“ نافذ

فرمائی۔ کیونکہ امت کی مصلحت کا تقاضا یہی تھا، پھر جب مسلمانوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا تو آپ نے لوگوں کو حرف واحد کی قرأت پر اپنے اجتہاد سے مجبور کر دیا، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ قرآن سات حرفوں پر اترا ہے، خود رسولؐ نے وہ الگ قاریوں سے جو جداگانہ حرفوں کی قرآت کر رہے تھے فرمایا تھا: قرآن ان حرفوں پر بھی نازل ہوا ہے اور ان حروف پر بھی!

رسولؐ اللہ کے اس ارشاد کو جانتے ہوئے حضرت عثمانؓ حرف واحد کی قرآت کے اجتہاد پر اس لئے مجبور ہوئے کہ اب اسلام کی مملکت میں توسیع ہو رہی تھی، مسلمانوں کا حلقہ روز بروز بڑھ رہا تھا، حفاظ مختلف شہروں میں پھیل رہے تھے، لہٰذا اندیشہ پیدا ہوا کہ حروف متعددہ کی قرآت کہیں فتنۂ اختلاف کی موجب نہ ہو۔ اس فتنہ کو روکنے کے لئے آپ نے حرف واحد کی قرآت نافذ کر دی۔

حضرت علی کی شان اجتہاد:

امیر المومنین علی علیہ السلام نے بھی اجتہاد فرمایا، اور روافض کو آگ سے جلایا۔ حالانکہ جناب امیر خوب جانتے تھے کہ کفر (بعد از اسلام) کی سزا قتل ہے، نہ کہ تحریق لیکن انہوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ جرم جتنا زیادہ سنگین ہے سزا بھی ویسی ہی شدید ہونی چاہیئے۔ اور وہ تحریق ہی ہو سکتی ہے، لہٰذا قتل کے بجائے تحریق سے کام لیا گیا۔

غرض فصل قضایا نفاذ احکام اور معاملات و مسائل کے تصفیے میں جو اسلوب اور جذبہ کارفرما تھا، وہ یہ تھا کہ ہر اس دلیل پر اعتماد کیا جائے جو قلب کو مطمئن کرتی ہو، جو حق کے خلاف نہ ہو، ان چیزوں کے سامنے، اقرار، انکار اور دلائل ظاہرہ کی زیادہ پروا نہیں کی جاتی تھی چنانچہ یہ حکم کہ جو چوری کا مال لئے ہوئے پکڑا جائے اس پر چوری کی حد جاری کی جائے۔ اسی ضمن (اجتہاد) میں آتا ہے، اس مسئلہ پر ابن قیم نے اپنی کتاب "السیاستہ الشرعیہ فی الطرق الحکمیہ" میں بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔

اسی طرح احکام و حدود کے اجرا اور نفاذ میں بھی تقاضائے مصلحت اور لوگوں کے حالات کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ مثلاً ایک قحط کے موقع پر چوری کی سزا (قطع ید) معطل کر دی تھی۔ اسی طرح جب اسلام خوب پھیل گیا اور سربلند ہو گیا، تو عمرؓ نے مولفۃ القلوب کا جو حصہ مالِ غنیمت میں ہوتا تھا، وہ بند کر دیا۔ بغرض تشریح، قضا اور تنفیذ میں یہ وہ مسلک تھا جو دورِ اول کے مسلمانوں نے اختیار کیا تھا اور ثابت ہو گیا کہ حکومت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی صراطِ مستقیم یہی تھی وہ ایسا طرزِ حکومت تھا جو کسی حادثہ سے یا کسی ضرورت سے کسی تنگنائے میں محصور نہیں ہوتا تھا، کسی مصلحت اور ضرورت کی تحقیق و تفتیش میں قاصر نہیں رہتا تھا۔ زمانہ کے حالات اور ماحول سے کنارہ کش نہیں رہتا تھا، عصری تغیرات اور مطالبات کو نظر انداز نہیں کرتا تھا، یہ وہ راستہ تھا جس پر گام فرسائی کے بعد کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ شریعت اسلامیہ نے انسانی حالات اور مصالح کو پیش نگاہ نہیں رکھا ہے۔ اس پر عمل کرنے کے بعد کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے، جو پوری نہ ہوتی ہو، اسلام کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ یہ شرعی ہے، اور وہ سیاسی ہے۔ اسلام کا ہر حکم شرعی ہے جسے خدا نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا، اپنے رسول کی زبانِ مبارک سے جاری فرمایا، یا جس کی طرف اربابِ رائے کو ہدایت دی کہ اپنے اجتہاد سے وہاں تک پہونچیں۔

چنانچہ انہوں نے کتاب و سنت کی روشنی میں سخت و شدید سعی و کوشش کے بعد اجتہاد کیا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے امت کی مصلحت اور ضرورت کا کھوج لگایا اور اسے پا لیا۔ اللہ نے شریعتوں کو اپنے بندوں کی مصلحت اور ضرورت ہی کے مطابق نافذ کیا ہے۔

اجتہاد پر پابندیاں

اس عہد گرامی کے بعد وہ دور آیا کہ فقیہ مجتہدوں نے اجتہاد کا ایک خاص طریقہ وضع کر لیا، انہوں نے وہ شروط وضع کئے اور مصلحت کے وہ اصول مرتب کئے جن کا اعتبار لازم و واجب گردانا ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ شرع الٰہی کو لوگ تختہ مشق بنائیں یا ممکن ہے وہ یہ سمجھتے ہوں کہ سابقین کے مقابلے میں ان کی متاع دانش فرومایہ ہے ان وجوہ کے علاوہ ڈھونڈا جائے تو کچھ اور وجہیں بھی دستیاب ہو سکتی ہیں، بہرحال یہ التزام مجتہد کی آزادی رائے پر ایک ناروا پابندی ثابت ہُوا، اسی لئے اجتہاد کا دائرہ تنگ ہو گیا، نتیجہ یہ ہُوا کہ بہت سے ایسے فیصلے کر دیئے گئے جن میں مصالح امت اور امور مہمہ نظر انداز ہو گئے۔

عہد صحابہ کے اجتہاد میں مصلحت امت کا لحاظ رکھا جاتا تھا، وہ فطرت سلیم اور نظر صحیح کی رہنمائی قبول کرتے تھے، بعد میں مخصوص مصالح پیش نظر رہ گئے، اور مرجع و منبع قواعد موضوعہ کو بنا لیا گیا، یہیں سے دائرہ تشریع میں تنگی پیدا ہوتی ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق تک پہنچنے کے لئے فصل قضایا میں خاص خاص طریقے معمول بہ بنا لئے جاتے ہیں، اور اجتہاد کرنے والے کے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے ہیں۔

اس دور کے مجتہدین بھی بعض معاملات میں قیود کی تنگی اور قواعد موضوعہ کی نادرستی محسوس کرتے ہیں، انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس صورت حال کے باعث لوگ نئی نئی زحمتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ تنگنائے اجتہاد سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک نئی اصطلاح استحسان

مثلاً عقد مزارعت کے مسئلہ کو لیجئے مجتہدین کے قواعد موضوعہ کی رو سے ان کا یہ اجتہاد

باطل ہوگیا، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مصالح عوام کا تقاضا یہی ہے، تو انہوں نے اجتہاد کا ایک نیا شاخسانہ "استحسان" کے نام سے پیدا کیا، سچ پوچھئے تو اس استحسان کا شمار اجتہاد فطری کے "باقیات الصالحات" میں ہونا چاہیئے۔

تشریع میں مصالح مرسلہ سے غفلت، اعتبار قرآن سے روگردانی، خاص خاص طریق اجتہاد و تنقید کا التزام ——— احق تک پہنچنے کے لئے یہ ذرائع اختیار کئے گئے، پھر یہی ذرائع اس "فقہ اسلامی" کی تشکیل کے موجب ہوئے۔ جو حکومت کے حالات کو سنوارنے سے قاصر رہی، جو مصالح امت کی وسعت کا ساتھ نہ دے سکی، جو زمانے کی گردشوں سے بے پروا رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ سیاستدان عمال و حکام، حکومت کے ارباب اقتدار و اختیار، لوگوں کے مصالح مطلقہ پر نظر رکھ کر کاروبار کی تدبیر کرتے رہے اور نظم و قوانین میں اس چیز کو پیش نظر رکھتے رہے، انہوں نے وہ التزام نہیں روا رکھا جو سلف اول کے مجتہدین کرام کا راہنما تھا۔

ایک دوسرا گروہ تھا جس نے طریق حکمیہ کی وسعت کو ضروری سمجھا، اور قوانین عقوبات کو لازم گردانا اس لئے کہ اس کے نزدیک اہم ترین بات یہ تھی، کہ امن قائم رہے اور مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے، حالانکہ ضرورت اس کی تھی کہ قرائن و مصالح کا پورا پورا لحاظ کیا جاتا اور ان ناروا پابندیوں کو توڑ دیا جاتا جو فقہا کی طرف سے عائد کی گئی تھیں۔

یہیں سے مسلمانوں میں نظم احکام کی دو صورتیں نمایاں اور ممتاز طور پر نظر آتی ہیں۔

ایک تو یہ کہ فقہا نے اپنے اصول و قیود کے مطابق احکام و مسائل کا استنباط و استخراج کیا؛

دوسرے یہ کہ مصالح مطلقہ اور حالات زمانہ کے مطابق حکام وعمال نے
ایک راہِ عمل اختیار کر لی یہ قسم ثانی حالات کے ساتھ ساتھ گردش کرتی رہتی
کبھی یہ حدود اعتدال میں رہتی تھی، اس میں ان مصالح کا بھی خیال رکھا جاتا
تھا، جو حدود دین سے متجاوز نہیں ہونے دیتے تھے، اور نہ دین کے اصول
سے روگردانی ممکن ہوتی تھی، نیز اغراض اور مصالح جزئیہ بھی نظر انداز نہیں
ہونے پاتے تھے۔

اس کے بعد جو دور آیا اس میں تو فقہاء اسلامی نے
جمود اور تعطّل کا دور! مصالح عوام سے اتنی بے پروائی برتی کہ اجتہاد کا
دروازہ ہی بند کر دیا گیا، اور فقہا نے صرف اس پر اکتفا کر لیا کہ ان کے ائمہ
نے جو کچھ اپنے زمانہ میں استنباط و استخراج کر لیا ہے اسی پر قناعت کی جائے
اور اسے ذرا نہ سوچا کہ ماضی اور حالات کے کوائف نیز معاملات اور مسائل میں
کتنا زبردست تفاوت اور فرق ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فقہاء اور مصالح عوام میں
بعد المشرقین پیدا ہو گیا، آخر بعض اسلامی حکومتوں کے ارباب کار نے زمانہ
حالات اور مراعات مصالح کے پیش نظر بعض ایسے قوانین بنا لئے جو اگرچہ
فقہا متبوعین کے اقوال سے مختلف تھے۔ لیکن اصول دین اور مراعات مصالح
کے لحاظ سے جائز اور مستحسن تھے

چنانچہ اسی اصول پر مصر کی وزارت حقانیہ نے احوال شخصیہ سے متعلق
بعض احکام کو از سر نو ترتیب دیا ہے، مثلاً طلاق، دعوائے نسب، نفقہ،
سن الحضانۃ، موت مفقود الخبر،

سیاست شرعیہ کی تعریف | سیاست شرعیہ کی تعریف یہ ہے کہ جمہور کے
لئے رحمت کا دروازہ کھول دیا جائے

لیکن یہ دروازہ کھولے کون؟ کوئی خارج از شریعت مادہ نہیں بلکہ خود شریعت مطہرہ! امراض اجتماعیہ کے علاج کے لئے علماء ہی کی تشخیص حذاقت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، یہاں تک کہ لوگ خود محسوس کر لیں کہ شریعت انہیں تنگی اور زحمت سے نجات دلاتی ہے، سختی اور درشتی سے نکال کر وسیع اور فراخ میدان میں کھڑا کر دیتی ہے۔

مملکت اسلامیہ میں عوام کے حالات کا وہ سلجھاؤ سیاست شرعیہ کہلاتا ہے جس میں تحقیق مصالح اور دفع مضار ——— جو حدود شرعی اور دین کے اصول کلیہ سے نہ ٹکراتے ہوں، اگرچہ ائمہ مجتہدین کے اقوال سے متصادم ہوں ——— کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، یا دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ حالات و حوادث کے وقوع کی صورت میں یہ وہ طرزِ عمل ہے جو سلف اوّل کے نقشِ قدم سے ماخوذ ہے۔ حالات عوام سے مراد وہ حالات ہیں جو زندگی میں استواری پیدا کرتے ہوں خواہ ان کا تعلق امور مالی سے ہو یا قضائی سے، یا پھر ان کا تعلق امور تنفیذی سے ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ استواری پیدا کرنے والے حالات داخلی یا خارجی نوعیت کے ہوں، غرض جن امور میں اصول دین اور سلف اول کے طرز کار کو پیش نظر رکھ کر نئے حالات میں نیا اقدام کیا جائے وہی سیاست شرعیہ ہے۔

امام قرافی کا ارشاد

اگر حدود شرعی سے تجاوز نہ ہوتا ہو، تو نئے حالات میں نیا اقدام ازالۂ مفاسد اور اصلاح احوال کے لئے جائز ہے، ذیل میں چند اکابر علماء کے اقوال اس سلسلہ میں درج کئے جاتے ہیں، جن سے اس نظریہ کی صداقت کا اندازہ ہو گا۔

استاد علاؤالدین نے اپنی کتاب "معین الحکام" میں امام قرافی کا قول نقل کیا ہے۔

، احکام سیاسی میں حکام (کے اختیارات) کی وسعت شرع کی مخالف نہیں ہے، بلکہ قواعد کے لحاظ سے بوجوہ ذیل اس کا تائید ہی ہوتی ہے۔

(۱) اب فساد بڑھ گیا ہے، عصر اول کے برخلاف اس میں زیادتی ہو گئی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اختلاف حالات کے مطابق جن احکام کی تشریح کی جائے۔ وہ شرع کے قوانین کلیہ سے ہم آہنگ ہوں۔

(۲) مصلحت مرسلہ کی تعریف کیا ہے؟ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مصلحت مرسلہ سے مراد یہ ہے کہ وہ مصلحت جو شارع علیہ السلام کے زمانہ میں نہ درپیش آئی ہو۔ اور جس کے منفی یا مثبت پہلو سے متعلق کوئی واضح حکم پہلے سے نہ موجود ہو،

ایسے مواقع پر خود صحابہ کرام نے بھی حالات کے مطابق نئے نئے احکام وضع کئے۔

مثلاً قرآن شریف کا ضبط تحریر میں لانا یا حضرت ابو بکرؓ کا حضرت عمرؓ کو خلافت کا ولی عہد مقرر کرنا، یا دفاتر کا قائم کرنا، یا سکّہ کا ڈھالنا، یا جیل خانوں کا بنانا یا اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جو نئے حالات میں نئے احکام کے ماتحت عمل میں آئیں، جن کی نظیر عہد شارع میں کہیں نہیں ملتی، یہ سب چیزیں مصلحت مطلقہ کے ماتحت عالم وجود میں آئیں۔

(۳) شرع نے اصول شہادت میں بڑی سختی ملحوظ رکھی ہے، روایت کے اصول میں بھی وہ سختی نہیں ہے! شہادت کے اہم شروط میں

سے یہ بھی ہے کہ شہادت دینے والے آزاد ہوں۔ ان کی تعداد بھی
معین کر دی گئی ہے۔ مثلاً زنا کی شہادت ۴ آدمیوں سے کم کی مقبول
نہیں ہے، اور قتل کی گواہی کے لئے ۲ آدمی کافی ہیں۔
اگرچہ خون کا معاملہ بے حد اہم ہے لیکن زنا کے بارے میں گواہوں کی تعداد
جو زیادہ رکھی گئی ہے وہ اس لئے کہ مقصود جرم کا افشا نہیں بلکہ عیب پوشی ہے۔
معاملات شرع میں ایسے اختلافات کثرت سے ملیں گے کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ وہ رونما
ہوئے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کسی زمانہ میں بھی احوال کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

علامہ ابن قیم کے خیالات

علامہ ابن قیم نے اپنی کتاب "الطرق الحکمیہ" میں ابن عقیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:۔

سیاست کی تعریف یہ ہے کہ یہ وہ فعل ہے کہ جس کے ذریعہ عوام
اصلاح سے اقرب ہو جائیں اور فتنہ و فساد سے دور ہو جائیں، اگرچہ
اس فعل سے متعلق واضح حکم نہ قرآن شریف میں ہو نہ حدیث میں۔ اگر کوئی
شخص یہ کہے کہ سیاست وہی ہے جس کی شرع نے وضاحت کر دی
ہے تو یہ بات بالکل غلط ہے۔ خود صحابۂ کرام نے اس کی تغلیط کی ہے
سچ پوچھو تو اجتہاد رائے کا سلسلہ عہد خلفاء راشدین سے چلا آ رہا ہے
حضرت علی نے جو زنادقہ کو جلایا۔ حضرت عثمان نے جو قرآن کے
غیر معمول بہ مصاحف کو نذر آتش کیا۔ حضرت عمر نے جو نصر بن حجاج
کو جلا وطن کیا، یہ سب اگر اجتہاد رائے نہیں تھا تو کیا تھا؟ (ان افعال
میں سے کس کی مثال یا ہدایت کتاب و سنت میں کہیں مل سکتی ہے)
اسی زیر بحث کتاب "الطرق الحکمیہ" میں ابن قیم نے مزید کہا ہے۔
یہ وہ مرحلہ ہے جہاں اقدام میں لغزش ہو سکتی ہے اور مفہوم

صحیح طور پر نہ سمجھنے سے گمراہی بھی ہو سکتی ہے یہ بڑا نازک مرحلہ ہے

ایک جماعت نے تفریط سے کام لیا اور حدود سے تجاوز کر گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے حقوق پامال ہو گئے اور اہل فجور کو فتنہ و فساد پھیلانے کا موقعہ مل گیا، اس جماعت نے اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا کہ شریعت مصالح امت کا ساتھ نہیں دیتی اور اصلاح احوال کے لئے اس کے علاوہ کسی دوسرے موثر کی بھی ضرورت ہے، اس جماعت نے وہ دروازہ بند کر دیا جو معرفت حق اور تنفیذ حدود کا صحیح ترین راستہ تھا اور اس حقیقت کو جاننے کے باوجود بند کر دیا، کہ سچائی کا راستہ یہیں سے جاتا ہے انہوں نے حق کو یہ سمجھ کر چھوڑ دیا کہ وہ قواعد شرعیہ کے خلاف ہے، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، یہ ہرگز اس کے منافی نہیں ہے جو رسول اللہ لے کر آئے تھے، اور اگر منافی معلوم ہوتا ہے تو یہ ان کے فہم کا قصور ہے یہ غلط راستہ انہوں نے اس لئے اختیار کیا کہ شریعت کی معرفت اور واقعہ کی معرفت میں ان سے چوک ہوئی، پھر یہ ہوا کہ اوضاع سیاست کے لئے انہوں نے شر طویل اور فساد عریض کھڑا کر دیا، معاملہ اور بگڑ گیا، استدراک اور مشکل ہو گیا، حقائق شرع کا فہم اور دشوار ہو گیا اس بھنور سے لوگوں کا نکلنا اور ان مہالک سے بچ جانا اور مستبعد ہو گیا۔

ایک دوسری جماعت تھی جس نے افراط سے کام لیا، اس نے اس جماعت کا مقابلہ کیا، اور حکم خدا اور رسول کے منافی رنگ میں رنگ گئی۔

خدائے بزرگ و برتر نے واضح کر دیا ہے کہ اپنی شرع میں اس نے جن طرق کو اختیار فرمایا ہے ان کا مقصود اس کے بندوں کے درمیان اقامت عدل و قسط ہے۔ یہی اصول دین ہے لہٰذا سیاست عادلہ کے متعلق ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ شرع نے جو کچھ نافذ اور عائد کیا ہے وہ اس کی مخالف ہے، بلکہ سیاست عادلہ تو سراسر اس کے موافق اور مطابق ہے بلکہ (نگاہ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا) یہ اس کے اجزا میں سے ایک اہم جزو ہے۔

(۲)

تدریجی ارتقاء

عربوں کے نظامِ حکمرانی پر ایک نظر

گزشتہ اوراق میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام اپنے اندر ایک خاص قسم کی لچک رکھتا ہے۔ اس کے ضابطہ حیات میں نرمی اور لینت ہے، سختی اور درشتی نہیں اس کا قانون اندھا نہیں ہے۔ وہ مصالح عامہ کی رعائت کرتا ہے، ضروریات انسانی کو ملحوظ رکھتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ وقت اور زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ انسان کے بدلتے ہوئے ضروریات کو محسوس کرتا اور ان کے مطابق منصوبۂ عمل بنانے کی گنجائش رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں اسلام کا بول بالا رہا، کبھی بھی اسلام کا نظام انسانیت کے راستہ میں سنگِ گراں بن کر حائل نہیں ہوا، بلکہ اس نے دشواریاں دور کیں، مشکلیں ختم کیں، آسانیاں پیدا کیں، اور سہولتیں فراہم کیں۔

ذیل میں عربوں کے نظام حکمرانی کے تدریجی ارتقاء کا ایک سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام سے پہلے ان میں جو قبائلی نظام تھا، وہ کس نوعیت کا تھا۔ پھر اسلام کے نمودار ہونے کے بعد انہوں نے کیا صورت اختیار کی؟ پھر عہدِ خلافت راشدہ میں، اس میں کیا کیا تغیرات ہوئے اور جب خلافت راشدہ کے بعد اموںیوں اور عباسیوں اور فاطمیوں کا دور آیا —— جو درحقیقت ملوکیت کا دور تھا —— تب اس میں دائرۂ مذہب شمارہ کر کس کس قسم کی تبدیلیاں اور جدتیں عمل میں آئیں۔؟

عربوں کا نظام سیاست اسلام سے پہلے

تبیلہ کا اطلاق افراد انسانی کے اس مجموعہ پر ہوتا تھا۔ جو ایک خاص خطہ میں سکونت پذیر ہو، اور وہ ایک ایسا نظام حکومت رکھتا ہو، جس کے سرے پر شیخ القبیلہ ہو، افراد قبیلہ کی باہمی شیرازہ بندی، نسب اور اتحاد خون کے رابطہ سے ہوتی تھی، اور تمام افراد قبیلہ کے مفاد عامہ کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ آجکل حکومت کی جتنی شکلیں پائی جاتی ہیں، اس طرز کی عربوں میں کوئی حکومت موجود نہ تھی، نہ کوئی محکمہ عدلیہ تھا، جہاں وہ اپنے جھگڑے قضیئے چکانے جاتے ہوں، نہ پولیس تھی، جو امن و نظام قائم رکھتی ہو، اور نہ خارجی خطرات کے دفعیہ کے لئے کوئی فوجی نظام تھا، ان پر کوئی ٹیکس بھی عائد نہیں کیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ کسی ایسی حکومت کا وجود نہ تھا، جس کے ہاتھ میں قوت تنفیذیہ کی باگ ڈور ہو جو مجرم کے دست تعدّی پر ضرب لگاتی اور اس کے جرم کے مطابق اس کے لئے سزا تجویز کرتی ہو۔ مظلوم اپنا انتقام خود لیتا تھا اور قبیلہ اس کی پشت پناہی کرتا تھا۔ لیکن مجرم اگر اپنے جرم کا کفارہ مالی امداد کی صورت میں ادا کر دیتا تو اس صورت میں مظلوم کے لئے ثأر (انتقام) کا حق باقی نہ رہ جاتا۔ مجرم اگر مظلوم کا رشتہ دار ہوتا تو مظلوم تنہا اپنا ثأر لیتا، اس میں قبیلہ اس کی مدد کو نہ آتا، لڑائی کے وقت عربوں کے آزاد نفوس ایک امیر کے ماتحت جنگ کرتے لیکن امن کی حالت میں خاندان ہی ایک ایسی چیز تھا جو منظم کیفیت کا حامل ہوتا تھا۔

قبیلہ کی حکومت جمہوری تھی۔ قبیلہ کا شیخ کنبوں کے سرداروں کو جمع کرتا تھا۔ جن سے مجلس شیخ القبیلہ کی قسم کی ایک چیز تشکیل پاتی تھی۔ اس میں مشاورت ہوتی، اعلان جنگ اور انعقاد صلح سے متعلق امور طے پاتے۔ یا خاص ان مسائل پر گفتگو

ہوتی جن کا تعلق قبیلہ کے نظام سے ہوتا، قبیلہ کے سامنے کوئی مرتب قانون نہیں ہوتا تھا جس کے ضابطے کے مطابق اس کا عمل درآمد ہو، بلکہ اس کی حکومت کی بنیاد موروثی روایات پر مبنی تھی، مثلاً عمداً قاتل کا قتل جو مر جائے اس کی جائداد کی تقسیم وغیرہ۔ الغرض عربوں میں عرف ہی قانون کا قائم مقام تھا، یہیں سے قبیلہ مملکت جدیدہ سے الگ ہو جاتا ہے، جس کا سارا دار و مدار احکام ہیں قانون پر ہوتا ہے۔

عہدِ رسالت مآبؐ

دین اسلام کا سب سے نمایاں کارنامہ یہ تھا کہ قبائل و مراتب میں اختلاف کے باوجود اس نے مسلمانوں میں باہمی اخوت پیدا کر دی، اور قومی وحدت کو مٹا کر دینی وحدت قائم کی، آقا اور غلام کا فرق جاتا رہا، سب کو مساوی درجہ ملا۔ اور وہ ایک ہو کر بنیان مرصوص بن گئے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تقویت و سہارا ہوتا ہے، مسلمانوں پر اپنے اس احسان کا ذکر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے:۔

وان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ ھو الذی ایدک بنصرہ وبالمؤمنین والف بین قلوبہم لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبہم ولکن اللہ الف بینہم انہ عزیز حکیم

عربوں کے اندر وحدت کلمہ پیدا کرنے میں آنحضرتؐ کی مدد و اعانت اس جمہوریت نے کی جسے اسلام لے کر آیا تھا اور جس کے سامنے وہ تمام جنبی فرقہ بندیاں ختم ہو گئیں جنہوں نے عربوں کی شیرازہ بندی کو ایک زمانۂ دراز سے پارہ پارہ کر رکھا تھا۔ اس جمہوریت کی کس قدر واضح تعلیم کلام پاک کی اس آیت میں موجود ہے:۔

یاایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثی وجعلنٰکم
شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ
اتقاکم

اسلام کی انہیں تعلیمات کی بنا پر حکومت و رعیت کے درمیان پھر خود قبائل کے درمیان تعلقات کی حد بندی کا واحد مرجع بجائے جنس کے اب دین بن گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت محض دینی حکومت نہ تھی، آپ فوجوں کی قیادت کرتے، مقدمات کے فیصلے کرتے اور زکواۃ وغیرہ کے مال وصول فرماتے تھے، اس طرح آپ کو دونوں قسم کی طاقتیں دینی وسیاسی ساتھ ہی ساتھ حاصل تھیں، لیکن یہ سیاسی اقتدار محض ثانوی درجہ رکھتا تھا، آپ کا مقصد اولین جس کے لئے آپ مبعوث ہوئے تھے، دعوت اسلام کا نشر و اشاعت تھا۔ اسی لئے کبار مہاجرین والضار مثلاً ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ سے غیر دینی مسائل میں تو آپ مشورہ لیا کرتے تھے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "لوگو" مجھے مشورہ دیا کرو، لیکن جہاں تک دینی مسائل کا تعلق ہے، آپ ہمیشہ ان میں اپنی انفرادی رائے سے کام لیتے رہے آنحضرتؐ نے جن لوگوں سے مشورہ لیا۔ ان میں حمزہ، جعفر، ابوبکر، عمر، علی، ابن مسعود، عمار، حذیفہ، ابوذر، مقداد اور بلال کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ لوگ نقباء کہلاتے تھے، اس لئے کہ یہ اپنی قوم کے اسلام کے بارے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کفیل تھے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نظام اداری کا بیج اپنی زندگی ہی میں ڈال دیا تھا چنانچہ جو قبائل حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے۔ آپ ان کے پاس کسی کو کلام پاک کی تعلیم دینے کے لئے بھیج دیتے۔

جب آپ مدینہ ہجرت فرما گئے، تو آپ نے وہاں دولت اسلامیہ کا نظام قائم کیا، قبائل اور شہروں میں آپ عمال بطور اپنے نائب کے بھیجتے۔ حجاز اور یمن کے ہر بڑے شہر میں اور اسی طرح ہر بڑے قبیلہ میں آپ کی جانب سے ایک عامل مقرر تھا، ان عمال کا فرض منصبی نمازمیں امامت کرنا اور صدقات کو جمع کرنا تھا۔ عہد نبوی میں خراج نہیں لیا جا سکتا تھا۔ یہ فرائض خالص مذہبی تھے۔ اسی لئے ان عمال کو کوئی سیاسی صفت حاصل نہ تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ کے لئے جاتے تو نماز میں لوگوں کی امامت کے لئے اپنے کسی صحابہ کو مدینہ میں اپنا نائب بنا جاتے، اسی طرح کبھی آپ اپنا نائب کسی قائد کو نامزد کر دیتے۔ جو کسی سریہ کی قیادت کرتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ان عمال کا انتخاب ان لوگوں میں سے کرتے جو نیکی، تقویٰ، حلم اور تفقہ فی الدین میں مشہور ہوتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب بن اسید کے لئے جنہیں آپ نے مکہ کا والی بنایا تھا ایک درہم یومیہ مقرر کیا تھا، یہ پہلی تنخواہ تھی جو کسی عامل کو دی گئی۔ مدینہ کیاد صحابہ مال غنیمت وغیرہ سے صرف اپنا حصہ رسدی پاتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کو اور کچھ نہیں ملتا تھا۔

خلفائے راشدین کا عہد گرامی

حکومت اسلامیہ کا اداری نظام مجموعی طور پر وہی رہا جو ایرانیوں اور رومیوں کے دور حکومت میں قائم تھا، عربوں نے دیکھا کہ یہ قومیں جن کے کھنڈرات پر انہوں نے اپنے تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی ہے، حضارت، مدنیت اور سیاسی نظم وغیرہ کے اعتبار سے مستحکم بنیادوں کی ایک شاندار تاریخ کی مالک ہیں، پھر مفتوحہ ممالک کے نظام اداری کو انہوں نے ایک مستقل و راسخ قسم کا نظام پایا، اس لئے ان کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اس نظام کو قبول کر لیں، یا حسب سابق

اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیں اور وقتاً فوقتاً ایسی ترمیمات اور ایسے تغیرات اس میں کرتے رہیں جو ان کے دینی عقائد اور مسلمانوں کی ماتحت قوموں کے مصالح کے لحاظ سے ضروری ہوں، صدر اسلام اور عہد بنی امیہ میں نظام اداری ایک بسیط اور ابتدائی (نامکمل یا Rudimentary) نظام تھا۔ مختلف ادارات میں تقسیم اعمال اور ہر ادارہ کے ساتھ چند مقررہ اعمال کو مختص کر دینے کا نظام جیسا کہ مسلمانوں نے اختیار کیا تھا۔ ان دونوں زمانوں میں رائج نہ تھا۔

جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمال کو ان کے عہدوں پر رہنے دیا۔ مالیات کی ذمہ داری حضرت ابوعبیدہ نے لے لی، اور حضرت عمر نے کہا کہ قضاء کے فرائض میں انجام دوں گا، حضرت عمر حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبدالرحمان بن عوف، حضرت معاذ بن جبل، حضرت اُبی بن کعب اور حضرت زیدؓ بن ثابت جیسے اصحاب فکر و تدبر سے حضرت ابوبکرؓ مشورے لیا کرتے تھے، اور ولاۃ خود ہی قضاۃ کا انتخاب کرتے اور ان کو منصب قضا پر مامور کرتے تھے۔

عرب کی تقسیم صوبوں میں

حضرت ابوبکر کے عہد میں ملک عرب کو متعدد صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ وہ صوبے حسب ذیل تھے، مکہ، مدینہ، طائف، صنعا، حضرموت، خولان، زبید، رمع، جند، نجران، جرش اور بحرین۔

حضرت عمر بن الخطاب کی خلافت میں جب دولت عربیہ کا رقبہ وسیع ہو گیا تو آپ نے حکومت اور مالیات کی نگرانی میں سہولت کے خیال سے دولت کو چند بڑے بڑے اداری حلقوں میں تقسیم کر دیا، وہ یہ تھے، ولائت اہواز و بحرین ولائت سجستان، مکران و کرمان، ولائت طبرستان، ولائت خراسان اور

بلادِ فارس، آپ نے تین صوبوں کو ولایات میں منقسم کر دیا تھا، بلادِ عراق کے دو حصے کر دیئے، ایک حصہ کا دارالحکومت کوفہ تھا، اور دوسرے حصہ کا بصرہ، بلادِ شام کے بھی دو حصے تھے، ایک حصہ کا صدر مقام حمص تھا، اور دوسرے کا دمشق، فلسطین ایک معمولی صوبہ تھا۔ افریقہ کے بھی تین ٹکڑے کر دیئے تھے ۱؎۔

۱؎ (۱) مصر علیا (۲) مصر سفلی (۳) مصر غربی اور صحرائے لیبیا۔

اس طرح حضرت عمرؓ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے دولت اسلامیہ کے نظام اداری کی بنیا درکھی، اور اس کے انتظام و انصرام کی تنظیم کی۔ ان کا سیاسی مقصد بلادِ عرب کو ایک رشتہ میں مضبوط باندھنا اور ان کو ایک دوسرے میں اس طرح ضم کر دینا تھا کہ وہ ایک ہی اُمتِ عربیہ بن جائیں، ان کی سیاست کا دوسرا رخ یہ تھا کہ مفتوحہ ممالک کے باشندگان سے ان کا اختلاط اس حد تک نہ بڑھنے پائے کہ ان کی قومیت تباہ و برباد ہو کر رہ جائے۔ سیّد امیر علی تحریر فرماتے ہیں: حضرت عمرؓ کی زندگی نے اور کچھ وفا کی ہوتی تو اللہ نے جو بے لوچ اور خم نہ کھانے والی سرشت، اور غیر معمولی شخصیت کی قوت انہیں عطا کی تھی اس کی بنا پر وہ وحدتِ عربیہ کے شیرازہ کو مضبوط بنا دیتے اور ان خانہ جنگیوں میں ایک وسیع خلیج بن کر حائل ہو جاتے جنہوں نے اسلام کی عمارت کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔

حضرت عمرؓ نے صوبوں کے عمّال یا ولاۃ مقرر کئے۔ یہ اپنی قوت و طاقت خلیفہ سے حاصل کرتے تھے جس کے ذات میں تنفیذی قضائی و تشریعی قوتیں مرکوز ہوتی تھیں۔

اقلیم کے امراء "عمال" کے نام سے موسوم ہوتے تھے، لفظ عامل کا مفہوم یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ عہدہ دار مطلق العنان نہیں ہوتا، لہٰذا کو "والی" کا لفظ

استعمال ہونے لگا۔ یہ لفظ نفوذ و اقتدار کا مفہوم ذہن میں پیدا کرتا ہے چنانچہ ہمیں
معلوم ہے کہ عبدالملک بن مروان اور اس کے بعد اس کے بیٹے یزید کے والی
عراق حجاج بن یوسف کو کس قدر نفوذ و اقتدار حاصل تھا۔ حجاج پر لفظ "امیر
کا بھی اطلاق ہوتا تھا۔ القاب کا یہ تغیر اس مستبدانہ قوت کو واضح کرتا ہے
جس کے ولاۃ مالک تھے جس طرح آجکل ضلع کا حاکم کلکٹر کہلاتا ہے اسی طرح
بنی امیہ میں لفظ "عامل" کا اطلاق ضلع کے افسر پر ہونے لگا۔

عاملوں کی شخصیت اور اُن کے فرائض

ہر اقلیم میں ایک عامل یا والی یا
امیر ہوتا تھا، جو نماز کی امامت
فصل خصومات، جنگ میں فوجوں کی قیادت، جمع مال اور دیگر مہمات دولت
کے فرائض انجام دیتا تھا۔ عامل خراج سب سے زیادہ اہم عامل ہوتا تھا، والی
کے پہلو بہ پہلو اپنا فریضہ ادا کرتا تھا، ایک حکومت کے شعبہ نظم و نسق کا ذمہ دار
تھا، دوسرا محکمہ مالیات کا مستقل حاکم تھا۔ مزید برآں اس کی حیثیت بمنزلہ والی
کے افعال کے نگران کے بھی ہوتی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان دونوں میں قوت
و اقتدار کے لئے نزاع و رسہ کشی رہا کرتی تھی۔ اسی سے یہ واضح ہو جاتا ہے
کہ ولاۃ اور عمال خراج کی مدتِ ملازمت کے اختصار کا سبب کیا تھا۔ عا
خراج کا تقرر براہِ راست خلیفہ کی جانب سے ہوتا تھا۔ لیکن اقتدار کامل امیر
ہی کو حاصل ہوتا تھا۔

حضرت عمر بن الخطاب اپنے ولاۃ کا انتخاب عرب آبادی سے کرتے
اسی سیاست کی پیروی ان کے بعد کے خلفائے راشدین نے بھی کی۔ حضرت
عمرؓ جب عمال مقرر کرتے تو ان کے ساتھ ان کی مشایعت میں نکلتے اور فرما
جاتے: میں نے تم کو امت کے تن بدن پر عامل نہیں مقرر کیا ہے، میں نے تم کو

پر عامل اس لیے مقرر کیا ہے کہ تم ان میں نماز کو قائم کرو، ان میں حق کے ساتھ فیصلہ کرو، ان میں عدل کے ساتھ حصّہ بخرا لگاؤ، عربوں کو دُرّے نہ لگاؤ، کہ ذلیل ہوں ان کو (فوجی خدمات کے سلسلہ میں) زیادہ دن تک نہ روکو کہ فتنہ میں پڑجائیں، ان سے غفلت نہ برتو کہ اپنے حقوق سے محروم رہیں، قرآن تجوید کے ساتھ پڑھا کرو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روائتیں کم کیا کرو میں تمہاری ذمہ داریوں میں شریک ہوں، حضرت عمر اپنے عمال سے انتقام لینے میں کوئی رو رعایت نہ کرتے، جب آپ کی خدمت میں کسی عامل کی شکائت کی جاتی تو عامل اور مظلوم، دونوں کو اپنے سامنے طلب کرتے اگر عامل کے خلاف صحیح شکائت ثابت ہوتی، تو آپ اس کی قرار واقعی گرفت فرماتے، جب آپ امرائے جیوش کو مہم پر روانہ فرماتے، تو انہیں خوف خدا اور ظلم و عدوان سے اجتناب کی نصیحت فرماتے، انہیں تاکید فرماتے کہ جنگ میں بزدلی نہ دکھائیں، قدرت کے وقت مثلہ سے پرہیز کریں، غلبہ کے وقت حد اعتدال سے آگے نہ نکلیں، بوڑھوں عورتوں اور بچوں کو تہ تیغ نہ کریں جس وقت گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہو اس وقت بھی ان کے قتل کے لئے ہاتھ نہ اٹھائیں۔

مجلس شیوخ کا حصہ مہمات دولت میں

جب عثمان بن عفان خلیفہ ہوئے تو انہوں نے حضرت عمر کی سیاست کی تقلید کی اور امرائے فوج کے پاس جو پہلی تحریر بھیجی وہ یہ تھی، حضرت عمرؓ نے جو ضوابط و فرائض تمہارے لئے مقرر کئے تھے، وہ ہم سے پوشیدہ نہیں بلکہ وہ سب ہماری جماعت کے سامنے طے پائے تھے۔ تمہارے کسی فرد کی جانب سے ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی اطلاع میرے کانوں تک نہ آنے پائے ورنہ تم اپنے عہدوں سے ہٹا دیئے جاؤ گے۔ اور تمہاری جگہ دوسرے لوگ مقرر کر دیئے

جائیں گے لیکن حضرت عثمانؓ کے دور کے نصف اخیر میں کہن سالی کی وجہ سے ان کے ارادہ میں ضعف پیدا ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ جات میں مسلمانوں میں بغاوت کی تحریک پیدا ہوئی، اطاعت و فرمانبرداری کی دھجیاں اڑا دی گئیں اور فتنہ و فساد کا وہ شعلہ اٹھا جس نے شہید کر کے دم لیا۔ ان کے بعد حضرت علی بن ابی طالب خلیفہ ہوئے۔ اور خلیفہ ہوتے ہی حضرت عثمان کے عمال کو فوراً معزول کر دیا۔

خلفائے راشدین مہمات دولت کے انتظام و انصرام میں مجلس شیوخ سے مدد لیا کرتے تھے۔ یہ مجلس کبار صحابہ، اعیان مدینہ اور رؤسائے قبائل پر مشتمل ہوتی تھی، اس کا اجلاس مسجد نبوی میں ہوتا تھا، خلیفہ اعضائے مجلس کے مشورہ کے بغیر کسی امر کا فیصلہ نہیں کرتا تھا۔

مذکورہ بالا تصریح کے ساتھ یہ مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ ابتدائے اسلام ہی سے مسجد میں علماء کے اصلاح کے کام میں لائی جاتی تھیں۔ علمائے تفسیر و حدیث نے مساجد ہی کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ اس کے بعد ان مساجد سے تعلیمی اداروں کا کام بھی لیا جانے لگا۔ بچے یہاں عربی زبان اور اصولِ دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے قاضی بھی انہیں مساجد میں اپنا اجلاس کرتے مختصر یہ ہے کہ مذہب و سیاست میں تفریق نہ ہونے کی وجہ سے مسجد ہی وہ جگہ تھی جہاں ان اہم امور کا چرچا رہتا۔ جو مفادِ عامہ سے متعلق ہوتے۔

سرطامس آرنلڈ مساجد سے متعلق اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں، یہ کیفیت زیادہ دنوں تک باقی نہ رہی۔ ان کی سیاسی و اجتماعی اہمیت ختم ہو گئی، یہ عرش خلیفہ کرسی والی اور منصۂ قاضی کی مثیل نہ رہیں، اب مسجد کا مصرف مذہبی خطبہ کے پڑھے جانے تک محدود تھا جس میں اللہ کی بزرگی کا بیان ہوتا

پر درود بھیجا جاتا۔ صحابہ کے لئے دعاخیر کی جاتی۔ اور محافظت دین میں رسول اللہ کے نائب کی حیثیت سے خلیفہ کا نام لیا جاتا۔ خطبہ میں خلیفہ کے نام کے ذکر کے علاوہ اور کسی قسم کے سیاسی مظہر کا وجود ان مساجد میں باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ صورتِ حال اس لئے پیدا کر دی گئی تھی تاکہ اس میں اور اسلامی صوبہ جات کی محض نام کے خلفاء کی ماتحتی میں پوری مشابہت قائم رہے۔ ان سالوں میں نظامِ حکومت ، نظام جمہوری سے بہت زیادہ قریب رہا۔

ایوانِ حکومت اور قومی پارلیمنٹ کی حیثیت سے

سرٹامس آرنلڈ نے اس امر سے بحث کی ہے کہ مسجد کا تعلق اس حیثیت سے کہ وہ عبادت کی جگہ ہے (یعنی وہ مقام جہاں خلیفہ یا والی نماز میں لوگوں کی امامت کرتا ہے) دولت کے سیاسی و اجتماعی مسائل کے نظم و ضبط سے کیا جارہا ہے، اور کس طرح خلیفہ یا والی کی ذات میں ایک طرف نماز میں مسلمانوں کی امامت اور دوسری طرف دولت یا ولائت (صوبہ) کا انتظام و انصرام، دونوں حیثیتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں: "مسجد محض عبادت کی جگہ ہی نہ تھی، بلکہ وہ سیاسی اور اجتماعی زندگی کا مرکز بھی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں سفراء کا استقبال کرتے اور وہیں بیٹھ کر مہماتِ دولت کا انتظام و انصرام فرماتے، اور منبر پر سیاسی و دینی مسائل کے متعلق مسلمانوں کو خطاب کرتے حضرت عمرؓ نے مدینہ کے منبر پر کھڑے ہو کر عراق میں مسلمان فوجیوں کی پسپائی کا اعلان کیا، اور اپنی قوم کو اس ملک کی طرف چل پڑنے کی ترغیب دی۔ حضرت عثمان نے بھی اسی منبر پر کھڑے ہو کر اپنی مدافعت کی۔ اسی طرح خلیفہ اپنی تخت نشینی کے وقت اسی منبر پر ہی جمہور کے سامنے اپنا وہ پہلا خطبہ دیتا جو بمنزلہ اس کی حکومت کی پالیسی کے اعلان کے ہوتا۔"

The calipabi. P.P. 3638

جائیں گے، لیکن حضرت عثمان رضؓ کے دَور کے نصف اخیر میں کہن سالی کی وجہ سے ان کے ارادہ میں ضعف پیدا ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہُوا کہ صوبہ جات میں مسلمانوں میں بغاوت کی تحریک پیدا ہوئی، اطاعت و فرمانبرداری کی دھجیاں اڑا دی گئیں اور فتنہ و فساد کا وہ شعلہ اٹھا جس نے شہید کر کے دم لیا۔ ان کے بعد حضرت علی بن ابی طالب خلیفہ ہوئے۔ اور خلیفہ ہوتے ہی حضرت عثمان کے عمال کو فوراً معزول کر دیا۔

خلفائے راشدین مہمات و دولت کے انتظام و انصرام میں "مجلس شیوریٰ" سے مدد لیا کرتے تھے۔ یہ مجلس کبار صحابہ، اعیان مدینہ اور رؤسائے قبائل پر مشتمل ہوتی تھی، اس کا اجلاس مسجد نبوی میں ہوتا تھا، خلیفہ اعضائے مجلس کے مشورہ کے بغیر کسی امر کا فیصلہ نہیں کرتا تھا۔

مذکورہ بالا تصریح کے ساتھ یہ مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ ابتدائے اسلام ہی سے مسجد میں علماء کے اصلاح کے کام میں لائی جاتی تھیں۔ علمائے تفسیر و حدیث نے مساجد ہی کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ اس کے بعد ان مساجد سے تعلیمی اداروں کا کام بھی لیا جانے لگا۔ بچے یہاں عربی زبان اور اصولِ دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے، فقہا بھی انہیں مساجد میں اپنا اجلاس کرتے، مختصر یہ ہے کہ مذہب و سیاست میں تفریق نہ ہونے کی وجہ سے مسجد ہی وہ جگہ تھی جہاں ان اہم امور کا چرچا رہتا۔ جو مفادِ عامہ سے متعلق ہوتے۔

سر ٹامس آرنلڈ مساجد سے متعلق اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں، یہ کیفیت زیادہ دنوں تک باقی نہ رہی۔ ان کی سیاسی و اجتماعی اہمیت ختم ہو گئی، یہ عرشِ خلیفہ کرسیٔ والی اور منصۂ قاضی کی مثیل نہ رہیں، اب مسجد کا مصرف مذہبی خطبہ کے پڑھے جانے تک محدود تھا جس میں اللہ کی بزرگی کا بیان ہوتا،

پر درود بھیجا جاتا۔ صحابہ کے لئے دعا خیر کی جاتی۔ اور محافظت دین میں رسول اللہ کے نائب کی حیثیت سے خلیفہ کا نام لیا جاتا۔ خطبہ میں خلیفہ کے نام کے ذکر کے علاوہ اور کسی قسم کے سیاسی مظہر کا وجود ان مساجد میں باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ صورتِ حال اس لئے پیدا کر دی گئی تھی تاکہ اس میں اور اسلامی صوبہ جات کی محض نام کے خلفاء کی ماتحتی میں پوری مشابہت قائم رہے۔ ان سالوں میں نظامِ حکومت، نظام جمہوری سے بہت زیادہ قریب رہا۔

ایوانِ حکومت اور قومی پارلیمنٹ کی حیثیت سے

سر ٹامس آرنلڈ نے اس امر سے بحث کی ہے کہ مسجد کا تعلق اس حیثیت سے کہ وہ عبادت کی جگہ ہے (یعنی وہ مقام جہاں خلیفہ یا والی نماز میں لوگوں کی امامت کرتا ہے) دولت کے سیاسی و اجتماعی مسائل کے نظم و ضبط سے کیا جا رہا ہے، اور کس طرح خلیفہ یا والی کی ذات میں ایک طرف نماز میں مسلمانوں کی امامت اور دوسری طرف دولت یا ولائت (صوبہ) کا انتظام و انصرام، دونوں حیثیتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں۔ مسجد محض عبادت کی جگہ ہی نہ تھی، بلکہ وہ سیاسی اور اجتماعی زندگی کا مرکز بھی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں سفراء کا استقبال کرتے اور وہیں بیٹھ کر مہماتِ دولت کا انتظام و انصرام فرماتے، اور منبر پر سیاسی و دینی مسائل کے متعلق مسلمانوں کو خطاب کرتے حضرت عمرؓ نے مدینہ کے منبر پر کھڑے ہو کر عراق میں مسلمان فوجیوں کی پسپائی کا اعلان کیا، اور اپنی قوم کو اس ملک کی طرف چل پڑنے کی ترغیب دی۔ حضرت عثمان نے بھی اسی منبر پر کھڑے ہو کر اپنی مدافعت کی۔ اسی طرح خلیفہ اپنی تخت نشینی کے وقت اسی منبر پر ہی جمہور کے سامنے اپنا وہ پہلا خطبہ دیتا جو بمنزلہ اس کی حکومت کی پالیسی کے اعلان کے ہوتا۔

The calipahi. P.P. 36 38

ریاست کی متعدد قسمیں فقہاء نے صوبائی نظریۂ امارت کو حسب ذیل شکل میں ڈھالا ہے۔ اولاً اس کی دو صورتیں امارتِ عامہ اور امارتِ خاصہ قرار دی ہیں، پھر امارت عامہ کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔
(۱) امارتِ استکفاء، یہ خلیفہ کے اختیار کے ماتحت منعقد ہوتی ہے، اور (۲) امارتِ استیلاء، ہے، یہ اضطرار اور خلیفہ کی مجبوری کے وقت وجود میں آتی ہے۔
جو امارت خلیفہ کے اختیار سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ سات امور پر مشتمل ہوتی ہے۔ ماوردی نے ان کی تفصیل یہ بیان کی ہے[1]
(۱) فوجوں کا انتظام، ملک کے مختلف حصوں میں ان کی تقسیم اور ان کی تنخواہوں کا تقرر۔
(۲) احکام کی نگہداشت، اور حکام قضاۃ کا تقرر۔
(۳) خراج و صدقات وصول کرنا، ان کاموں کے لئے عمال مقرر کرنا اور صحیح مصرف میں انہیں خرچ کرنا۔
(۴) دین کی حمایت، حرم کی حفاظت اور تغیر و تبدل سے مذہب کو بچانا۔
(۵) حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بارے میں شرعی ورود قائم کرنا۔
(۶) جمعہ اور نماز پنجگانہ میں امامت، خواہ وہ خود امامت کرے۔ خواہ کسی کو امامت کے لئے اپنا نائب بنا دے۔
(۷) حاجیوں کی روانگی کا انتظام کرنا، جو لوگ حج کی اہلیت نہ رکھنے کے باوجود اس کا ارادہ کر بیٹھیں۔ اور اس مقصد کے لئے گھر سے نکل پڑیں، ان کی اعانت کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا۔
جس ملک کا یہ امیر مقرر ہوا ہے اگر وہ دشمن کی سرزمین سے قریب سرحد پر

---
[1] ص ۲۸ - ۲۹ اور اس کے بعد

واقع ہے۔ تو اس کے ذمہ ایک آٹھواں فریضہ بھی عائد ہوتا ہے یعنی اعداء سے جہاد کرنا، مجاہدین میں مالِ غنیمت تقسیم کرنا اور خمس مال غنیمت کو اہلِ خمس کیلئے علیحدہ کر لینا۔

وہ امارت جو اضطراراً منعقد ہو — اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ والی اسے خود اختیار کر لیتا ہے اور خلیفہ اسے منظور کر لیتا ہے۔ اُس صورت میں والی کو سیاست و تدبیر کے مطلق العنان اختیارات حاصل ہوتے ہیں لیکن مسائل متعلقہ دین خلیفہ کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں، وہ بدعت یا دین کے بارے میں غفلت یا چشم پوشی نہیں کرتا۔ ماوردی نے ان الفاظ میں اس پر اظہار خیال کیا ہے کہ وہ امارت استیلاء جو اضطراراً منعقد ہوتی ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ امیر اپنی قوت و طاقت کے بل پر کسی ملک پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ جس کی امارت کی سند خود خلیفہ عطا کرتا ہے اور تدبیر و سیاست کے تمام اختیارات اسے تفویض کر دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں امیر اپنے استیلاء و غلبہ کی بناء پر سیاست و تدبیر کا خود سر مالک ہوتا ہے اور خلیفہ اپنے عزم کی وجہ سے احکام دین کا تعمیل کنندہ قرار پاتا ہے۔

یہ پہلو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ خلیفہ کی پوزیشن میں بجائے فساد کے صحت اور بجائے عدم جواز کے جواز کی صورت پیدا ہو، اس میں شک نہیں کہ یہ اس متعارف و مروج پروانۂ تقرری کے خلاف ہے جو اپنے شروط و احکام میں ہر قسم کی قید و بند سے آزاد ہوتا ہے، جسے مختل و خستہ اور فاسد و خراب حالت میں چھوڑ دینا قطعاً جائز نہیں ہو سکتا! اسی لئے استیلاء و اضطرار کے موقع پر اس فرمانِ تقرری میں وہ چیزیں مباح سمجھی جاتی ہیں، جو استکفاء و اختیار کے پروانۂ تقرری میں ممنوع ہیں؛ اس قدرت و عجز کے شرائط کے درمیان فرق کا لحاظ ضروری ہے۔

امارت خاصہ کے متعلق ماوردی رقمطراز ہے "امیر کی امارت" انتظام، فوج

سیاست، رعیت، حمایت، دارالخلافت اور حفاظتِ حرم تک محدود ہوتی ہے
اسے قضا، احکام اور وصول خراج و صدقات کے اختیارات حاصل نہیں ہوتے

امارت عامّہ اور امارت خاصّہ عہد اول میں عمال کی امارت، امارت عامّہ ہؤا کرتی تھی، لیکن بعد کو یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس کی تخصیص پیدا کر دی جائے، مصر پر عمرو بن العاص کی امارت، امارت عامہ تھی لیکن کچھ مدّت کے بعد جب حضرت عمر کو ان کا وصول کردہ خراج کم ہؤا تو انہوں نے خراج کی وصولی کے لئے ایک دوسرے شخص عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مقرر کر دیا۔ اس طرح عمرو بن العاص کی امارت عام ہونے کے بعد خاص ہوگئی، پھر کچھ دنوں کے بعد فصل خصومات کے لئے حضرت عمرؓ نے مصر کا ایک الگ قاضی بھی مقرر کر دیا، اب والی کے اختیارات قیادت جیش اور امامت صلاۃ تک محدود ہوگئے۔

عہدِ بنو اُمیّہ کا نظم مملکت عہد اموی میں دولتِ اسلامیہ کی وسعت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی، انتظامی نقطۂ نظر سے ملک پانچ بڑے بڑے صوبوں میں منقسم تھا۔

(۱) حجاز، یمن، عرب وسطیٰ،

(۲) مصر اس کے دو حصے تھے۔ سفلی و علیا۔

(۳) عراقین (عراق عرب — اس سے مراد بلاد بابل، اور آشور قدیم تھے۔
عراق عجم! — یہ بلاد فارس سے عبارت تھا۔

عمان، بحرین، کرمان، سجستان، کابل، خراسان، بلاد ماوراء النہر، سندھ اور پنجاب کے بعض علاقے، یہ سب اپنی اپنی جگہ پر بڑے صوبے تھے، جو والیٔ عراق کے ماتحت ہوتا تھا، جس کا دارالحکومت کوفہ تھا، خراسان اور ماوراء النہر

کا عامل والیِ عراق کی جانب سے مقرر ہوتا تھا۔ اس کا مرکزِ حکومت عمادۃ شہر مرو ہُوا کرتا تھا، بلاد، بحرین اور عمان والیِ عراق کے مقرر کردہ عامل البصرہ کے ماتحت تھے، ملک سندھ اور پنجاب کا ایک مستقل عامل والیِ عراق کی جانب سے مقرر کیا جاتا تھا۔

(۴) بلاد جزیرہ — اس میں ارمینیہ، آذر بائیجان اور ایشیائے کوچک کے بعض خطّے بھی شامل ہوتے تھے۔

(۵) شمالی افریقہ - اس کے حدود میں مصر غربی، بلاد اندلس، جزائر سسلی، سردآنیہ اور بلیار داخل تھے، صدر مقام، قیران تھا، والی افریقہ، جزائر بحر روم اور بلاد اندلس کو جس کا دارالخلافت قرطبہ تھا، اپنی جانب سے ولاۃ مقرر کر کے بھیجتا تھا، جو وہاں اس کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتے تھے۔

اُموی خلفاء نے ولاۃ کے انتخاب میں خلفائے راشدین کی سیاست کی پیروی کی، یہ بھی عربوں ہی کو ولاۃ مقرر کرتے تھے، ولاۃ کے انتخاب میں ان کا اہتمام اتنا بڑھا ہُوا تھا کہ بعض اُموی خلفاء صرف خاندانِ شاہی کے افراد کو یہ بڑا منصب عطا کرتے تھے۔

سیّد امیر علی تحریر فرماتے ہیں۔ بنی اُمیّہ کے آخری عہد بالخصوص یزید بن عبدالملک کے دور میں نظامِ اداری میں ایک ایسا تعفن داخل ہو گیا جس کے بعد بڑے بدنتائج پیدا ہوئے، پہلے اقالیم کے ولاۃ کے لئے اپنے اپنے دارالحکومت میں بعض ولاۃ نے دمشق میں رہنا شروع کیا، یہ آدمی اپنی طرف سے مقرر کر کے بھیج دیتے تھے، جو صوبہ جات میں ان کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتے تھے۔ ان کی سب سے زیادہ توجہ بیت المال کی رقم سے اپنی ثروت بڑھانے اور مال و دولت کے

بڑے بڑے نذرانوں سے ولاۃ کی خوشنودی حاصل کئے رہنے کی طرف رہا کرتی تھی۔ والیٔ ملک کے انتظام و انصرام میں جلیل القدر عہدہ داروں کی ایک جماعت سے مدد لیتا تھا، ان میں عامل خراج، صاحب بیت المال، قاضی، قائد یا صاحب الشرطہ سب سے زیادہ اہم عہدہ دار ہوتے تھے۔

حضرت معاویہ بن سفیان اپنے عمال ان لوگوں کو مقرر کرتے تھے جن کی اہلیت و صلاحیت مسلم ہوتی تھی، یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد بنی اُمیہ میں ولایاتِ اسلامیہ کا اداری و سیاسی نظام حضرت معاویہ کا تعمیر کردہ نہ تھا، اس نظام کا مؤسس حقیقی عبدالملک بن مروان تھا، اسی نے شعبہ جات ادارہ و مالیہ کو عربی رنگ دیا تھا، عبدالملک رشوت خوری کو بے حد ناپسند کرتا تھا، اسے ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ اس کے ایک کاتب نے ہدیہ قبول کر لیا ہے۔ اس نے کاتب کو بلا کر کہا "خدا کی قسم اگر تم نے ہدیہ اس نیت سے قبول کیا ہے کہ ہدیہ پیش کرنے والے کو تمہیں اس کا کچھ بدلہ نہیں دینا ہے تو تم لئیم و دنی ہو، اگر تم نے اس ارادہ سے اسے قبول کیا ہے کہ تم اس آدمی کی وہ حاجت پوری کرو گے جسے ہدیہ نہ ملنے کی صورت میں تم پورا نہ کرتے، تو تم خائن ہو، اور اگر تمہارا منشاء یہ ہے کہ اس شخص کے ہدیہ کا عوض تم اس کو ضرور دو گے، اور تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کی خاطر تم امانت میں خیانت نہ کرو گے۔ اپنی ساکھ پر آنچ بھی نہ آنے دو گے تو تم نے جو کچھ قبول کیا ہے اس کا کم سے کم نقصان یہ ضرور ہوگا۔ کہ جن لوگوں کے ساتھ تمہارا معاملہ ہے ان کی زبان تم پر دراز ہوگی جن لوگوں کے ساتھ تمہاری نشست و برخواست ہے وہ تمہارے سامنے دلیر رہیں گے۔ اور تمہارے قوت و اقتدار کی ہیبت جاتی رہیگی۔" اس کے بعد اس کو برطرف کر دیا۔[۲]

عہد اموی میں والی کے اختیارات مطلق العنان ہوتے تھے حیات و موت

تک کا یہ مالک ہوتا تھا۔ زیاد بن ابیہ اور حجاج بن یوسف کا خطبہ اور موسیٰ بن نصیر کی حالت اس کا واضح ثبوت ہیں، حجاج بن یوسف خلیفہ کی مرضی حاصل کئے بغیر اپنے حسب منشا، محاصل وخراج وصول کرتا، اس کے علاوہ اور بہت سے عمال بھی اسی کے نقشِ قدم کی اتباع کرتے تھے۔ اسی طرح اموی والی کی مدت حکومت بہت طویل ہوا کرتی تھی، چند والیوں کی مدتِ ولائت قریب قریب ۲۰ سال کے پہنچ گئی تھی۔ مثال میں مشرق میں حجاج بن یوسف کی ولائت اور مصر میں عبدالعزیز بن مروان کی ولائت کو سامنے رکھا جا سکتا ہے، بعض بعض والیوں کا اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ تقریباً خلیفہ کے حدود و اختیارات میں ان کے قدم داخل ہونے لگے تھے۔ جب عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھ پر بیعت ہوئی تو انہوں نے اپنے ماقبل دور کے بنی اُمیہ کے تمام عمال کو موقوف کر دیا، مظالم کا انسداد کیا اور اپنے نئے عمال کو حکم دیا کہ بغیر میری طرف مراجعت کئے کسی شخص کو قتل نہ کیا جائے۔

پروفیسر کُرد علی کا بیان ہے "اس میں کوئی شک نہیں کہ امویوں کا نظم ونسق ان خلفاء کے ہر دور میں نقائص سے پاک نہ تھا، لیکن اس میں اصل نقص یزید بن ولید کے زمانہ میں پیدا ہوا یا اپنے اعمال وکردار میں اپنے اسلاف کی راہ سے ہٹا ہوا تھا۔ ان کے آخری فرماں روا کو باوجود اس کی رفعت ہمت وشدتِ جرأت کے خلافت کی مدافعت میں برابر مصروف رہنا پڑا، اور خلفشار وانتشار اتنا بڑھا کہ مملکت کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ امویوں کی حکومت خالص عربی حکومت تھی۔ بالعموم حکومت کے اختیارات معزز وشریف خاندان کے افراد کو ملا کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ بنی اُمیہ کے اقتدار کے زوال کے اہم اسباب میں خبروں کا اُن سے چھپایا جانا، سپہ سالارانِ دولت کو برافروختہ رکھنا، اور خود خاندان اموی کے اراکین میں ولائت عہد کے بارے میں پھوٹ اور نفاق کا پیدا ہو جانا تھا، پھر سب سے بڑی بات یہ تھی۔ کہ فوج

کی تنخواہ کی ادائیگی میں لیت ولعل سے کام لیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان کے خلاف عباسیوں کی مدد کی۔[1]

عہدِ عباسیہ کی تبدیلیاں

عصرِ عباسی میں نظام اداری ایک مرکزی نظام بن گیا، اموی ولاۃ مثلاً حجاج اور زیاد بن ابیہ خود سرانہ اختیارات کے مالک تھے۔ لیکن اس عہد میں اقالیم کے عمال محض عمال تھے۔ یہ مطلق العنان والی نہ تھے اور یہ غیر معمولی اور جلیل القدر شخصیات سے بھی نہیں ہوتے تھے۔ اسی لئے وہ نظام جو لامرکزی تھا۔ مرکزی نظام کی طرف منتقل ہوگیا۔ اسی صورتِ حال نے عمال کے نفوذ کو کم دیا، دولتِ عباسیہ میں ولایاتِ اسلامیہ کے عہدہ داروں کے اہم مناصب، صاحب المال، صاحب البرید اور قاضی کے عہدہ جات تھے۔ اور والی کا فرضِ منصبی نماز اور قیادتِ فوج تک محدود تھا۔

دولتِ عباسیہ میں جب ضعف پیدا ہوگیا تو عمال بغداد میں اپنے قیام کو ترجیح دینے لگے۔ اقالیم میں یہ اپنے نائب بھیجدیتے تھے، جو وہاں ان کے نام پر حکومت کرتے تھے۔ پھر مرکزی اقتدار کا ضعف جب بہت زیادہ بڑھ گیا تو اقالیم میں ابتری پیدا ہوگئی۔ عمال نے بغاوت کی، اور اپنے صوبہ کے خود مختار فرماں روا بن گئے۔ مصر میں دولت تولونیہ اور دولتِ اخشیدیہ کا ظہور ہوا۔ مشرق میں دول طاہریہ، صفاریہ اور سمانیہ قائم ہوئیں۔ اور بالآخر دولت عباسیہ کا انجام یہ ہوا کہ وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہوگئی۔ خلیفہ منصور کی ذات نے اس نظام سیاسی کی بنیاد رکھی تھی۔ جس پر دولت عباسیہ اور وہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں چلتی رہیں جو اس سے علیحدہ ہوگئی تھیں۔ پروفیسر نکلسن تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] الادارۃ الاسلامیہ فی عز العرب ص ۱۱۹

جن حالات کے ماتحت عباسیوں کا دارالخلافت بغداد کو منتقل ہوا تھا۔ خود انہیں حالات کا یہ تقاضا تھا کہ نظامِ حکومت کے تمام شعبوں میں ایسے بڑے تغیرات پیدا کر دیئے جائیں، جو حکومت جدیدہ کے حالات کے مناسب ہوں۔ اگر اموی عرب استقراطیت (شخصی سلطنت) کے نمائندہ تھے، تو عباسیوں نے ٹھیک وہ نظام استبدادی اختیار کیا جو مشرق میں رائج تھا۔ اور جس سے اہل فارس داریوس اور اجرسیس (Xerxes) کے زمانہ سے مانوس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عباسیوں نے اسی طرح مطلق العنان حکومت کی جس طرح ان سے پہلے ملوک آل سامان نے خود سرانہ حکومت کی تھی۔

گو اصحاب دواوین اور خاندان عباسی کے ممتاز افراد غیر سرکاری مشاور کی حیثیت رکھتے تھے لیکن درحقیقت دولتِ عباسیہ میں نظامِ حکومت رشید کے عہد تک استبدادی رہا، خلیفہ کی ذات ہر قسم کی طاقت و قوت کا سرچشمہ اور انتظام والفرام دولت سے متعلق جملہ اوامر کا مرجع تھی۔ وزیر خلیفہ کا دست راست تھا۔ اس کے نام پر تمام مہماتِ دولت کا فیصلہ کرتا تھا۔ اسے عمال کے عزل ونصب کا اختیار حاصل تھا۔ اور محاصل کی وصولی، دولت کے مواد و مصارف کی ذمہ داری دیوان الرسائل کی نگرانی سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس طرح وہ ملک کی حکومت میں خلیفہ کا نائب تھا۔ اپنے واجبات عادیہ یعنی خلیفہ کے مشورہ و اعانت کے فرائض کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی ذات میں مدنی و حرفی دونوں قسم کے اختیارات مرکوز کر لئے تھے۔ یہ تھی شان عباسیوں کے عہد اول کے وزراء کی جو اپنی طاقت و قوت خلفاء سے حاصل کرتے اور ان کے احکام و اوامر کی تنفیذ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ بعد کو تجربات نے بتایا کہ وزیر کی ذمہ داریاں اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ ان سے تنہا عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مختلف

دواوین (دفاتر) کی نگرانی اور ان کے انتظام والصرام میں ان کی اعانت کے لئے عہدہ داروں کا تقرر ضروری سمجھا گیا۔

اس عہد کا نظم و نسق منضبط قواعد کی بنیادوں پر قائم اور عہد حاضر کی متمدن اقوام کے جدید نظاموں کے مشابہ تھا، بلکہ بعض حیثیتوں سے ہمارے زمانے کے نظام سے بڑھا ہوا تھا۔ تمام مناصب دولت کے دروازے ـ مسلمان، یہودی اور نصاریٰ سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوتے تھے۔

حکومتی نقطۂ نظر سے امویوں اور عباسیوں کے درمیان کوئی چیز اتنی مکمل تفریق نہیں پیدا کرتی جس قدر یہ کہ وہ مربوط نظام جو عباسیوں کے عہد میں پیدا ہوا، اور جسے تمام دول اسلامیہ نے اختیار کیا۔

اقالیم کے انتظام والصرام کے لئے عمال کا تقرر خلیفہ خود کرتا تھا، ان اعمال کے مدنی و قضائی اختیارات مطلق العنان نہ ہوتے تھے۔ اور نہ کوئی عامل ایک طویل مدت تک اپنے عہدہ پر رہنے دیا جاتا تھا۔ جب وہ اپنے منصب سے علیحدہ ہوتا تھا تو اس کے صوبہ کے کوائف سے متعلق اس سے مفصل رپورٹ طلب کی جاتی تھی، اس کی صداقتِ بیان اگر ذرّہ برابر بھی مشکوک معلوم ہوتی تو اس کی ساری جائداد ضبط کرلی جاتی تھی۔ منصور کے عہد میں والی کا کام ایک نام کے عہدہ سے زیادہ نہ تھا۔ قضاء احکام کا اختیار اس ملک کے قاضی کے ہاتھ میں ہوتا تھا، جس کی مدد کے لئے مختلف شہروں میں نائب ہوا کرتے تھے، لیکن اس سب کے باوجود کسی والی کو خاص امتیازات حاصل ہوتے تھے۔

صوبے انہیں بطور جاگیر کے دے دیئے جاتے تھے، اور اس کے معاوضہ میں وہ خلیفہ کی سیادت تسلیم کرتے اور کچھ امداد بہم پہنچاتے تھے۔

پروفیسر گرُ دملی تحریر فرماتے ہیں: "معتصم اور اس کے بیٹے واثق نے نظم ونسق میں کوئی ایسی نئی چیز پیدا نہیں کی جو مامون ورشید کے زمانہ میں متعارف نہ رہی ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود ان دونوں (مامون ورشید) کے دور میں ان کے بعد کے عہد میں خلافت عباسیہ اسی اساس پر چلتی پھولتی رہی جس کی تاسیس منصور نے کی تھی، لیکن قرن ثالث کے نصف اخیر میں اس کا وہ حیرت انگیز حسن زائل ہو گیا جو عہد اوّل میں اس کو حاصل تھا، مامون کے بعد بہت کم ایسے خلفاء پیدا ہوئے جو اپنی ذکاوت وتجربات کے لحاظ سے نادرروزگار رہے ہوں، خلافت اپنے علماء کے ضعف یا انحطاط کا شکار ہوگئی۔ خلفاء کے اعمال وکردار میں آب وتاب نہ رہی اور ان سے نظم وسلیقہ رخصت ہوگیا۔ اس انحطاط کے اہم اسباب میں نظم ونسق کا فساد اور قضاء میں اختلال کا پیدا ہو جانا ہے۔ حالات کی ان خرابیوں نے وزراء اور عمال کو حریص بنا دیا اور رعایا کے حقوق تباہ وبرباد کئے گئے۔[1]

مصر کا عرب نظام حکومت مصر اگرچہ عرب ملک نہیں تھا، لیکن جب وہ اسلام کا زیر نگیں ہوا، تو اس نے صرف اسلام ہی نہیں قبول کیا، بلکہ عربی زبان بھی اپنا لی۔ عربی تہذیب بھی اختیار کر لی۔ عرب مدنیت کا نمونہ بن گیا۔ مصر کی سرزمین انقلابات کی آماجگاہ رہی ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے نظام سیاست پر بھی ہم ایک نظر ڈال لیں۔

اسلامی فتح کے بعد مصر خلافت اسلامیہ کا ایک ماتحت صوبہ بن گیا اور سوا دو برس سے زائد مدت تک اس کی یہی حیثیت رہی اس کے بعد طولونیوں نے وہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ (۲۵۴-۲۹۲ھ = ۸۶۸ — ۹۰۵ء)

---

[1] الادارۃ الاسلامیہ فی عز العرب صفحہ ۱۴۶

جدید حکومت میں وہی نظام اداری (System of Administration) قائم رہا جو رومی حکومت کے عہد میں مروج تھا۔ عربوں کے نفسیات کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو یہ کوئی حیرت انگیز امر نہیں ہے، خیال تو یہی قائم کیا جا سکتا تھا کہ عرب مصر کے نظام حکومت کو سر سے پیر تک بدل ڈالیں گے، لیکن ہم نے دیکھا کہ اس قسم کی کوئی چیز واقع نہ ہوئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عرب طبعاً ان چیزوں کو قبول کرنے اور ان قوانین اور نظاموں کو اختیار کرنے کی طرف مائل ہیں جنہیں ان کے پیش رو اقوام نے برتا ہو۔ یہی سبب ہے کہ یہ نظام باقی رہا اور عرب اور غیر عرب تمام ولاۃ نے اس میں بغیر کسی قسم کا قابل ذکر تغیر کئے، اس کی تقلید کی، اگر کچھ تبدیلی رونما ہوئی تو وہ صرف یہ تھی کہ فاطمیوں کے عہد میں سلطانی مظاہر کا اضافہ ہوا، جو ان کے بعد عہدوں میں بھی باقی رہا۔ مدیر (کلکٹر)، یا محافظ (گورنر) مامور (پبلک افسر) یا نائب، وزیر خولی (مینجر) یا مفتش زراعی (زراعتی انسپکٹر) اپنی خصوصیات کے لحاظ سے آج بھی وہی حیثیت رکھتے ہیں جو رومیوں کے عہد میں ان کی تھی، فرق صرف الفاظ کا ہے، اسلامی فتح سے پہلے ان عہدہ داروں کے جو نام ہوتے تھے وہ اُدنچی زبان کے الفاظ ہوتے تھے۔ جرافتن ملن نے اپنی کتاب "مصر عہد رومان میں" تشریح کی ہے کہ لفظ مدیر اور رومیوں کے لفظ (ligoi) Epistra کے مترادف ہے۔ مامور Toparch کے فرائض انجام دیتا تھا، اور خولی یا مفتش زراعی بعینہ رومیوں کے یہاں کا (Sitologos) ہے۔

عربوں کی رواداری

بعض اکابر حکام روم اپنے عہدوں پر باقی رکھے گئے اور رومی رعایا اپنے حال پر چھوڑ دی گئی۔ لیکن بہت سے عہدے ان رومی عمال کے چلے جانے کی وجہ سے خالی ہوگئے

جنھوں نے مسلمانوں کی رعایا بننا پسند نہ کیا۔ عربوں نے ان کی جگہیں قبطیوں کو دے دیں۔ اس طرح سے تھوڑے عرصہ میں دولت کے اکثر عمال مسیحی ہو گئے۔ اور مسلمان حکومت کی ذمہ داریوں سے غیر متعلق ہونے کی وجہ سے امورِ دین میں مصروف ہو گئے۔

نماز امامت دینیہ کے ساتھ اپنے ارتباط کی وجہ سے والی کے اہم فرائض میں داخل تھی۔ یہ واضح رہے کہ امامت دینیہ ہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے اسلام میں حکومت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ والی کا فرض تھا کہ جمعہ اور عیدین کے مواقع پر نماز کے مکمل انتظامات کرے۔ نماز میں لوگوں کی امامت کرے، اور امامت کے لئے اپنے نائب مقرر کرے۔ نائب مقرر کرنے کی ضرورت اس وقت پیدا ہوئی جب جامع مساجد کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ اضافہ کا سبب یہ تھا۔ کہ قبطیوں اور مسلمانوں میں ازدواجی اختلاط کی وجہ سے مصر میں اسلام پھیل رہا تھا۔ اور مصری اکثریت کے ساتھ یا تو خود دین کی طرف اپنے میلان و رغبت کی بنا پر یا جزیہ سے بچنے کے لئے حلقہ بگوش اسلام ہو رہے تھے۔

خلفائے راشدین اور بنی اُمیہ کے عہد اور دورِ عباسی کے صدر اوّل میں ولاۃ خود بنفسِ نفیس نماز میں امامت کا فرض انجام دیتے تھے۔ جب مصر کے والی غیر عرب ہوئے تو عربی الفاظ اچھی طرح ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے امامت کے لئے اپنے نائب مقرر کرنے لگے۔ یہ نمائندہ بنانے کا دستور ولاۃ ہی تک محدود نہ رہا۔ بلکہ خلفاء تک بھی پہنچ گیا۔

جوہر صقلی کا طرزِ عمل ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اسلامی عہد میں مصر کے نظام اداری میں کوئی قابلِ ذکر تغیر

نہ ہوا۔ صرف فاطمیوں کے دور میں کثرت کے ساتھ مظاہر سلطانی اس د
پیدا ہو گئے تھے۔

یہ اس وقت ہوا جب جوہر نے مصر پر اپنا مکمل قبضہ قائم کرنے ک
بعد مصر کے سنیوں کو ہر طرف کر کے قبیلطان مغاربہ (مور) کو اہم
مناصب دینے شروع کئے۔ جوہر نے اپنی سیاست کی تنفیذ شیعی مذہب
کے ہر نشان کو خواہ وہ دینی ہو یا مدنی مٹا ڈالنے کی پالیسی اختیار کی
کہ اس مذہب کے پیرو اس کی نگاہ میں دین کے باغی تھے[1]۔

جوہر اس ملک کے انتظام و انصرام کے فرائض خلیفہ کے نائ
کی حیثیت سے انجام دیتا تھا، اس کی سیاست انتہائی حکمت پر مب
تھی۔ اس نے مغاربہ (مور) کے سامنے ان اداری نظاموں کا علم و تجرب
کرنے کے لئے ایک وسیع میدان پیش کر دیا، جو اخشیدیوں کے عہ
مصر کی حکومت میں رائج تھے، اس سیاست کو مقریزی نے ان الفا
واضح کیا ہے "کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں تھا جس میں اس کے افسر کے
کسی مغربی (مور) کو جوہر نے شریک نہ کیا ہو[2]"۔

جوہر نے اپنی سیاست کا تدریجی نفاذ مناسب سمجھا تاکہ سنیوں کے
جن کے ہاتھ میں ملک کا انتظام و انصرام تھا۔ اس کے خلاف بھڑک نہ
اور اس طرح حکومت کی مشینری معطل اور ملک کا امن و امان خطرہ میں
جوہر اپنی سیاست میں پورے طور پر کامیاب ہوا۔ دولت کے ہر قسم کے
جات ۳۷۰ھ میں یعنی فتح مصر کے تقریباً ۲۰ سال بعد شیعوں کے ہاتھ
گئے اور دولت کے صرف چند مناصب سنیوں کے قبضہ میں رہ گئے۔ جو
تمام عہدیداران دولت کے پاس اپنا حتمی حکم بھیجا کہ مذہب شیعی کے

[1] جواہر الصقلی (علی ابراہیم حسن) ص۲۳
[2] اتعاظ الحنفاء للمقریزی

کے مطابق جو دولت حاکمہ کا مذہب ہے ملک کا انتظام و انصرام کیا جائے۔ ان احکام کی تنفیذ میں جن عہدہ داروں کے اندر کسی قسم کی نرمی کے آثار نظر آتے تھے۔ فاطمی اس کی سزا ان کی معزولی کی صورت میں دیتے تھے۔ اس دار وگیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو اذیت رسانی کے ڈر سے یا دولت کے مناصب عالیہ حاصل کرنے کی لالچ میں مصر کے اندر سُنّی عہدیداروں میں مذہب شیعی پورے طور پر پھیل گیا، اور انھیں سنیوں کے نقشِ قدم کی پیروی غیر مسلموں یعنی نصاریٰ و یہود نے بھی کی۔

۳۶۳ھ کے اوائل میں مصر کے اندر عہدہ جات کے انتظام میں اہم تغیرات پیدا ہوئے۔ فاطمیوں نے دارالشرطہ (کوتوالی) کو قاہرہ منتقل کر دیا اور اسے جیر کے چارج میں دے دیا، معز نے بنی عبدالسمیع کو خطابت کے عہدہ سے جس پر وہ ۴۴ سال تک فائز رہ چکے تھے۔ علیحدہ کر دیا اور جامع عمرو کی خطابت کو جعفر بن الحسن بن الحسین کے حوالہ کیا اور ۳۶۵ھ میں جامع ازہر کی خطابت اس کے بھائی کو دی گئی۔ بیت المال محمد بن الحسان بن مہذب کی نگرانی میں آیا۔ یہ سب کے سب شیعان مغاربہ تھے۔

اہم اداری مناصب (Administrativeposts.) جن پر شیعہ فائز تھے۔ خراج، وزارت، قضا، اور احتساب کے عہدہ جات تھے۔ خراج کا محکمہ یعقوب بن کلس اور جلوج بن الحسن کے ماتحت تھا۔ پھر بعد کو ان دونوں کو وزارت کا منصب ملا۔

فاطمیوں کے عہد میں متعدد دفاتر (دواوین) تھے، ہر دیوان (دفتر) ایک بڑے عہدہ دار کے ماتحت ہوتا تھا، ان عہدہ داروں میں ایک عہدہ دار صاحب دیوان الجیش تھا۔ اس کے سامنے فوجیں اور ان کے گھوڑے معائنہ کے لئے

پیش ہوتے تھے۔ دیوان خزائن الکسوۃ والطراز کا افسر ارباب اقلام میں سے
ایک بڑا عہدہ دار ہوا کرتا تھا، دیوان الاحباس (اوقات) موجودہ زمانے
کے وزارتِ اوقات کے مشابہ تھا۔ ایک اور دفتر دیوان الرواتب (تنخواہ)
بھی تھا۔ ہر سال تنخواہوں کا حساب خلیفہ کی خدمت میں پیش ہوتا، ملاحظہ
کے بعد خلیفہ جس کی تنخواہ چاہتا بڑھا دیتا، خلیفہ مستنصر کے سامنے منظوری
کے لئے عہدہ داروں کی تنخواہوں کو پیش کرنے کا جو طریقہ تھا۔ اس کے متعلق
قلقشندی نے ایک دلچسپ عبارت نقل کی ہے، وہ لکھتا ہے اس رجسٹر
میں جس کی تنخواہوں کا اندراج ہوتا تھا۔ خلیفہ کوئی تبدیلی نہیں کرتا تھا۔ اپنے
اپنے دستخط سے پہلے خود اپنے قلم سے یہ عبارت لکھ دیتا تھا۔ فقر کا ذائقہ تلخ ہوتا
ہے۔ حاجت گردنوں کو جھکا دیتی ہے۔ نعمتوں کی حفاظت تنخواہوں کی فراوانی
سے ہوتی ہے۔ اس لئے دستور سابق میں کوئی تغیر نہ کیا جائے۔

ماعندکم ینفد وماعند الله باق

اسی طرح خلیفہ حافظ (۵۲۴-۵۴۴ھ = ۱۱۳۰ - ۱۱۴۹) نے بھی اس
قسم کے ایک رجسٹر کے حاشیہ پر یہ عبارت تحریر کی تھی۔ اللہ تعالٰی کی خاطر
کثیر داد و دہش کو امیر المومنین زیادہ تصور نہیں فرماتے۔ ان کی تنخواہیں
حسب دستور اُن کو دی جائیں .... (یہ حکم) امیر المومنین کی جانب سے
کرم، کارِ خیر اور کلام الٰہی کی اس آیت پر عمل کے خیال سے ہے ......

انما نطعمکم لوجہ الله لا نرید منکم جزاء ولا شکورا

عہد فاطمی میں عہدہ داروں کی فہرست بہت بڑی تھی۔ چند قابل
عہدہ دار۔ صاحب الباب، حامل مظلۃ الخلیفہ (چتر شاہی) صاحب الرسالہ
اور صاحب بیت المال تھے۔ صاحب الرسالہ کا کام وزراء اور دیگر بڑے

عہدہ داروں کے پاس خلیفہ کے مکتوبات کو پہنچاتا تھا۔ اور صاحب بیت المال بمنزلہ عہد حاضر کے وزیر مالیہ کے تھا۔ ان کے علاوہ بہت سے دینی مناصب بھی تھے ان میں اہم قاضی القضاۃ کا منصب تھا۔ یہ احکام شرعیہ کی نگہداشت، ٹکسال، گھروں کی نگرانی اور سکوں کو قانونی معیار کے مطابق رکھنے کا اہتمام کرتا تھا۔ داعی الدعاۃ کا مرتبہ تقریباً قاضی القضاۃ کے برابر تھا۔ یہ دارالعلم اور مساجد میں نشر دعوت فاطمی کے لئے کوشاں رہتا تھا محتسب کا فرض منصبی بازاروں کی دیکھ بھال، آداب، مکارم اخلاق، اور امانت کی حفاظت ناپ، تول اور ادائیگی فرض کا ضبط و انصرام کرنا تھا۔ اس کا انتخاب ممتاز مسلمانوں سے ہوتا تھا۔ اس لئے کہ اس کا کار منصبی بڑی حد تک مذہبی تھا۔ اس کی تنخواہ تیس ہزار دینار ماہانہ تھی۔

عہد فاطمی میں وزرات کے بڑے عہدہ داروں میں وکیل بیت المال اور نائب صاحب الباب بھی تھے۔ نائب صاحب الباب کے دول کا استقبال کرتا، اور ان کے مرتبہ کے لائق جگہ پر ان کے قیام کا انتظام کرنا۔ قرار کی بھی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ یہ خلیفہ کے مجالس و مواکب میں کلام پاک پڑھتے۔ انہیں قرار الحضرۃ کہا جاتا تھا۔

عہد ممالیک کی بنیادی تبدیلیاں

عہد ممالیک میں مصر کے نظام اداری میں بنیادی تبدیلیاں ہوئیں۔ بیبرس نے اپنی دولت کے انتظام و انصرام میں اپنے امرائے مقربین سے مدد لی۔ اور ان کو اعلیٰ مناصب دیئے۔ بیبرس مصر سے اکثر غائب رہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب تک مصر کے باہر خارجی لڑائیوں میں وہ مصروف رہا کرے، یہاں کوئی ممتاز رکن دولت اس کے نائب کی حیثیت سے سلطنت

کا انتظام کرے، اس لئے نائب السلطان کے اس عہدہ کو جو دولت الوبتیہ میں پیدا ہوا تھا۔ از سر نو زندہ کیا۔ یہ نائب سلطان کی عدم موجودگی میں اس کی قائم مقامی کرتا تھا۔ اور تقسیم وظائف اور مناصب دولت پر ذی استعداد افراد کے تقرر میں سلطان کا شریک کار ہوتا تھا اپنے اقتدار کی وسعت کی وجہ سے وہ "کافل الممالک والسلطان الثانی"[1] کے نام سے موسوم تھا۔

ممالیک کے وزراء بھی ہوتے تھے جن سے وہ مشورہ لیا کرتے تھے۔ لیکن چونکہ سلطان کی عدم موجودگی میں "نائب" اس کا قائم مقام ہوتا تھا، اس لئے ان کو کامل اقتدار حاصل نہ تھا۔ ایک اور وزیر سفر میں سلطان کا ہمرکاب ہوتا تھا، یہ "وزیر الصحبۃ" کے نام سے معروف تھا۔ عہد ممالیک میں مصر میں وزارت کا عہدہ قائم رہا، لیکن جب الناصر محمد بن قلاوون کا دور آیا تو اس نے اس منصب کو اڑا دیا، اور ملک کے نظم ونسق کو "ناظر الدولۃ" کے سپرد کیا۔ اس کا رتبہ قریب قریب وزارت کے رتبہ کے برابر ہوتا تھا۔ اس کے مددگار بہت سے عہدہ دار ہوتے تھے۔ جو "مستوفین" کہلاتے تھے۔ ان کا افسر بالا مستوفی الصحبۃ کے نام سے موسوم تھا۔ اس کا فریضہ تنظیم امور دولت سے متعلق خاص قوانین و فرامین کا تیار کرنا اور کم رتبہ کے عہدہ داروں کو مقرر کرنا تھا۔

تغیرات یہیں تک محدود نہ تھے بلکہ ناصر نے نائب کا عہدہ بھی ختم کر دیا۔ اور نائب اور وزیر کے فرائض کا بار خود اپنے کندھوں پر لے لیا۔ اس نے ایک عہدہ "ناظر الخاصہ" کا پیدا کیا۔ ابتداء میں اس عہدہ دار کا کار منصبی سلطان کے مال وجائداد کا انتظام کرتا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دن کے بعد سلطان کے کثرت تقرب کی وجہ سے اس کا نفوذ بڑھ گیا اور سلطان کے نج کے امور میں

---

[1] حسن المحاضرہ للسیوطی ج ۲، صد ۸۴

دخیل ہونے لگا۔

ملوک سلاطین نے خاصکر بیبرس کے عہد سے — اپنے محل کو عہدیداروں کی ایک کثیر تعداد سے بھر رکھا تھا۔ ان میں خاص طور پر ہم "حاجب" کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا فرض منصبی سلطان کے حضور میں لوگوں کو پیش کرنا تھا۔ بقبہ میں اس سے قریب "استادار" "دوادار" اور "امیر جاندار" ہوتے تھے۔ اوّل الذکر کے ذمہ محلات سلطانیہ کا انتظام تھا، ثانی الذکر سلطان کے مراسلات کو روانہ کرنا اور منشورات (CrcW[α.B) کو دستخط کے لئے اس کی خدمت میں رکھنا تھا۔ تیسرا باب السلطان کی دربانی اور کبار داعیان دولت کی حاضری کے لئے سلطان سے اذن طلب کرتا تھا۔

عہد ممالیک میں اور بھی دوسرے مناصب وجود میں آئے، ان میں "امیر المجلس" اور امیر السلاح کے عہدے تھے۔ "امیر المجلس" کا فرض منصبی سلطان کی نگہبانی تھا، اس کا قرب سلطان سے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ یہ قصر کے اندر بلکہ سونے کے کمرہ میں بھی سلطان کی نگہبانی کے فرائض انجام دینے لگا "امیر السلاح" کے ذمہ مخازن اسلحہ اور جنگی تیاریوں کی نگرانی کا کام سپرد تھا۔

سلطان کے متعدد نائب ہوتے تھے۔ جو مہمات دولت مصریہ کے انتظام والضرام میں اس کی نیابت کرتے تھے۔ ان کا فرض منصبی سلطان کے صادر کردہ احکام کی تنفیذ اور خراج اور محاصل جنگی جمع کرنا تھا۔ اسکندریہ اس زمانہ میں اپنی تجارتی اہمیت کی بنا پر سب سے زیادہ عظیم الشان صوبہ تھا۔ بحر احمر کے ساحل پر مصر کا ایک سرحدی مقام عیذاب تھا۔ یہیں سے مشرق کی تجارت ہوتی تھی۔ الوجہ القبلی چند صوبوں میں تقسیم تھا۔ ان میں قوص الاشمونین، البہنسا، اور الجزیرہ تھے۔ اور الوجہ البحری کے اہم صوبہ جات بلبیس، منوف، المحلۃ الکبریٰ، دمنہور

قلیوب اور دمیاط تھے۔

اس زمانہ میں جو اہم مناصب پیدا ہوئے ان میں ایک "ولانت" کا منصب تھا جو اسلام کے عہد اول کے محکمہ پولیس (شرطہ) کے مترادف تھا۔ اس محکمہ کے افسر کے ذمہ امن و امان کا قیام مجرموں اور نقنہ پردازوں کی گرفتاری اور تمام وہ انتظامی اُمور سپرد تھے جو جمہور کے حفظ و سلامتی کے ضامن ہوتے ہیں۔ اس منصب کی ذمہ داریوں کو تین امراء سنبھالتے تھے۔ ایک کا کام قاہرہ میں امن و امان کا قیام اور یہاں کے باشندگاں کے باہمی اختلافات کا حل دریافت کرنا تھا، دوسرا یہی فرائض فسطاط میں انجام دیتا تھا اور تیسرا قبرستان کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ اس کا فرض منصبی جنازوں کے گزرنے کے وقت نظام قائم رکھنا۔ قبروں کی زیارتوں کے وقت، خاصکر تہواروں اور میلوں کے مواقع پر آداب عامہ کی پابندی کا خیال رکھنا اور قبروں کو چوروں کی دست درازی سے بچانا تھا۔ ورنہ یہ ایک غیر معقول سی بات ہوگی کہ والئ (قبرستان) کو فسطاط۔ اور قاہرہ کے والیوں کا درجہ ملے۔ درانحالیکہ قبرستان کے انتظام کے سلسلہ میں اس کی ذمہ داریاں ان کے فرائض کے برابر نہ ہوں[1]۔

قاہرہ میں "صاحب العسس" کا کام قاہرہ کے آگ بجھانے والی کلوں کا نظم و نسق ٹھیک رکھنا تھا۔ وہ کبھی کبھی نماز عشاء کے بعد آگ بجھانے والی کلوں کے اسٹیشن پر جسے مملوکوں نے شہر کے حصہ عزیہ کے محلہ الجدریہ کے قریب "سوق جمالون کبیر" میں بنا رکھا تھا، بیٹھا اور اس کے سامنے مٹکی (جلتی ہوئی لکڑی) رکھی رہتی جس سے آگ رات بھر روشن رہتی۔ اس کے ساتھ سقّے، بڑھئی اور دوسرے مزدور ہوتے تھے تاکہ رات کو اگر کہیں آتشزدگی ہو تو

[1] الظاہر بیبرس بجمال الدین سرور صفحہ ۱۳ محمد خطط ج ۲ صفحہ ۱۰۳

اسلام کی سیاست

عدل ، مساوات ، شوریٰ

سیاست عادلہ کی تعریف کیا ہے؟

ہر قوم اور ملت کے شئون داخلی، حالات خارجی، اور نظم وقوانین کی اصلاح وتعمیر کے لئے جو اقدامات بروئے کار لائے جائیں وہی "سیاست عادلہ" کہلاتے ہیں، جن سے افراد وجماعت کا امن پیدا ہوتا ہے، جن میں ان کے مصالح کی رعایت ملحوظ ہوتی ہے جو ان کے علاقوں کی تنظیم اور اُن کے ارتقاء کے ضامن ہوتے ہیں،

اسلام اس سیاست عادلہ کا سب سے بڑا علمبردار ہے، اسی سیاست پر وہ اپنے اصولوں کی تعمیر کرتا ہے، تاکہ نظم عادلہ اور مصالح عوام کی بنیاد ہر زمانہ ہر ماحول اور ہر دور میں مضبوط ومستحکم رہے،

ہمارے اس دعویٰ کی دو دلیلیں ہیں۔

ایک تو یہ کہ اسلام کے لئے اصل اول اور مصدر عام ہر حالت میں کتاب اللہ ہے جس میں جزئیات کی تفاصیل تو نہیں ہیں۔ لیکن ان قواعد کلیہ کو مخصوص طور پر ظاہر کر دیا گیا ہے، جو حکومت کے عام حالات کی تنظیم وتشکیل کے لئے معیار کا کام دیتے ہیں اور یہ وہ بنیادی قواعد ہیں جو ہر اُمت کے لئے ہر زمانہ میں یکساں کارآمد اور سودمند ہیں، پھر جب ان کے تفصیلات وجزئیات کا معاملہ سامنے آتا ہے تو ہر قوم اور ہر ملت اپنے اختلاف احوال کیمطابق

ان میں اختلاف محسوس کرتی ہے اور ان اختلافات احوال و زمان کے بارے
میں اسلام ساکت ہے کیونکہ وہ ہر اُمت کو اس کا حق دیتا ہے کہ وہ اپنے
مصالح خاص اور اقتضائے احوال کے مطابق وہ روش اختیار کرے جو کتاب
سنت کے بنیادی اصولوں سے مختلف اور متعارض نہ ہو۔

حکومت و دولت

اب جہاں تک حکومت و دولت کا تعلق ہے اسلام
نے حکومت کے لئے کوئی واضح نظام نہیں پیش کیا
ہے۔ نہ سلطان وقت یا (امیر) اور ارباب حل و عقد کے اختیار اقتدار کے
بارے میں کوئی واضح دستور پیش کیا ہے۔ اس نے صرف بنیادی عناصر کے مختصراً
کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔ جن پر ہر حکومت عادلہ کے لئے عمل ضروری ہے
اور جن پر عمل کرنا، کسی حالت، کسی زمانہ اور کسی دور میں کسی قوم کے لئے
ناممکن نہیں ہے۔

ایک بنیادی عنصر "عدل" ہے اللہ تعالے فرماتا ہے۔

واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل، یعنی جب
لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو تمہارا فیصلہ عدل کے ماتحت ہونا چاہئے
دوسرا بنیادی عنصر "شوریٰ" ہے، خدا فرماتا ہے شاورھم فی الامر
اپنے معاملات میں باہمی صلاح و مشورہ سے کام لیا کرو۔

پھر مساوات عام ہے خدا کا ارشاد ہے۔ انما المؤمنون اخوۃ
تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

ان عناصر کے علاوہ یعنی عدل، شوریٰ اور مساوات، نظم تفصیلی جز
کی جو بنیادیں ہیں ان کے بارے میں اسلام خاموش ہے تاکہ اولوالامر حالات
و مصالح کے مطابق نظم و ضبط قائم کریں۔ اسی منہاج پر حکومت کی تشکیل

اور اسی اصول پر اپنی مجالس کو منضبط رکھیں لیکن اس توسیع اختیارات کے باوجود ان پر لازم ہے کہ عدل کے حدود سے تجاوز نہ کریں، اور شوریٰ و مساوات کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیں۔

اب قانونی جنائی (تعزیرات) کو لیجئے۔ مجرمین کی پانچ جماعتوں کے علاوہ کسی مجرم گروہ کے لئے عقوبات مقرر و معین نہیں کی گئی ہیں۔

ایک تو وہ لوگ جو خدا اور رسولؐ سے برسرِ جنگ ہوتے ہیں اور خدا کی اس زمین کو فساد و فتنہ کی جولان گاہ بنا دیتے ہیں، دوسرے وہ لوگ جو پاک دامن اور عصمت مآب خواتین کو متہم کرتے ہیں، چوتھے وہ لوگ جو زنا کے مرتکب ہوتے ہیں، پانچویں وہ لوگ جو چوری کرتے ہیں۔

مذکورہ جرائم کے علاوہ جتنے جرم بھی ہیں ان کے لئے اسلام نے کوئی عقوبت اور تعزیر مقرر نہیں کی ہے۔ بلکہ اسے اولوالامر کے لئے چھوڑ دیا ہے، کہ وہ امن و امان، دفع شر، ازالۂ فساد، اور استیصال فتنہ کے پیش نظر جو عقوبت اور تعزیر مناسب سمجھیں جاری کریں، اس لئے کہ بقیہ جرائم امتوں اور قوموں کے حالات، ماحول، زمانہ اور دور کے ساتھ اپنی نوعیتیں بدلتے رہتے ہیں، لہٰذا ہر امت کے ارباب اقتدار و اختیار اور ارباب حل و عقد کے لئے راستہ کھلا چھوڑ دیا کہ وہ خود عقوبات و تعزیرات کا مناسب حال تقرر کریں اور عقوبت کا جو اصل مقصد ہے اسے پیش نظر رکھیں البتہ اس بارے میں بھی خدائے بزرگ و برتر نے ایک اصل عام مقرر کر دی ہے جو کسی امت اور قوم کے لئے بھی گراں نہیں ہو سکتی۔ وہ یہ کہ عقوبت اور تعزیر، جرم کے مطابق ہونی چاہیئے، (جرم ہلکا ہے تو سزا بھی ہلکی ہونی چاہیئے جرم بڑا ہو تو سزا بھی بڑی ہونی چاہیئے) چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے۔ وان عاقبتم فعاقبوا بمثل

ماعوقبتم بہ" یعنی اگر تم کسی کو عقوبت دو تو اتنی ہی جتنی پہونچی ہو، پھر فرمایا۔ فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم یعنی اگر تم کسی پر تعدی کرو تو اتنی ہی جتنی تعدی تم پر کی گئی ہو!

قانون معاملات ہیں، ضروریات کے پورا کرنے، اور احتیاجات کے رفع کرنے کے لئے نص کے ذریعہ حکم اباحت جاری فرمایا اور بیع، اجارہ، رہن وغیرہ کو حلال کر دیا۔ اور اس سلسلہ میں اس اہم بنیاد کی طرف اشارہ کر دیا۔ جس پر مبادلات و معاملات کو مرتکز رہنا چاہئیے۔ یعنی مبادلات و معاملات کے لئے اہم بنیاد "تراضی طرفین" ہے، مطلب یہ کہ جبر و جور نہ ہو، رضامندی اور خوش دلی کارفرما ہو۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: "یاایھا الذین امنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم " یعنی اے مسلمانو! اپنے مال کو ناجائز بنا کر اسے باطل کی آمیزش کے ساتھ نہ کھاؤ، بجز اس کے کہ وہ مال تجارت ہو، جو باہمی رضامندی سے حاصل ہوا ہو، ان معاملات کے سلسلہ میں تفصیلی احکام، ارباب حل و عقد کے لئے چھوڑ دیئے کہ وہ امت کے مناسب حال "تراضی" کی بنیاد پر انہیں مرتب اور منضبط کریں۔

اسی طرح جو معاملات، نزاع پیدا کرتے ہوں، جو عداوت اور بغض کے موجب ہوتے ہیں۔ جن سے فتنہ و فساد کی گرم بازاری ہوتی ہو۔ ان کو نص کے ذریعہ منع فرما دیا۔ اور اس کی بنیاد و اساس کیا رکھی۔؟ دفع ضرر اسباب بغض و عناد کا انقطاع، فتنہ و فساد کے عناصر کا استیصال! مثلاً سود (ربا) کو اور جوئے کو حرام قرار دے دیا، لیکن احکام جزئیہ کی تفصیل سے احتراز کیا، اس لئے ہر امت اور قوم اپنے مناسب حال جزئیات کو مرتب

کرکے اصلاح احوال کے معاملات کی سعی و کوشش کرے۔

نظام مالی میں ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ مالداروں پر محاصل اور ٹیکس عائد کئے گئے جن کا مقصد یہ ہے کہ غیر معمولی نفع اندوزی سے روکا جائے۔ اور محتاجوں اور ضرورتمندوں کی مدد کی جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں بھی آمد و خرچ کی بعض تفصیلات یونہی چھوڑ دی گئی ہیں۔ تاکہ ہر اُمت اپنے مناسب احوال انہیں منضبط اور منظم کرکے بروئے کار لائے۔

سیاست خارجیہ

اسلام نے سیاست خارجیہ کے سلسلہ میں ایک اصولی راہِ عمل متعیّن فرمادی ہے۔ لاینھٰکم اللہ عن الذین یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین۔ جو (غیر مسلم) تم سے دین کے معاملہ میں قتال نہیں کرتے اور تمہیں گھروں سے نکالنے کے درپے نہیں ہوتے۔ ان سے اچھا برتاؤ کرنے اور انصاف ور واداری کا برتاؤ کرنے سے خدا تمہیں نہیں روکتا۔

اب ایک اور آیت ملاحظہ ہو۔

انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علیٰ اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولٰئک ھم الظالمون

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں تنازعہ کریں۔ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالنے کے درپے ہوں۔ خدا ایسے لوگوں سے دوستی کے پینگ بڑھانے کو منع کرتا ہے۔ اور جو شخص (مسلمان) ایسے (دشمنان خدا و رسول) سے دوستی کرے گا۔ اس کا شمار ظالموں میں ہوگا۔

خارجی سیاست کا یہ اصول ہدایت نامہ ہے، جو اسلام نے مرتب کر دیا ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھکر تفصیلات اور جزئیات مرتب کرنے کا کام، اُن

لوگوں کا ہے جو روح اسلام سے واقف ہیں، اور حالات زمانہ سے بھی ناواقف نہیں ہیں۔ اسلام ہمیشہ اصولی احکام دیتا رہا ہے اور جزئیات متعین کرنے سے گریز کرتا ہے اس لئے کہ اگر جزئیات بھی مرتب کر دیتا۔ تو اسلام کا نظام جامد اور وقتی ہو کر رہ جاتا۔ حالات و مصالح کے لحاظ سے اس میں کسی قسم کی جائز، مناسب اور ضروری تبدیلی نہ ہو سکتی۔ اور یہ بات مصالح عام کے خلاف ہوتی، اور مصالح عام کو اسلام کسی وقت بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا۔

چنانچہ ان آیات کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جزئیات کی تفصیل کر کے عام حالات کو مخصوص نہیں کیا گیا ہے۔ نگاہ تعمق سے دیکھئے تو اسلام کا یہ کوئی نقص یا قصور نہیں۔ بلکہ یہ تو حکمت بالغہ ہے کہ ہر امت کے لئے یہ آسانی بہم پہنچائی گئی ہے۔ کہ وہ اپنے مصالح کے لحاظ سے نہیں بروئے کار لائے۔ بس شرط جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ان بنیادی حدود سے تجاوز نہ ہونے پائے جو پہلے سے مرتب اور مدون کر دیئے گئے ہیں اگر اسے کوئی نقص سمجھے تو یہ اس کی غلطی ہے، یہ تو وہ غائت کمال ہے جو نظام قانون سازی کا اہم ترین حصہ ہے۔ جو مصالح عوام کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔

باب کے شروع میں ہم نے جو دعویٰ کیا تھا۔ اس کی دو کیفیتیں ہمیں پیش کرنی تھیں، پہلی دلیل تو آپ کی نظر سے گزر چکی، اب دوسری دلیل ہم پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام اور مصالح انسانی

اسلام نے اپنے بہت سے احکام، آیات اور ارشادات سے یہ امر واضح کر دیا ہے کہ اس کی غائت یہ ہے کہ انسانی مصالح کو ملحوظ رکھے اور ضرر کو دفع کرے اور ان کا مقصود یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان عدل قائم رکھے، انہیں ظلم و

سرکشی سے باز رکھے اس کی تائید اس حکم تشریعی سے ہوتی ہے جو مخصوص طور پر احکام سمیت موجود ہے۔ مثلاً ارشاد خداوندی ولکم فی القصاص حیاۃ یعنی قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔

نیز یہ فرمان کہ" انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلٰوۃ فهل انتم منتهون . . . شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے چسکے میں تمہارے درمیان عداوت پیدا کر دے وہ تمہیں ذکر خدا کے بھلاوے میں ڈالتا ہے۔ تو کیا تم باز آجاؤ گے۔؟

عبادات کا مقصود اصلاح ناس بتایا گیا ہے چنانچہ جہاں نماز کی حکمت ارشاد ہوئی ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے۔ انّ الصلٰوۃ تنهی عن الفحشاء والمنکر نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ روزہ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے "لعلکم تتقون" تاکہ تم خدا ترس بن جاؤ۔ زکوٰۃ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔ خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزکیهم بها۔ آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجئے جس کے ذریعہ آپ ان کو پاک صاف کر دیں گے۔

حج کے بارے میں کہا گیا ہے لیشهدوا منافع لهم ویذکروا اسم اللہ علیٰ ما رزقهم من بهیمة الانعام ؕ یہ بھی احکام اوامر کے ساتھ وضاحت کر دی گئی ہے کہ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ؕ یعنی اللہ تمہارے آسانیاں ملحوظ رکھتا ہے نہ کہ سختیاں، قرآن ہی میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ ماجعل علیکم فی الدین من حرج یعنی تمہارے دین کے معاملہ میں کوئی دشواری پیش نہیں کی گئی ہے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے لاضرر ولاضرار رسالت مآب ہی کا یہ ارشاد بھی ہے بعثت بالحنیفة

السبحہ جب اسلام کی غایت و مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی اصلاح حال کی جائے اُن کے درمیان عدل قائم کیا جائے۔ ان کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں انہیں زحمت اور تکلیف سے دُور رکھا جائے۔ تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا۔ کہ اسلام ہی کی سیاست وہ سیاست ہے، جسے بلاشبہ سیاست عادلہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور وہ ہر سیاست پر حاوی ہے۔ وہ اپنے اصول و کلیات میں ہر اصول کی رعایت رکھتا ہے وہ اتنی لچک اور وسعت بھی رکھتا ہے کہ جس سے اصلاحی مقصد پورے طور پر حاصل ہو سکے۔ وہ حکومت و سیاست کی خرابی کی اصلاح، اور کسی حالت کے سدھار سے قاصر نہیں ہے۔

اسلامی قوانین کیوں نافذ نہیں ہوتے؟

بعض لوگ کہتے ہیں "جب اسلام سیاست عادلہ کا کفیل ہے، اور ہر اس نظام کو قبول کرتا ہے جو قوم اور ملت کے مصالح سے متصادم نہ ہو اور حکومت و سیاست کے کسی کام کے سدھار سے وہ قاصر نہیں ہے تو پھر کیا بات ہے کہ بعض اسلامی مملکتیں اسلام قانون کے بجائے دوسرے قوانین پر مجبور ہوئیں؟ کیوں نہ اسلامی قوانین کو انہوں نے اپنے نظم و ضبط اور تشریع قوانین کا مصدر و مخزن بنایا۔ یا دوسرے الفاظ میں اس سوال کو یوں سمجھئے کیا بات ہے کہ ہم دولت اسلامیہ مصر وغیرہ کو قوانین و عقوبات میں اور تحقیق جرائم، و تفتیش جنایات اور طرق مرافعات و نظم اجراءآت میں دوسرے قوانین (عصری) کا پابند دیکھتے ہیں۔؟

اب جواب سنئے:

یہ صورت حال اسلام کا قصور نہیں ہے، یہ قصور ہے مسلمانوں کا۔

اس لئے کہ اسلام نے اپنے احکام منصوبہ میں استنباط کے اصول وضع کر دیئے. جو مصالح انسانی کے لحاظ سے کامل اور اکمل ہیں اور جن پر عمل کرکے ہر اسلامی حکومت، دوسرے عصری قوانین سے بے نیاز ہو سکتی ہے۔ اگر مسلمانوں نے ان حقائق کو سمجھا ہوتا، اور ہر زمانہ میں وہ ایک ایسی جماعت تشریعیہ مرتب کرتے رہتے جو ان اہل علم پر مشتمل ہوتی، جو دین کے اصول پر بصیرت تامہ رکھتے ہوتے، امور دنیاوی سے پورے طور پر واقف ہوتے، لوگوں کی ضروریات مسائل، اور تغیرات احوال سے آشنا ہوتے اور وقائع مختلفہ کو سامنے رکھ کر استنباط مسائل و احکام کر سکتے ہوتے جو ایک طرف انسانی مصالح و مقتضیات سے موافق ہوتے، دوسری جانب اصول دین اور روح شریعت کے مطابق ہوتے، تو یہ صورت حال رونما نہ ہوتی. لیکن ہوا یہ کہ اہل علم تفریط میں مبتلا ہو گئے، یہ کام نااہلوں کے ہاتھ میں پڑ گیا. انہوں نے حقائق سے آنکھیں بند کر لیں. اجتہاد کے منکر ہو گئے، انہوں نے انسانی ضروریات کی "طوائف الملوکی" یا "انارکی" کا علاج سوچا تو یہ کہ اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا، اور اپنی ساری ذہانت و قابلیت سابق ائمہ مجتہدین کے اقوال متخالف میں تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں صرف کرنے لگے، اس کوتاہی فہم و علم کا جو نتیجہ ہوا وہ سامنے ہے، انہوں نے اسی پر قناعت کر لی. جو سامنے تھا اور تغیرات زمانہ اور مصالح انسانی اور مقتضائے مصلحت کے مطابق نظم قوانین سے بے پروا ہو گئے۔

دنیا کے مذاہب میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اجتہاد، تعقل، اور تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ لوگ آنکھ بند کرکے اس پر ایمان لے آئیں، بے چون وچرا اس کے ارشادات پر سر تسلیم

ختم کردیں۔ بغیر سمجھے بوجھے اس کا پیام قبول کرلیں۔ وہ قدم قدم پر اس کی دعوت دیتا ہے کہ سوچو، سمجھو، پرکھو، پھر مانو، ایسے مذہب کے پیرو اگر اجتہاد کا دروازہ بند کردیں، تفکر اور تعقل پر پہرہ لگادیں، تو یہ کتنے بڑے افسوس کا مقام ہے۔؛

اِسلامی حکومت کا آئین و دستور

اسلامی حکومت کے اصول اور دائرۂ کار!

قبل اس کے کہ ہم یہ بتائیں، اسلام نے نظام حکومت کے سلسلہ میں کون سی راہِ عمل اختیار کی ہے۔ ہمیں یہ معلوم کر لینا چاہئیے کہ ایک حکومت کے اجزائے ترکیبی کیا ہوتے ہیں؟ وہ کن اصولوں پر مبنی ہوتی ہے؟ اس کی بنیاد و اساس کیا ہوتی ہے؟ اور وہ کون سے اصول ہیں جو اسے استحکام و دوام عطا کرتے ہیں اور جن کی خلاف ورزی اسے تباہی اور ہلاکت، ادبار و زوال، اور پستی و انحطاط سے دوچار کر دیتی ہے؟ جب تک ہم یہ طے نہ کر لیں، آگے قدم بڑھانا بیکار ہے۔

ہر قوم کے لئے حسب ذیل تین امور، بنیادی حیثیت آئین و دستور کی سیاست میں رکھتے ہیں۔

(۱) حکومت کی وضع و شکل: اور وہ ستون جن پر وہ قائم ہے۔

(۲) حقوقِ افراد، اُمت کے حقوق۔

(۳) اختیارات، ان کا مصدر و منبع، اور یہ کہ ان کی قوت نافذہ و حاکمہ،

یہ اہم اور بنیادی اصول ہیں، ان سے متعلق اسلام نے، جو راہِ عمل متعین کی ہے، ہم ذیل میں اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں، اسی سلسلہ میں مباحث خلافت بھی زیر بحث آئیں گے جن سے اسلام کی دستوری سیاست کے اصول و حدود زیادہ واضح اور نمایاں ہو جائیں گے!

اسلامی حکومت اسکی وضع وہیئت اور بنیاد واساس

علمائے قانون کا اس
پر اتفاق ہے کہ قو
حاکمہ اور اُمت محکومہ کے درمیان جو اقتدار و اختیار کا علاقہ ہو وہ
ہو، تاکہ حاکم کے راب اور محکوم کی حریت میں ہم آہنگی رہے، ان تعلقا
کے اختلافات سے حکومت کی شکل و وضع بدل جاتی ہے۔ اور وہ یا
دستوری حکومت میں منتقل ہو جاتی ہے یا استبدادی حکومت کا رنگ
اختیار کر لیتی ہے۔

قرآن شوریٰ کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

جس شخص کی قرآن حکیم پر نظر ہے
جو احادیث رسول سے واقف
وہ خوب جانتا ہے کہ حکومت اسلامیہ دستوریہ، اور اس کے امور صرف
واحد سے انجام نہیں پاتے بلکہ ان کی سرانجامی امت کے ہاتھ میں ہے
کا ایک خاص گروہ جو "ارباب حل وعقد" کہلاتا ہے ان امور کو نپٹاتا
کیونکہ خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ "شوریٰ" (یعنی مشورۂ باہمی) کی
اور اس شوریٰ کو ایسا وصف قرار دیا ہے، جو قابل مدح ہے، شان اس
کا مظہر ہے، مقتضیات دین کا ایک اہم رکن ہے۔ چنانچہ سورہ شوریٰ
ارشاد ہوا ہے۔ والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوٰۃ وامرھم
شوریٰ بینھم ومما رزقنٰھم ینفقون ۝ صرف یہی نہیں خدائے بزرگ و برتر
رسول معصوم کو بھی شوریٰ کا حکم دیا ہے۔ فاعف عنھم واستغفر
وشاورھم فی الامر صرف اسی پر اکتفا نہیں ہوا، بلکہ خدا نے "اولوالامر
اطاعت بھی فرض قرار دی ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے، یاایھا الذین اٰمنوا
اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم نیز ارشاد ہوا ہے ولو

الی الرسول و الی اولی الامر منکم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم

ازروئے احادیث شوریٰ کی اہمیت

اس کے علاوہ متعدد اور اکثر مواقع پر احادیث میں بھی "شوریٰ" کی اہمیت واضح کی گئی ہے، اور اس کی طرف دعوت دی گئی ہے، جب تک رسول اکرمؐ اس دنیا میں تشریف فرما رہے آپؐ خود اس پر عمل کرتے رہے، آپؐ کے وصال کے بعد آپؐ کے جانشین یعنی خلفائے راشدین بھی "شوریٰ" کے اصول پر ہمیشہ قائم رہے، اسلامی نقطۂ نظر سے بھی اس کے اصولی اور بنیادی ہونے کا ثبوت ہے۔

حکومت کا حق کسے ہے؟

پختہ اور محکم دلائل سے یہ امر واضح طور پر ثابت ہے کہ حکومت اسلامیہ میں حکومت نہ "قریش" کا حق ہے نہ کسی دوسرے کا قرآن کریم اور سنت صحیحہ میں کہیں بھی یہ وارد نہیں ہوا ہے کہ رسول اللہ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد مسلمانوں کی زمام حکومت فلاں خاص جماعت یا گروہ کا حق یا حصہ ہے، جس طرح اس سلسلہ میں کوئی جماعت خاص نہیں کی گئی اس طرح افراد کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، اور ان کے لئے بھی کوئی خاص ہدایت نہیں کی گئی ہے، اس ترکِ تعیین کا مقصد و مقتضا جو کچھ تھا وہ یہی کہ حکومت کا معاملہ صرف اُمت کے ہاتھ میں رہے، اسے پورے طور پر اختیار ہو کہ جس کو چاہے چنے اور برسرِ اقتدار و اختیار کر دے۔

رسول اللہ نے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا،

چنانچہ رسول اللہ نے اپنا جانشین کسی کو نہیں بنایا، حالانکہ اس امر خاص میں وراثت چلتی ہوتی تو وہ ضرور کسی کو اپنا جانشین یا ولی عہد

بنا دیتے ۔

سرکار رسالتؐ کے اس جہان سے پردہ فرمانے کے بعد مسلمان جب سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے تو ان میں اس مسئلہ پر شدید اختلاف ہوا، کہ رسول کے بعد زمام کار کس کے ہاتھ میں سونپی جائے؟ انصار و مہاجر ہر دو جماعت کے دلائل و براہین علیحدہ علیحدہ تھے، اور ان سے یہی ثابت ہوتا تھا، کہ وہ کسی معین حد کے اندر جانشینی کے قائل نہیں ہیں، یہاں تک کہ سعد نے انصار بن عبادت کی بیعت پر لوگوں کو دعوت دی۔ بعض انصار نے مہاجرین سے کہا "ایک امیر ہم میں سے ہو ایک تم میں سے" ہو۔ پھر جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ دلیل پیش کی کہ "الائمۃ من قریش" یعنی امام تو قریش ہی سے ہونا چاہیئے۔ تو انہوں نے اپنی دلیل کو یہ کہکر معرض میں نہیں کیا کہ یہ نص ہے اور دین کی طرف سے ایک فریضہ ہے، انہوں نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ قریش ہی وہ جماعت تھی جو متخالف اور متحارب فریقین میں اپنے زور و قوت اور دبدبہ کی بناء پر مرکز کی حیثیت رکھتی تھی، چنانچہ اسی سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ "یہ بات کہ زمام حکومت قبیلہ اوس کے ہاتھ میں دی جائے قبیلہ خزرج کو مشتعل کر دیگی۔ اسی طرح اگر قبیلۂ خزرج کو زمام حکومت سونپی گئی۔ تو قبیلۂ اوس قابو سے باہر ہو جائے گا۔ اس وقت عربوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو گا کہ قبیلۂ قریش سے رجوع کریں۔"

قریش کی امامت نہ نص ہے نہ جزو دین

اگر قریش کی امامت نص ہوتی اور جزو دین ہوتی تو سقیفہ بنی ساعدہ میں جو انصار کرام اور مہاجرین عظام جمع تھے۔ وہ اس حقیقت اکبریٰ سے ناواقف نہ ہوتے اور حضرت ابوبکرؓ کو انہیں یہ یاد دلانے کی ضرورت نہ پیش آتی کہ "اوس

کے برسرِ اقتدار ہونے کی صورت میں خزرج اور خزرج کے برسرِ اقتدار ہونے کی صورت میں اوس آمادہ پیکار ہو جائیں گے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ جب یہ سوچ رہے تھے۔ کہ ان کے بعد ان کا جانشین کون ہو؟ یہ نہ فرماتے کہ "حذیفہ کا غلام سالم آج زندہ ہوتا، تو میں اسی کو سب کچھ سونپ دیتا۔" کھلی ہوئی بات ہے کہ حضرت عمرؓ ایک غلام کو کس طرح خلیفہ بنانے کا خیال ظاہر کر سکتے تھے، جب کہ "الائمۃ من قریش" سے وہ واقف تھے۔؟ حالاں کہ نصوص واردہ میں بار بار یہ فرمایا گیا ہے کہ فضیلت نسب کی نہیں عمل کی ہے۔ نیز بار بار عصبیتہ جاہلیت سے برأت ظاہر کی گئی ہے۔ اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ" ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

اربابِ حکومت اور اُمت

اربابِ حکومت اور افرادِ حکومت کے درمیان جو رابطہ و تعلق ہوتا ہے، وہ بڑی اہم حیثیت رکھتا ہے یہ رابطہ و تعلق اگر صحیح بنیادوں پر قائم رہے تو حکومت کی کامیابی غیر مشکوک ہے، اور اگر صحیح بنیادوں پر قائم نہیں ہے تو حکومت کی ساری عمارت زمین پر آ رہے گی۔ اس کا شمار ان حکومتوں میں ہوگا۔ جو صرف اس لئے بنتی ہیں کہ لوٹیں اور رسوائی کے ساتھ ختم ہو جائیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ بات وضاحت کے ساتھ سمجھ لی جائے کہ راعی اور رعایا کے درمیان کس طرح کا رابطہ ہونا چاہیئے۔؟

اسلام نے رجال حکومت کو امّت کے سامنے جوابدہ قرار دیا ہے بالنصوص سے یہ امر واضح ہے ولاۃ امر کو امّت سے ہدایت حاصل کرنے کی ضرورت بتائی گئی ہے، اور امّت کو ظالموں کا ہاتھ پکڑنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

مثلاً رسول اللہ کا ارشاد ہے ان اللہ یرضی بکم ثلاثا ویسخط ثلاثا یرضی لکم ان تعبدوہ وحدہ ولاتشرکوا بہ شیئا وان تعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولاتفرقوا وان تناصحوا من ولاہ اللہ امرکم.. یعنی اللہ تعالےٰ تم میں سے تین شخصوں سے خوش اور تین سے ناخوش ہوگا۔ راضی ان سے ہوگا جو صرف اسی ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں، اور اس کی خدائی میں کسی کو شریک نہیں کرتے، نیز ان سے جو خدا کی رسی کو مضبوط پکڑے اور پراگندہ نہیں ہونے دیتے، نیز ان سے جو اپنے حاکموں کو نصیحت کرتے ہیں، اسی طرح یہ بھی ارشاد نبوی ہے کہ ان الناس اذا راوا الظالم فلم یاخذوا علی یدیہ اوشک ان یعمھم اللہ بعقاب منہ یعنی لوگ اگر کسی ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں اور اسے اپنے دست بازو سے نہ روکیں تو اندیشہ ہے، کہ وہ عذاب خداوندی میں گرفتار ہوجائیں گے۔

خلفائے راشدین کا طرزِ عمل

یہ مسئولیت تھیں، "شوریٰ" کا اگر امت کو یہ حق نہ ہوتا۔ کہ وہ حاکم کی نگرانی کرے تو حاکم کو یہ حکم نہ دیا جاتا۔ کہ امت سے مشورہ کیا کرے۔

جہاں تک حضرات خلفائے راشدین کا تعلق ہے وہ امت کے اس حق کو تسلیم کرتے تھے، پہلے پہل جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے فرمایا

"میں تمہارا سر دھرا بنایا گیا ہوں، حالانکہ میں تم میں سب سے اچھا نہیں ہوں۔ اگر میں ٹھیک کام کروں، تو تم میری مدد کرو، اور اگر میں بُرائی کے راستہ پر چلوں، تو مجھے سیدھا کردو۔!"

حضرت عمرؓ جب مسند آرائے خلافت ہوئے تو انہوں نے فرمایا۔

"اگر تم میں سے کوئی مجھ میں کجی دیکھے تو اسے ٹھیک کر دے"۔
ایک اعرابی نے کہا،
"خدا کی قسم اگر ہم نے تم میں کجی دیکھی تو ہم اسے اپنی تلوار سے سیدھا کر دینگے"؛

غرض احادیث و اثار سے اس نظریہ کی تائید میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں "

اختیارات کا واحد سرچشمہ

ان آیات واحادیث اور آثار و امثلہ سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام میں نظام نیابی (وہ نظام جو نیابت پر مبنی ہو) واجب ہے کیونکہ حاکم (اعلیٰ) کا امت سے مشورہ لینا اور امت کا حاکم (اعلیٰ) کو اپنی نصیحتوں سے سرفراز کرنا، ممکن ہی نہیں ہے جب تک کہ عوام میں ایک خاص جماعت مرتب نہ ہو جس کا کام صرف باہمی مشورہ اور نصیحت ہو، جمہور امت کے لئے ان دونوں کا قیام لابد ولازمی ہے اور جب کہ حاکم اور محکوم پر مشورہ اور نصیحت واجب اور فرض ہے، تو یہ بھی فرض ہوا کہ خاص جماعت امت میں سے قائم ہو۔ جو یہی کام کرے، کیونکہ یہ اصول متفق علیہ ہے۔"ما لا یتم الواجب الا بہ فھو واجب"

ان حقائق سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اسلام میں حکومت کا اہم ترین ستون "شوریٰ" اور مسئولیت اولی الامر ہے؛

یہی وہ ستون ہیں جن پر ہر حکومت عادلہ کو اپنا نظام قائم رکھنا پڑتا ہے کیونکہ ہر عادل حکومت کا مرجع اور مصدر یہی ہوتا ہے۔ کہ آخری اختیارات امت کے ہاتھ ہو، اور تمام اختیارات کا واحد سرچشمہ وہی ہو!

اصول اور تفصیل دنیا میں اس وقت کہیں آمریت ہے، کہیں بادشاہت اور ملوکیت، کہیں جمہوریت کہیں عوامیت، روس آمریت کا شکار ہے، مشرق وسطیٰ کے متعدد ممالک میں ملوکیت اور بادشاہت شان و شکوہ، اور جاہ و تجمل کے ساتھ موجود ہے، متعدد مغربی ممالک میں جمہوریت، جلوہ فرما ہے، امریکہ کو اپنی عوامیت پر فخر ہے۔ ان تمام سیاسی اور حکومتی نظاموں کا مطالعہ کریں، ان میں سے کسی میں بھی، جمہوریت کے وہ اقدار اور عوامیت کے اصول نہیں ملیں گے جو اسلام میں نظر آئیں گے، ہر نظام قومیت ہی کو اختیار کا سرچشمہ قرار دیتا ہے، اور اس کو کچلتا اور روندتا ہے، لیکن اسلام حکومت اور امامت کے صحیح حدود مقرر کر کے اسے آگے بڑھاتا ہے۔

قومیت ہی کا تقاضا یہی تھا کہ یہ بنیادی اصول تو مقرر کر دیئے جاتے لیکن ان کی تفصیل نہ لی جاتی اور یہ تفصیل زمانہ، ماحول، حالات اور مقتضا پر چھوڑ دی جاتی، اسلام نے یہی کیا ہے۔

ملاحظہ فرمایئے۔ خدا نے "شوریٰ" کا حکم دیا ہے لیکن اس کی تفصیل کے بارے میں خاموش ہے تاکہ ہر امت کے ارباب کار، اپنے احوال و ماحول کی مناسبت سے اسے خود مرتب کر لیں، چنانچہ اس اصول کی رو سے انہیں حق ہے کہ وہ اپنے آدمیوں کے لئے ایک نظام انتخاب قائم کریں، اس کے شرائط لازمہ طے کریں کہ کون منتخب ہوگا، کس طرح منتخب ہوگا، انتخاب کی صورت اور نوعیت کیا ہوگی؟ وغیرہ وغیرہ۔

یہی حال نظام مسئولیت کا ہے، حاکم (اعلیٰ) امت کے سامنے مسئول اور جوابدہ ہے۔ لیکن اس مسئولیت کی تفصیل نہیں فرمائی گئی ہے، یہ تفصیل جو چھوڑ دی گئی ہے، یہ بھی اسی لئے کہ ہر امت خود اپنے حالات

ماحول کے مطابق اسے وضع کرلے!

ان حقائق کے پیش نظر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام نے حالات زمانہ کو پیش نظر نہیں رکھا ہے، یا تغیر احوال کو نظر انداز کر دیا ہے، یا اس نے نظام حکومت کا جو خاکہ پیش کیا ہے اس میں کوئی لچک نہیں رکھی ہے کیونکہ اسلام ہی وہ مذہب ہے کہ اس نے ایک ایسی بنیاد قائم کر دی ہے، جو عدل پر قائم ہے، جو ہر امت کے لئے یکساں چراغ ہدایت اور کفیل ضرورت ہے، انسانوں کے لئے اتنی وسعت اور لچک رکھی ہے کہ وہ اپنے مناسب احوال اس خاکہ میں رنگ بھریں، اور اسے مکمل کرلیں، اس بنیاد پر جو عمارت چاہیں بنا ڈالیں' اس اجمال سے ایسی تفصیل خود مدون کرلیں، جو ان کے مصالح کی کفیل اور احوال کے مناسب ہو،

اسلام کے نظام حکومت اور نظام "شوریٰ" میں جو اتنی لچک نظر آتی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام نفسیات، انسانی مصالح عامہ، اور ضروریات عوام سے نہ صرف پورے طور پر واقف ہے، بلکہ قدم قدم پر ان کی رعائت بھی رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نے کوئی اٹل نظام حکومت نہیں بنایا ہے. بلکہ اصول وضع کرکے تفصیلات امت کے لئے چھوڑ دی ہیں، اس لئے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں، اور ان بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ نظام حکومت میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ تفصیلات کے سلسلہ میں عوام کی سوجھ بوجھ پر اعتماد کیا جائے۔

پھر یہ انحطاط و تنزل کیوں؟

پھر وہ بھی دور آگیا جب مسلمانوں نے تنظیم "شوریٰ" کو ترک کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصل روح پامال ہوگئی۔ یہی حال مسئولیت کا بھی ہوا۔ والی اور حاکم اپنے

تیئں مطلق العنان اور خود مختار سمجھنے لگے، لوگوں کی زبانیں نصیحت سے گنگ ہوگئیں، لوگوں کے کان نصیحت سننے سے بہرے ہو گئے. بعیت کی اصل روح بھی فنا ہو گئی، اس کا اصل چہرہ مسخ ہوگیا، یہاں تک کہ وہ ایک ظاہری چیز بن کر رہ گئی جس میں نہ اُمت کے ارادہ کو دخل تھا، اور نہ جس کا کوئی خاص مقصد تھا.

جب یہ حالت ہوگئی تو مسلمانوں کی حکومتیں دستوری حکومت کی وضع و شکل سے بہت دور جا پڑیں، ظاہر ہے یہ اسلام کی خطا نہیں ہے، خود مسلمانوں کا قصور ہے۔

اسلام نے وہ سب کچھ دے دیا، جو دیا جا سکتا تھا، اور جس کے لینے کے بعد زندگی سنواری جا سکتی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے اپنی سیہ بختی سے نعمت کو ٹھکرا دیا، اور ایسا راستہ اختیار کر لیا، جو کسی طرح بھی اسلام کے اصولوں سے ہم آہنگ نہیں تھا، اس سے بڑھ کر بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے، کہ اسلام نے مسلمانوں کو جو کچھ دیا تھا اس سے انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا، اپنے اوپر جمود طاری کر لیا، اور پستی و انحطاط کے گڑھے میں گر گئے۔ ظاہر ہے اس کی ذمہ داری اگر عائد ہو سکتی ہے، تو خود مسلمانوں پر نہ کہ اسلام پر؛

افرادِ قوم کے حقوق کیا ہیں؟

جن بنیادوں پر نظم دستوری استوار ہے اس کی ایک اہم شق یہ ہے کہ افراد کے حقوق تسلیم کئے جائیں، اور مساوات باہمی کو مانا جائے، چنانچہ کسی دستوری حکومت میں بھی بنیادی قوانین کو دیکھ لیجئے ان میں حریت اور مساوات پر بڑی اچھی اچھی باتیں ملیں گی، اور ایسے احکام کی تشریح بھی ہوگی، جو حریت اور مساوات عام کو تسلیم کرتے ہوں، اور ان کی نگہبانی کرتے ہوں۔

اگر غور کیجئے تو جمیع حقوق انسانی دو چیزوں پر مبنی ہیں۔

(۱) حریت شخصی یعنی ذاتی آزادی ۔
(۲) مساوات بین الافراد یعنی افرادِ قوم کے مابین مکمل مساوات،
مساوات سے کیا مراد ہے؟ حقوق مدنی اور سیاسی میں بالکل یکسانیت مساوات، برابری، نہ کسی کے ساتھ رعایت نہ کسی پر ظلم،

ذاتی آزادی

حریت شخصی سے کیا مراد ہے؟ یہ کہ ہر شخص اپنے معاملات اور شخصی حالات میں بالکل آزاد ہو، نیز ان تمام امور میں بھی اسے آزادی حاصل ہو، جو اس کی ذات سے متعلق ہوں، غرض وہ اپنے نفس، اپنی آبرو، اپنے مال، اپنے مقام، اپنے تمام حقوق میں بالکل آزاد ہو، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ آزادی کسی دوسرے کی آزادی اور حقوق پر اثرانداز نہ ہوتی ہو۔

اس تعریف سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ حریت شخصی چند قسم کی "آزادیوں" سے عبارت ہے:۔

(۱) حریت ذات
(۲) حریت مادی (مقام)
(۳) حریت ملک ۔
(۴) حریت اعتقاد،
(۵) حریت رائے
(۶) حریت تعلیم

اگر یہ آزادیاں کسی شخص کو میسر ہیں، تو سمجھ لینا چاہیئے، وہ حریت شخصی سے بہرہ ور ہے،

آیئے اب دیکھیں اسلام نے ان آزادیوں کو برقرار رکھا ہے یا انہیں

چھین لیا ہے۔؟

حریت ذات اسلامی احکام کی رو سے حریت ذات مکمل طور پر تسلیم کی گ... ہے اور اسے ہر نا روا پابندی اور زیادتی سے محفوظ... گیا ہے، البتہ اسلام نے اپنے اوامر اور نواہی کے حدود ضرور مقرر کر دیئے... اور ان حدود سے تجاوز کرنے پر شرعی سزائیں بھی تجویز کر دی ہیں، بعض سزا... وہ ہیں۔ جن کی صاف صاف نوعیت، اور تفصیل و کیفیت بتا دی گئی ہے جن... ہم اصطلاح میں "حدود" کہتے ہیں، اور بعض سزائیں ہیں، جن کو حکام کی مرا... چھوڑ دیا گیا ہے ان کا اصطلاحی نام "تعزیرات" ہے اب سمجھ لینا چاہیئے کہ... وہی ہے جو حدود الٰہی سے متجاوز کر دیتا ہو، اور سزا بھی وہی ہے، جو شر... اسلامی کے موافق ہو۔

علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ عقوبات وہی جائز ہیں جو نص سے ... ہوں، نہ کہ رائے اور قیاس سے، چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

• ولا عدوان الا علی الظّٰلمین نیز فرمایا فمن اعتدٰی علیکم فاعتد... علیہ بمثل ما اعتدٰی علیکم اب غور کیجئے "نہی" تو یہ ہے کہ "عدوان" ظا... کے سوا کسی اور پر نہ ہو، اور "امر" یہ ہے کہ ظالم کو جو سزا دی جائے وہ اس... ایذا رسانی سے زیادہ نہ ہو، ان حقائق کی بناء پر ثابت ہوا کہ سزا شرع کے مطا... ہی دی جا سکتی ہے، اس میں رائے اور قیاس کو بالکل دخل نہیں ہے، اس سے... بڑھ کر آزادی شخصی اور حریت ذات کا تصور کیا ہو سکتا ہے۔!

جتنا جتنا بھی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا استقصا کیا جائے گا... معلوم ہوگا کہ ظلم اور ایذا دہی کی ممانعت کی گئی ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا ذ... اور حریت ذات اور امان انسانی کی تائید کی گئی ہے، اور اسے دوسروں...

تمدنی سے بغیر امتیاز دین و ملت محفوظ رکھنے کی سعی کی گئی ہے۔

حریتِ مسکن

احکامات اسلامی کی رو سے اس آزادی کو بھی قائم اور باقی رکھا گیا ہے، جلا وطنی کی سزا، یا سزا کے طور پر دور دراز مقامات پر مجرم کو بھیجنے کا عمل قرآن حکیم نے اس صورت میں جائز رکھا ہے کہ خدا اور رسول سے محاربہ کیا جا رہا ہو، یا خدا کی زمین پر فتنہ و فساد پھیلایا جا رہا ہو۔ خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے "انما جزاء الذین یحاربون اللّٰہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض ذلک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم" یعنی جو لوگ خدا اور رسول سے برسرِ پیکار ہوتے ہوں، یا زمین پر فساد پھیلاتے ہوں، ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ یا ان کے ہاتھ پاؤں جانب مخالف سے قطع کر دیئے جائیں، یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے، یہ ہے کہ ان کی رسوائی دنیا اور آخرت میں ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔"

قرآن کریم اور سنت رسول میں حریت مسکن پر بہت زور دیا گیا ہے خدا کا فرمان ہے "یا ایھا الذین امنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا وتسلموا علی اھلھا ذلکم خیر لکم لعلکم تذکرون، فان لم تجدوا فیھا احدا فلا تدخلوھا حتی یؤذن لکم وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا ھو ازکی لکم واللّٰہ بما تعملون علیم ہ" یعنی اے مسلمانو اپنے گھروں کے علاوہ کسی اور کے گھروں میں نہ داخل ہوا کرو، سوا اس صورت کے کہ تم ان لوگوں سے مانوس ہو جاؤ (پھر) داخل ہو کر ان پر سلامتی بھیجو تمہارے لئے بہتر ہے، اور گھر میں کوئی نہ ہو تو اس میں اس وقت تک نہ داخل ہو جب تک اجازت نہ حاصل کر لو، اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس

جاؤ تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اللہ تمہاری ہر بات جانتا ہے"!

اسی طرح رسول اکرم کا ارشاد ہے کہ "اذا اذن احدکم ثلاثا فلم یوذن لہ فلیرجع" اگر تم میں سے کوئی شخص تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اسے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ ملے تو اسے چاہیئے کہ واپس آ جائے۔

حریت ملکیت

اسلام نے حریت ملکیت کو بھی تسلیم کیا ہے، اور اس سلسلہ میں متعدد احکام نافذ فرمائے ہیں،

ایک تو یہ کہ ملکیت کے تصرف کو اسلام نے بالکل جائز رکھا ہے" اور اس سلسلہ میں بیع، اجارہ، اور قرض وعینہ کو بھی جائز رکھا ہے، لیکن ان امور کی صحت اور نفاذ کی بنیاد جو رکھی ہے وہ متصرف کی حریت اس کی رضامندی، اور اور اس کے اختیار کو قرار دیا ہے، چنانچہ مبادلات مالیہ کی صحت کا رکن اول جو ہے، وہ "تراضی" یعنی رضامندی ہے، اور اس کی اصل یہ فرمان خداوندی ہے کہ:۔

یا ایھا الذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون عن تراض منکم ؕ

یعنی اے مسلمانو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ اس کے کہ وہ مال تجارت ہو، اور باہمی رضامندی پر مبنی ہو"

اسی طرح قرآن وسنت میں متعدد مواقع پر دوسرے کے مال پر تعدی اور زبردستی کی نیز بغیر اجازت دوسرے کا مال حاصل کر لینے پر یا، بغیر کسی حق کے کسی کا مال ہتھیا لینے پر نہی وارد ہوئی ہے، چنانچہ قرآن میں آیا ہے۔

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل، وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون ؕ یعنی آپس میں ایک دوسرے

مال ناحق نہ کھاؤ اور حکام کے ہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ بطریق گناہ کے کھا جاؤ اور تم کو علم بھی نہ ہو،

اسی طرح یہ بھی قرآن کریم میں وارد ہوا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۔ جو لوگ یتیموں کا مال ظلم و جور سے کھاتے ہیں۔ وہ آگ کھاتے ہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ چور کے لئے جو سزا مقرر کی گئی اور غاصب کی تعزیر مقرر کی گئی ہے اس کی بنیاد بھی یہی حریت ملکیت ہے، اللہ تعالیٰ کہتا ہے، وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا یعنی چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی کے ہاتھ کاٹ دو" رسول اللہؐ کا ارشاد ہے لا يحل لاحد ان ياخذ متاع اخيه لاعبا ولا جادا فان اخذه فليرده عليه کسی شخص کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا مال ہتھیا لے اور اگر ایسا کرے تو اسے چاہیئے کہ واپس کر دے۔

حق ملکیت کا استقرار احکام اسلام میں حق ملکیت کی تائید و اعتراف کے سلسلہ میں رسول خدا کا یہ فرمان ہر اس شخص کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جو معاملات میں غبن کا عادی ہو اذا بايعت فقل لا خلابة ولى الخيار ثلاثة ايام یعنی جب کوئی چیز خریدو تو کہہ دو کہ دھوکے دھڑی کی سند نہیں، مجھے تین دن تک اس چیز کے رکھ لینے یا واپس کر دینے کا اختیار ہوگا۔ اسی طرح "بیع غرر" کی بھی نہی وارد ہوئی ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ شرط خیار کی تجویز میں اور بیع غرر کی ممانعت میں جو راز پوشیدہ ہے وہ یہی ہے کہ ملکیت کے تبادلہ میں سب سے پہلے مالک کی رضا حاصل ہو جائے اور مالک کے ہاتھ سے اس کی کوئی چیز اس حالت میں نہ نکل جائے، کہ اس کے دل میں یہ اندیشہ ہو کہ اس پر جبر کیا جا رہا ہے؛ بلکہ اگر حق شفع کے اسرار

غور سے پر نگاہ ڈالی جاتے تو معلوم ہو گا کہ اس میں بھی یہی مصلحت ہے کہ پڑوسی کا حق نہ مارا جائے یا شریک ملکیت کی حق کو شی نہ ہو؛

غرض اسلام ملکیت کا پورا پورا احترام کرتا ہے اور مالک کو وہاں تک ڈھیل دیتا ہے کہ اس کے مفاد کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ اور کوئی ایسا حکم نہیں دیتا جو مالک اور اس کی ملکیت پر اثر انداز ہوتا ہو"

فکر و عقیدہ کی آزادی

اسلام نے حریت اعتقاد کو بھی تسلیم کیا ہے، ہر فرد کو آزادی کامل عطا فرمائی کہ وہ اپنی عقل، نظر اور فکر و فہم کو بنیاد و اساس بنا کر جو عقیدہ چاہے اختیار کرے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے توحید اور ایمان کی بنیاد بحث و نظر رکھی ہے نہ کہ جور و جبر نہ کہ محاکاۃ اور تقلید!

قرآن کریم کی متعدد آیات میں لوگوں کو دعوت دی گئی ہے وہ زمین و آسمان پر اور خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں پر نظر ڈالیں۔ اس دعوت کا مقصد یہی ہے کہ وہ خود غور و فکر کے بعد، ایمان صحیح اور دین حق کی طرف رجوع کریں، مثلاً قرآن میں آیا ہے اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض وما خلق اللہ من شیٔ دوسری جگہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیات لقوم یعقلون۔ یعنی زمین و آسمان کی پیدائش میں رات اور دن کے اختلاف میں دریا کے اندر کشتی کی روانی میں جس سے لوگ نفع اندوز ہوتے ہیں اس بارش میں

جو اللہ تعالٰی برساتا ہے۔ جس سے مردہ پڑی ہوئی زمین پھر زندگی سے آشنا ہو جاتی ہے ہوا کے چلنے میں، آسمان اور زمین کے درمیان بادل کی تسخیر میں سمجھدار لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں،

متعدد آیات قرآنی میں ان لوگوں پہ لتاڑ کی گئی ہے جو بحث و نظر سے نہیں بلکہ صرف تقلید اور محاکاۃ سے ایمان لاتے ہیں۔

مثلاً قرآن میں وارد ہوا ہے" بل قالوا انا وجدنا اباءنا علی امۃ وانا علی اثارھم مھتدون" یعنی ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا ہے۔ اور ہم تو ان ہی کے راستہ پہ چلیں گے۔

بہت سی آیات قرآنی ایسی ہیں جن میں اکراہ و جبر کے ساتھ ایمان کی مذمت کی گئی ہے مثلاً لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی " دین کے معاملہ میں زبردستی جائز نہیں، اب ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا" افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین" کیا تم لوگوں کو مجبور کرنا چاہتے ہو، کہ وہ مسلمان ہو جائیں؟"

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ لکم دینکم ولی دین" تمہارے لئے تمہارا دین، میرے لئے میرا دین"

پھر جبکہ اسلام میں اعتقاد کی بنیاد غور و فکر اور آیات الٰہی پر فکر و تعمق ہے نہ کہ محاکاۃ، نہ کہ تقلید، نہ کہ جبر و جور تو اس سے بڑھ کر حریت اعتقاد اور کیا ہو سکتی ہے۔؟

قرآن کریم کی آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ داعی اور مبلغ کے لئے سب سے بڑا آلہ تذکیر اور "موعظہ حسنہ" کے سوا کچھ نہیں ہے، جتنا بھروسہ وہ اس آلہ پر کر سکتا ہے، کسی پر نہیں کر سکتا، خدا خود اپنے برگزیدہ رسول سے فرماتا ہے

فذكروا انما انت مذكر لست عليهم بمسيطر یعنی یاد دلاؤ تم یاد دلانے والے ہو، تم ان لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو،

مذکورہ حقائق سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو گئی کہ اسلام نے حریت فکر کو پورے طور پر تسلیم کیا ہے۔ اور اسلام کی یہ اتنی بڑی اور عظیم خصوصیت ہے جس کی مثال دنیائے انسانیت کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اسلام کسی معاملہ میں عام طور پر، اور دین و مذہب کے معاملہ میں خاص طور پر، کسی طرح کی تعدّی اور زیادتی برداشت نہیں کر سکتا، وہ ہر جرم معاف کر سکتا ہے لیکن جن جرائم کو اس کی بارگاہ سے پروانۂ عفو نہیں مل سکتا۔ ان میں ایک اکراہ دین کا معاملہ بھی ہے، کیا وجہ ہے کہ دنیا کے ہر مذہب کا دامن اس داغ سے آلودہ ہے لیکن مسلمانوں کے بدترین دور حکومت میں بھی اس کی مثال تلاش کرنا مشکل ہے۔

غیر مسلموں کی آزادی فکر وعقیدہ

اسلام نے جہاں مسلمانوں کیلئے اقامت شعائر کی حفاظت و صیانت کے سلسلہ میں پابندیاں عائد کی ہیں وہاں اس نے یہ بھی کیا ہے کہ غیر مسلموں کیلئے اس امر کی پوری آزادی تسلیم کر لی ہے کہ وہ اپنے شعائر قائم کریں، اپنے کنائس میں معابد میں، اپنی مذہبی ریت رسم پوری کریں، غیر مسلم کو اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اپنے معاملات اور احوال شخصی میں وہ اپنے دینی احکام کی پوری آزادی کے ساتھ پیروی کریں اس رواداری، اور اسلامی طرز عمل، اور حریت اعتقاد کی بنیاد، رسول اللہ کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے ذمیوں کے بارے میں فرمایا تھا۔ لهم مالنا وعليهم ما علينا یعنی ہم اگر راحت میں ہیں تو وہ بھی آرام اٹھائیں گے، ہم اگر دکھ میں ہیں تو

وہ بھی دکھ جھیلیں گے۔

جتنے عہدنامے غیر مسلموں سے کئے گئے، ان میں جہاں ان کی حریت ذات و مال تسلیم کی گئی، وہاں ان کے عقائد اور اقامت شعائر کی آزادی بھی مانی گئی۔"

حضرت عمرؓ کے زمانے میں، اہل ایلیا سے جو عہدنامہ کیا گیا، اس میں صاف صاف مرقوم تھا،

اہل ایلیا کو جان و مال کی آزادی دی جاتی ہے، اُن کے کنائس کی آزادی تسلیم کی جاتی ہے، ان کی ساری قوم کی آزادی کا وعدہ کیا جاتا ہے؛
اُن کے کنائس کو نہ توڑا پھوڑا جائے گا۔ نہ ان کے کنائس کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ نہ ان کو دین بدلنے پر مجبور کیا جائے گا۔ نہ ان میں سے کسی کو خواہ مخواہ تکلیف دی جائے گی۔ نہ ان کی صلیبوں اور دوسری مذہبی چیزوں کو برباد کیا جائے گا۔"

لہٰذا ثابت ہوا کہ عقیدہ کا جہاں تک تعلق ہے، اسلام عقل کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے کہ وہ نظر صحیح حد تک پہنچ سکے۔ اور پوری وسعت کے ساتھ یہ سہولت بہم پہنچاتا ہے کہ ہر شخص دین و عقیدہ میں غور کرے، سوچے، فکر سے کام لے، دلائل اور حقائق کی روشنی میں قدم آگے بڑھائے۔

رائے کی آزادی

حریت رائے کے معاملے میں اسلام نے وہ پہلو اختیار کیا جس میں حریت رائے مطلوب ہے، آیا وہ امر دینی ہے یا غیر دینی؛

اگر معاملہ غیر دینی ہے تو ہر فرد کو پوری آزادی حاصل ہے کہ
رائے مناسب سمجھے قائم کرے اور اسے جس طریقہ سے چاہے بروئے
لائے۔ تلاش و تفحص کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ عہد و اسلام میں اور
کے بعد بھی ایسے متعدد واقعات پیش آئے، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ
نے حریت رائے کا کس درجہ احترام کیا ہے۔ اور کہاں تک آزا
بخشی ہے۔؟

مثلاً، خود سرکارِ رسالتؐ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک غزوہ
نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں جگہ پہ اتریں، ایک صحابی
آپؐ سے سوال کیا، کیا یہ وہ منزل ہے جس کے بارے میں آپؐ کو ا
نے وحی بھیجی ہے یا صرف آپؐ کی رائے ہے؟ آپ نے فرمایا: "یہ میر
ذاتی رائے ہے"۔ صحابی نے عرض کیا "تو یہ منزل مناسب نہیں ہے
کے بجائے فلاں منزل مناسب ہو گی"! چنانچہ اسی رائے پر عمل کیا گیا۔
اسی طرح حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا اختلاف ہے، جو جنگی قیدیوں کے بارے
حضرت عمرؓ کی رائے تھی انہیں قتل کر دیا جائے حضرت ابوبکرؓ کہتے تھے فدیہ لیکر چھوڑ دیا
صحابہ کا اختلاف ہے جو خلافت اور دوسرے معاملات میں رونما ہوا۔

اگر معاملہ دینی ہے تو ہر شخص کو اجتہاد کا اذن عام ہے اسے حق ہے کہ را
ظاہر کرے جس کی طرف اس کا اعتقاد رہنمائی کر رہا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اجتہاد
سے متصادم نہ ہو، اور رائے اصول دین کے اصول سے متجاوز نہ ہو، اور ان قوا
و نصوص صحیحہ سے بھی مخالف نہ ہو جو ثابت ہیں۔

چنانچہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام نے قیاس کو اپنے اہم ترین اصو
میں سے ایک اہم رکن قرار دیا ہے، بلکہ غور کیجئے تو مصادر تشریع میں

ایک مصدر یہ بھی ہے، جو احکام منصوص نہ ہوں، ان سے استنباط کے لئے ایک
نظیر سے دوسری نظیر پیدا کر لینا، ایک واقعہ پر دوسرے واقعہ کو ڈھال لینا،
ایک مشابہت سے دوسری مشابہت نکالینا یہی اسلامی اصلاح میں
"قیاس" ہے۔ قیاس کے سلسلہ میں الحاق اور استنباط کے لئے اسلام نے بڑا وسیع
میدان کھلا چھوڑ دیا ہے اور رائے و نظر کو پوری پوری آزادی مرحمت فرما دی؛
سنت رسولؐ سے بھی ان حقائق کی تائید ہوتی ہے فرمایا:

ان کل مجتھد ما جور ان اخطأ فلہ اجر وان اصاب فلہ اجران۔

یعنی ہر مجتہد کو اجر ملتا ہے اگر اس نے اجتہاد میں چوک کی تو اسے ایک اجر ملیگا۔
اور اگر اس نے صحیح اجتہاد کیا تو اسے دو اجر ملیں گے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر اجتہاد کبھی کبھی غلط ہی کیوں نہ ہو لیکن
ہے باعث اجر۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام میں رائے اور قیاس کو کتنی
اہمیت دی گئی ہے۔

نصوص و آیات پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ تقلید کی سخت برائی کی گئی ہے۔
اور ان لوگوں کو خوب لتاڑا گیا ہے جو اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں،
اسے آزاد نہیں کرتے، اور تقلید کے بندھنوں میں گرفتار رہتے ہیں، یہی وجہ ہے
کہ مجتہدین کرام کی ایک بہت بڑی جماعت ہمیشہ یہ کہتی رہی اور باالفاظ صاف
و واضح کہتی رہی کہ ہم اجتہاد اس لئے نہیں کرتے کہ لوگ ہمارے مقلد بن جائیں؛
اسلام کے اصول میں اور نصوص میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو حریت کی
منافی ہو، لیکن انہی شرائط کے ماتحت جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں، اسلام کے اصول
سے حریت رائے کی کامل تائید و توثیق ہوتی ہے۔

۱؎ حضرت ابن عباس کا یہ قول کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے من قال فی القرآن

برایہ فلیتبوا مقعدہ من النار" یعنی جس نے قرآن میں اپنی رائے شامل کی اسے چاہیئے کہ اپنا گھر جہنم میں بنالے، یا حضرت ابوبکرؓ سے جو یہ قول مروی ہے کہ " ای السماء تظلنی و ای ارض تقلنی ان قلت فی کتاب اللہ برای" کون آسمان مجھے اپنے سایہ کے تلے رکھیگا، اور کون زمین مجھے پناہ دے گی، اگر میں کتاب اللہ میں اپنی رائے شامل کروں" تو اس سے مراد وہ رائے ہے جو "خود رائی" پر مبنی ہو اور جس میں مصلحت عامہ، اصول دین، روح اسلام اور قوانین دینی کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔

اور اب جو اسلام میں یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے، اور چند مخصوص ائمہ کرام کی تقلید واجب اور فرض سمجھی جاری ہے تو یہ اصول دین اور نصوص اسلامی کے قطعاً خلاف ہے، اصل بات یہ ہے کہ " اجتہاد کے" انارکزم" یا "طوائف الملوکی" کو روکنے کے لئے متاخرین نے دو نقصانات میں سے ہلکا نقصان برداشت کرنے اور دو برائیوں میں سے کمتر درجہ کی برائی قبول کر لینے کی روش پر عمل کیا تھا۔ اگر مسلمان صرف یہیں تک قائم رہتے، تو یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی۔ اور نہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوتا لیکن انہوں نے حزم و احتیاط کی روش پر چلنے کے بجائے یہ دروازہ ہی سرے سے بند کر دیا۔

حریتِ تعلیم

اسلام کی صاف اور واضح تعلیم یہ ہے کہ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان اور مسلمہ کا فرض ہے، اسلام نے " جاننے والوں" (عالموں) اور نہ جاننے والوں" (غیر عالموں) کا درجہ بھی یکساں ماننے سے انکار کر دیا ہے" علم" کے سلسلہ" میں اسلام نے علم کے انواع متعینہ و مختلفہ و متعددہ کی کوئی تصریح نہیں کی؛

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر وہ علم جس سے دینی یا دنیوی مصلحت پوری ہوتی ہو، بس وہی مطلوب ہے اور حق ہے کہ اس علم کو ذکور واناث کے درمیان شائع وضائع کیا جائے۔"

یہ بات اصول اسلام کے قطعاً خلاف ہے کہ اس کا دائرہ کسی "خاص" "علم" کے ساتھ محدود کر دیا جائے۔ یا وہ تعلیم کے راستہ میں روک بنکر کھڑا ہو جائے۔ بلکہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے بلاد و امصار کو مختلف علوم کا مرکز بنا رکھا تھا، اور اپنے علوم کی وسعت اور اپنے نظریات کی وسعت کے لئے اسلام کے طبقات علماء نے "غیر اسلامی" علوم سے بھی استفادہ کیا، اور انہیں بھی وسعت دی، چنانچہ ہر اہل علم جانتا ہے کہ ابن مقفع وغیرہ نے فارسی علوم کا عربی میں ترجمہ کیا، اسی طرح خلیفہ منصور، خلیفہ ہارون رشید، خلیفہ مامون رشید وغیرہ کے دربار میں یونانی علوم "معرب" بنائے گئے۔ چنانچہ بغداد، قرطبہ، اور ثمرقند کے تاریخی دور میں علم اور تعلیم کی جو وسعت اور کثرت ہم دیکھتے ہیں، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام نے حریت علم اور اشاعت تعلیم کو کس درجہ اہم مانا ہے،

ایسا ہونا تعجب خیز نہیں ہے۔ البتہ ایسا نہ ہونا تعجب خیز ہوتا، اسلام کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ اس کا پیش کیا ہوا ایمان "برہان" اور "حجت" اور "نظر" پر قائم ہے، وہ بار بار دعوت دیتا ہے کہ "ملکوت السموات والارض" کے براہین و دلائل پر غور کرو، انہیں دیکھو اور ان سے سمجھو یہ "نظر" نہیں پیدا ہو سکتی جب تک علوم مختلفہ پر نظر نہ ہو، اور بہت سے نظریات علم سامنے نہ ہوں؛ مسلمان بحث و گفت گو کی قوت میں کس طرح حریف کا مقابلہ کر سکتے تھے، اگر وہ انواع علوم و فنون سے بے خبر رہتے، جن کی ہر زمانہ میں مختلف

اندازسے ضرورت لاحق ہوتی ہے ؟

لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلام حریت علم کو تسلیم کرتا ہے، صرف
نہیں بلکہ اسے ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض گردانتا ہے۔

مساوات عامہ

مساوات! یہ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسلامی شعائر میں
سب سے اہم شعار ہے، اسلام کے نصوص و احکام بالکل وجہ اس کی تا
توثیق میں ہیں، اور اسے پورے طور پر تسلیم کرتے ہیں،

چنانچہ دیکھ لیجئے اسلام اپنے قانون کے اقتدار میں کسی فرد کو
نہیں ہونے دیتا۔ کسی قسم کی تفرقہ پسند نہیں کرتا، کسی طرح کا امتیاز
نہیں رکھتا۔ کوئی شخص خواہ کتنی ہی منزلت کیوں نہ رکھتا ہو، کیسے ہی بڑ
منصب پر فائز کیوں نہ ہو۔ اس کی شخصیت کتنی اعلیٰ وارفع کیوں نہ ہو
وہ قانون سے اونچا نہیں کیا جاسکتا۔ قانون اسلامی سے مستثنیٰ نہیں ہو
اسلامی قانون کے اثرات سے اپنے تئیں نہیں بچا سکتا۔ خواہ وہ
وقت کا امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کیوں نہ ہو، وہ والی اور گورنر کیوں
ہو، وہ حاکم اعلےٰ اور عامل کیوں نہ ہو، مگر وہ اور ایک عامی اسلام
قوانین مدنی وجنائی کی لپیٹ میں اور نفاذ حدود میں یکساں ہیں، ہرگز
کوئی فرق وامتیاز اسلام نے روا نہیں رکھا ہے، یہ نہیں ہے کہ کسی کے
خاص حکم ہو اور کسی کے لئے خاص، خواص کے لئے دوسرا قانون ہو اور
کے لئے دوسرا بلکہ ہے تو یہ کہ اسلام کے قانون میں سب برابر ہیں، اس
سب پر یکساں پڑتی ہے۔

اسی طرح حقوق کے تمتع میں، اسلام اپنے افراد کے لئے کوئی

حقوق ہرگز تسلیم نہیں کرتا، کہ چند خاص حقوق ہیں، جن سے بعض خاص لوگ تو بہرہ ور ہو سکتے ہیں اور باقی نہیں، وہ عمل کی بنیاد فضیلت قرار دیتا ہے، اور ہر عامل کے لئے راستہ کھلا چھوڑ دیتا ہے کہ جہاں تک جا سکتا ہے جائے، چنانچہ مسلمانوں کے مناصب میں معمولی عہدہ لے کر، بڑے سے بڑے منصب تک امت کا ہر فرد بآسانی پہنچ سکتا ہے، اس راستہ میں حسب نسب، ذات پات، قبیلہ اور خاندان، رنگ اور قوم، ملک اور وطن کوئی عصبیت حائل نہیں ہو سکتی۔

ارشاد رسولؐ ہے کہ لا فضل لعربی علی عجمی الا بالتقویٰ یعنی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے، البتہ تقویٰ ضرور مایہ الامتیاز ہے، یہ بھی ارشاد رسولؐ ہے، جو آپ نے بنی ہاشم کو مخاطب کرکے فرمایا تھا ــــــ یا بنی هاشم یجیٔنی الناس بالاعمال و یجیٔونی بالانساب ان اکرمکم عند الله اتقاکم ... اے بنی ہاشم! لوگ میرے پاس اپنے اعمال لے کر آتے ہیں اور تم حسب نسب لیکر آتے ہو، خدا کے نزدیک معزز وہی ہے جو متقی ہو"

متعدد نصوص میں مساوات پر زور دیا گیا ہے۔ اور واضح الفاظ میں اُسے تسلیم کیا گیا ہے۔ اور شعائر ایمان میں شمار کیا گیا ہے مثلاً ارشاد خداوندی ہے کہ "انما المؤمنون اخوۃ" یعنی مسلمان بھائی بھائی ہیں، یا رسول اللہ کا فرمان ہے کہ "اخوانکم خدمکم" تمہارے خادم تمہارے بھائی بھائی ہیں۔ یہ بھی ارشاد رسولؐ ہے کہ الناس سواء کاسنان المشط لا فضل لاحمر علی اسود ولا العربی علی عجمی ... لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں، گورے کو کالے پر عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔

غرض احکام اسلامی کا مطالعہ کیجئے۔ تو یہ بات ثابت ہو جائے
کہ ان میں مساوات کا پُورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور اُمت کے
مختلف طبقات کے مابین کسی طرح کا امتیاز روا نہیں رکھا گیا
حج میں ہر مسلمان (بلا تمیز و تفریق) مجبور ہے۔ کہ ایک لباس
پہنے، سر کھلا رکھے۔ اور سِلا ہوا لباس نہ پہنے۔

نماز میں ہر مسلمان، صف باندھے اور کاندھے سے کاندھا
مِلا کر کھڑا ہونے پر مجبور ہے۔ سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوں
گے۔ خواہ وہ فقیر بے نوا ہو، یا سلطان اورنگ نشین،

جنایات و جرائم میں، صاف قانون موجود ہے النفس بالنفس
والعین والعین والجروح قصاص ـــــ جان کے بدلے جان، آنکھ کے
بدلے آنکھ (نیز، خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے) ہر شخص کو پوری پوری
سزا دی جائے گی۔ ہر شخص سے پورا پورا بدلہ لیا جائے گا۔ خواہ
کوئی ہو، اس میں بھی کسی کے ساتھ رعائت ہے نہ کسی کے
تخصیص۔

اسلام کے احکام میں سب لوگ برابر قرار دیئے گئے ہیں۔ کوئی حکم
بھی ایسا نہیں ہے کہ جس میں کسی کے لئے تخصیص ہو، تمام قوانین میں
تمام افرادِ اُمت برابر ہیں۔

صدر اسلام میں، یہ مساوات، حالت جنگ اور حالت امن
حالت میں مسلمانوں کا عام شعار تھا، اس نعمت سے صرف مسلمان
بہرہ مند نہیں ہوئے تھے، بلکہ ذمّی اور معاہد بھی پوری طرح اس
نعمت سے فائدہ اُٹھاتے تھے ـــ "لھم مالنا وعلیھم ما علینا"

یہ بھی ارشادِ رسول ہی تھا کہ ـــــ "من اذی ذمیا فانا خصمہ یوم القیامۃ" جس نے کسی ذمی کو تکلیف پہنچائی تو قیامت کے دن میں اُس کا مدعی ہوں گا ـ"

اسلام کا امتیازِ خاص

دُنیا کا کوئی مذہب اسلام کا حریف نہیں بن سکتا۔ کسی مذہب نے اسلام کو فکر و عمل، اور اقدام و عقیدہ کی وہ آزادیاں نہیں دی ہیں جو اسلام نے مرحمت کی ہیں۔ ہر مذہب میں پابندیاں ہیں۔ جکڑ بندیاں ہیں۔ آنکھ بند کر کے احکام و ہدایات پر عمل کرنے کی تلقین ہے۔ پنڈتوں پر وہتوں، پادریوں اور راہبوں کے بغیر کوئی دینی کام سرانجام نہیں پا سکتا، لیکن اسلام؟ وہ اپنے ماننے والوں کو پوری آزادی غور و فکر اور اقدام و عمل کی دیتا ہے۔ وہ خُدا اور بندے کے درمیان کسی طرح کا رابطہ نہیں رکھتا۔ وہ عبد اور معبود کے درمیان براہِ راست ربط و تعلق قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دُوسرے مذاہب کے پرستار بہت جلد اپنے مذاہب سے اُکتا گئے۔ اور بغاوت پر مجبور ہو گئے۔ لیکن اسلام کے پرستار کبھی اور کسی حالت میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کہ اپنے دین سے بغاوت کریں۔ اس لئے کہ وُہ کیا چیز ہے جو انہیں اپنے دین میں حاصل نہیں۔؟ اور وُہ کون سی چیز ہے جو اپنے دین سے باہر وُہ پا لیں گے۔

اسلامی مملکت میں

اقتدار و اختیار کا سرچشمہ کون ہے؟

اقتدار و اختیار کی کشمکش

تاریخ کے صفحات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ اقتدار و اختیار کی کشمکش اتنی ہی قدیم ہے۔ جتنی یہ دُنیا۔ جتنے اس دنیا کے بسنے والے لوگ۔ مملکت جب بنتی ہے، اور حکومت جب عالم وجود میں آتی ہے، تو فوراً ہی دو گروہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

ایک گروہ تو وہ ہے، جسے عوام کہتے ہیں۔ یہی گروہ ملک کی اصلی آبادی ہوتا ہے۔ یہی ٹیکس دیتا ہے، محاصل ادا کرتا ہے۔ لگان حکومت کے خزانے میں داخل کرتا ہے۔ غرض حکومت کے جملہ مصارف اسی کی جیب سے ادا ہوتے ہیں۔ حکومت کی شان و شوکت، رُعب داب۔ جاہ و جلال، آن بان، ہر چیز رہین منت ہوتی ہے اس گروہ کی، یہ نہ ہو، تو نہ حکومت بن سکتی ہے، نہ اس کا خزانہ بھرپور رہ سکتا ہے۔ نہ اس کے شکوہ و تجمل کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دُوسرا گروہ خواص کا ہوتا ہے۔ یہ اپنی قابلیت، صلاحیت اور استعداد، نیز حکمت عملی، سیاست دانی اور جوڑ توڑ کے فن سے

غیر معمولی طور پر واقف ہونے کے باعث اقتدار و اختیار کی کرسی پر متمکن ہو جاتا ہے۔

شروع میں تو یہ صورتِ حالات بڑی معصوم معلوم ہوتی ہے۔ یعنی یہ تقسیم کار کی ایک صورت ہے۔ کچھ لوگ حکومت کرتے ہیں، باقی لوگوں پر حکومت کی جاتی ہے۔ بغیر اس کے نہ امن و امان قائم رہ سکتا ہے نہ ضبط و نظم کا قیام ممکن ہے، نہ صنعتی اور زرعی ترقی بروئے کار آ سکتی ہے، نہ سیاست خارجیہ میں استحکام پیدا ہو سکتا ہے۔ نہ مالی اور اقتصادی حالت درست ہو سکتی ہے۔ لیکن جب ان دونوں گروہوں میں کشمکش ہوتی ہے تو حالات دِگرگوں ہو جاتے ہیں۔ اور صورتِ حال اتنی نازک اور سنگین ہو جاتی ہے کہ دوست دوست کی گردن کاٹنے لگتا ہے، بھائی، بھائی کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ انسان درندہ بن جاتا ہے۔ اور خون کی ندیاں زور شور سے بہنے لگتی ہیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

یہ صورتِ حال اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ اقتدار و اختیار کا نشہ ان لوگوں کو متوالا بنا دیتا ہے جو برسرِ اقتدار ہوتے ہیں، وہ ان لوگوں کو اپنا غلام سمجھنے لگتے ہیں جن کا خون چوس کر وہ اس منصب بلند پر پہنچے تھے۔ گروہ عوام کے دلوں میں قدرتاً غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھتی ہے کیونکہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ سارا ٹھاٹھ باٹھ ہے ہمارے دم سے۔ لیکن ہم پر ظلم کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہی حقوق مارے جاتے ہیں، ہمارے ہی ساتھ ناانصافی کی جاتی ہے۔ ہم کو

کسی لائق نہیں سمجھا جاتا۔ بس یہی وہ خیال ہے جو آگ بن کر بھڑکتا ہے۔ اور امن و نظم کی کھیتی پر برقِ غضب بن کر گرتا ہے۔

علاج — مگر ناقص انسان نے اپنی فہم و خرد کے مطابق اس مرض کا مداوا مختلف طریقوں سے سوچا۔ مثلاً :۔

۱۔ بادشاہت۔
۲۔ جمہوریت اور عوامیت۔
۳۔ آمریت۔
۴۔ اشتراکیت اور اشتمالیت۔
۵۔ طبقانیت۔

ان میں سے ہر ایک کا دُنیا نے تجربہ کر لیا، لیکن کوئی بھی اس کے دُکھ کا مداوا ثابت نہ ہو سکا۔ اس نے بادشاہت کا تجربہ کیا۔ اور اپنے بادشاہ کو ظل اللہ، اوتار، مظہرِ ذات، خداوندی۔ یہ سب کچھ مان لیا۔ لیکن اس کے باوجود، بادشاہوں کے ہاتھوں نہ اس کی جان محفوظ رہی، نہ مال —— نہ آبرو! اس نے اپنا خون اور پسینہ ایک کر کے اُن بادشاہوں کو پالا پوسا، اور پروان چڑھایا، انہیں اختیار و اقتدار کا منتہٰی مرکز بنا دیا۔ لیکن ان بادشاہوں نے اُسے غربت، افلاس، تلوار اور کوڑے کے سوا کچھ نہ دیا۔

ایک اور تجربہ بادشاہت سے روگرداں ہونے کے بعد، دکھی انسانیت نے جمہوریت اور عوامیت کے دامن میں پناہ ڈھونڈھی، لیکن ۔ وہ یہاں بھی نہ ملی۔ جمہوریت کے تجربہ کو طریق

اِنتخاب نے ناکارہ بنا دیا۔ عوام کے نام پر، عوام کے گھروں پر جا کر عوام کے لئے یعنی انسانی فلاح وصلاح کا بیڑا اُٹھا کر جن لوگوں نے عوام سے ووٹ لئے اور عوام کی دی ہوئی کرسیوں پر متمکن ہوئے اُنہی نے عوام کا گلا کاٹا۔ عوام کی دولت لوٹی۔ عوام کو تباہی وبربادی کے گڑھے میں ڈھکیلا۔ اور بالآخر اُن کی تباہی وبربادی کے موجب ہوئے۔ پارٹی سسٹم نے جماعت بندی پیدا کر دی۔ جماعت بندی نے مفادات کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ انتخاب کے سلسلہ میں ووٹ کی تجارت اور کاروبار شروع ہوا۔ غریب رہ گیا۔ امیر ووٹ خرید کر حاکم اور مالک مختار بن گیا۔ بادشاہ منظر سے ہٹ گیا۔ لیکن اب بادشاہوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی۔ جس کی سفاکی، درندگی اور خون آشامی کسی طرح سابق بادشاہوں سے کم نہ تھی۔

عوامیت نے جمہوریت کی شکست وریخت کو، پیوندکاری سے اور انتخاب کی تبدیلی سے پارٹی سسٹم ختم کر دینے سے درست کرنے کی کوشش کی لیکن نتیجۃً وہ بھی، کوئی ٹھوس فائدہ عوام کو نہ پہنچا سکی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد دنیا، جمہوریت (ڈیموکریسی) اور عوامیت (ری پبلک) دونوں سے بیزار ہوگئی۔ اور اُمید کی نظر دُوسری طرف ڈالنے لگی۔

علاج یا مرض؟

اب دُنیا کے سامنے جو چیز نمودار ہوئی۔ وہ آمریت کی شکل میں اُبھری، لوگوں نے سوچا، وزیر، وزیر اعظم، صدر مملکت وغیرہ اتنے بادشاہوں کے بجائے۔ اگر ایک غیر مسئول بادشاہ ہو تو زیادہ غیر جانبداری کے ساتھ وہ عوام کی پاسبانی اور اُن کی

دکھ، درد کا علاج کر سکیگا۔ بادشاہت موروثی ہوتی تھی۔اس کی خرابی کی جڑ بھی وراثت تھی۔ بادشاہ اچھا ہوتا تھا۔اس کا بیٹا نالائق اور نااہل چونکہ بادشاہ کا بیٹا ہوتا تھا۔اس لئے نالائقی اور نااہلی کے باوجود بادشاہ بنا یا جاتا ہے۔ایسا ہُوا کہ بادشاہ حین حیات تک کے لئے ہو تو بادشاہت کے مفاسد ختم ہو جائیں گے۔اور مفادات حاصل ہو جائیں گے۔اس کی صورت یہ سمجھ میں آئی کہ آمریت کو فروغ دیا جائے۔ دنیا نے یہ تجربہ بھی کر لیا۔لیکن بہت جلد یہ تجربہ بھی ناکام ہو گیا۔آمریا ڈکٹیٹر کی حرص وہوس اقتدار واختیار کی بھوک، ظلم اور سفاکی۔ درندگی اور بہیمت ظلم اور ناالفافی نے سفاک اور خون آشام بادشاہوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔زار کے مظالم اسٹالین کے مقابلہ میں، قیصر کے مظالم، ہٹلر کے مقابلہ میں، ڈاکٹر سعانویل کے مظالم مسولینی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھتے ہیں؟ یا ان میں اور اُن میں وہی مناسبت نہیں ہے جو رائی کو پہاڑ کے مقابلہ میں، اور ذرہ کو آفتاب کے مقابلہ میں۔اور قطرہ ناچیز کو بحر بے پایاں کے مقابلہ میں حاصل ہوتی ہے؟

اسی دَور میں آمریت ہی کی ایک اور شاخ اشتراکیت اور اشتمالیت کے نام سے اُبھر چکی تھی۔شروع میں تو عوام نے فریب کھایا۔اور اس کے وہم ہام رنگ زمین کا شکار ہو گئے۔انہوں نے سوچا بادشاہت تو ہمارے درد کا مداوا نہ بن سکی۔جمہوریت اور عوامیت کی مٹی بھی طبقاتیت، جماعت بندی، اور طریق انتخاب نے پلید کر دی، آمریت نے بھی ثابت کر دیا کہ وہ بادشاہت سے زیادہ سنگین، ناقابل علاج اور مہلک ترین ہے۔یہ اشتراکیت اور اشتمالیت یقیناً ہمارے درد کا مداواں ثابت

ہوگی۔ اس لئے کہ اس میں نہ کوئی جاگیردار ہوگا، نہ سرمایہ دار یہ جاگیردار اور سرمایہ دار اپنے روپے سے کاشتکاروں اور مظلوموں کے ووٹ خرید لیتے تھے۔ اپنے روپے سے انہیں مناتے تھے۔ اپنے روپے سے ہر ظلم کو عین انصاف ثابت کر دیتے تھے۔ اب وہ اور ہم ایک صف میں آجائیں گے۔ وہ طبقہ ہی ختم ہو جائے گا۔ پھر ظلم کا سوال ہی نہیں پیدا ہوگا۔ ناانصافی کی شکایت ہی نہیں ہوگی۔ اس نظام کے ماتحت نہ کوئی غریب رہے گا نہ امیر۔ لہٰذا انسانیت کے دکھوں کا واحد اور آخری علاج یہ اور صرف یہ ہے۔ لیکن جب اس نظام کا تجربہ کیا گیا۔ اسے عمل کی کسوٹی پر کسا گیا۔ تو معلوم ہوا۔ یہ نظام آمریت اور قیصریت سے بھی زیادہ عوام کے لئے ایک مصیبت ہے قیصریت کے دور میں وہ فریاد تو کر سکتے تھے۔ آمریت کے دور میں وہ خوشحال تو تھے۔ لیکن اشتراکیت نے تو ان کی ہر چیز چھین لی ——— دولت بھی، آزادیٔ فکر و رائے بھی۔ آزادیٔ خیال و عقیدہ بھی۔ آزادیٔ اجتماع تقریر بھی، یہ ستم تو کسی نظام نے اب تک نہیں ڈھایا تھا۔ افسوس، یہ تجربہ بھی ناکام ہوا۔؟ ——— اب ہم کہاں جائیں۔ کدھر جائیں؟ کیا کریں یا کس سے اُمید لگائیں، ؟ کس سے مداوا چاہیں؟ کس سے اپنے زخم کا مرہم مانگیں؟

صحیح علاج اِسلام ہے

انسانیت کے ان مقاصد کا صحیح اور مکمل، اور تیر بہدف علاج صرف اسلام ہے۔ اسلام نے جو اصول حاکم اور محکوم کے لئے رائج کر دیئے ہیں۔ صرف وہی دکھی انسانیت کو تمام امراض سے نجات دلا سکتے ہیں۔ صرف انہی پر عمل کر کے، انسانیت ایک نئی زندگی سے بہرہ ور ہو سکتی ہے۔

اسلام کے اصولوں میں، اور دنیا کے مفکرین کے بنائے ہوئے اصولوں میں ایک اہم اور بنیادی فرق یہ ہے، کہ اسلام کے اصول، خدا کے بنائے ہوئے ہیں دوسرے نظام انسانوں نے بنائے ہیں۔ خدا کے بنائے ہوئے اصولوں میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی، اور انسان غلطی اور غلط روی کا پتلا ہے۔ وہ مرکب ہی خطا و نسیان سے ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ غلطی نہ کرے انسانیت کی فلاح کے اصول صرف خدا ہی بنا سکتا ہے۔ انسان نہیں، کیونکہ انسانیت خالق ہے۔ وہ انسان سے یا اس کے کسی گروہ سے یا کسی خصوص طبقہ سے کد نہیں رکھتا۔ اس کا مفاد کہیں نہیں ٹکراتا۔ اس کے مصالح میں کسی جگہ کشمکش نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف انسان طبقوں اور جماعتوں میں بٹا ہوا ہے، ان میں سے ہر طبقہ ایک دوسرے کا مخالف ہے۔ ان طبقات کے مفادات ایک دوسرے سے متصادم ہیں، ٹکراتے رہے ہیں اور ٹکراتے رہیں گے، ان کے مصالح میں کبھی ہم آہنگی نہیں پیدا ہو سکتی، کشمکش ہے اور رہیگی۔

اب آئیے ذرا اسلامی نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر غور کریں۔

شرعی حکومت موجودہ زمانہ میں دستوری حکومتوں کے اندر جس جماعت کو قانون سازی، اور اقتدار و اختیار کا مصدر مانا جاتا ہے۔ وہ مجالس نیابی (مجالس آئین ساز) کے ارکان و اعضا ہیں۔ یہی لوگ قوانین وضع کرتے ہیں، یہی ضرورت زمانہ اور مصالح عوام کے پیش نظر احکام و قوانین کی تشریع و استنباط کرتے ہیں، اور یہی ان احکام و قوانین کے نفاذ کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس دولت اسلامیہ میں اختیارات تشریعیہ جس جماعت

کو حاصل ہیں وہ مجتہدین کرام اور اہل تفقہ ہیں، لیکن ان کے اختیارات ووحدوں سے باہر نہیں جانے پاتے۔

(۱) یا تو کوئی ایسا مسئلہ ہے، جس کے بارے میں نص موجود ہے، اب اس گروہ کا کام یہ ہے کہ نص کو اچھی طرح سمجھے اور سمجھ کر وہ حکم نکالے جس پر نص دلالت کرتی ہو۔

(۲) یا کوئی ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں نص وارد نہیں ہوئی ہے۔ تو اس گروہ کا کام یہ ہے کہ اس سے ملتے جلتے منصوصات کو سامنے رکھ کر قیاس سے کام لے اور استنباط احکام و مسائل کرے اور اپنے اجتہادی حق سے فائدہ اٹھائے۔

خداوندی قانون

یہ اس لئے ہے کہ دولت اسلامیہ کا قانون اساسی خداوندی قانون ہے۔ جسے خدانے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ جسے خدا کے رسولؐ نے اپنے اقوال واعمال سے برتا ہے اس صورت میں جب کبھی بھی اور جس مسئلہ میں نص بھی مل جائے گی۔ اس کی پیروی بے چون وچرا فرض ہے۔ اور رجال تشریع بھی اس میں کچھ کانٹ چھانٹ نہ کر سکیں گے۔ البتہ انہیں اتنا حق ضرور ہے کہ نص سے جو حکم مراد ہو، اس کے ہر پہلو پر کتاب وسنت کی روشنی میں اچھی طرح سے غور کرلیں۔ یہاں تک کہ نص کی تطبیق بالکل صحیح ہو جائے اور نص نہ ملنے کی صورت میں رجال قضا کا حق ہے کہ اسلام کے قانون اساسی کے نصوص سے استنباط احکام کریں۔ اب وہ غیر منصوص احکام کی روشنی میں نئے احکام وضع کریں گے۔

اہل اجتہاد

لہٰذا کبھی زمانہ میں بھی کوئی اسلامی حکومت اہل اجتہاد کی جماعت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ وہ اہل اجتہاد جو کتاب و سنت پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ شرائط اجتہاد کے حامل ہوں، ان میں یہ قدرت پورے طور پر موجود ہو کہ خداوندی قانون اساسی کے نصوص سے مراجعت کر سکیں تطبیق دے سکیں، اور ان کی روشنی میں مسائل و احکام مستنبط کر سکیں؛

پہلی صدی ہجری گزر گئی، دولت اسلامیہ کا کوئی مدون قانون سوا قرآن حکیم کے نہیں تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور اور دولت امویہ کے ابتدائی زمانہ میں جب رجوع کیا جاتا تھا، تو قرآن کی طرف یا حفاظ سنت (محدثین کرام) کی طرف اب اگر اہل فتیا ——— صحابہ تابعین اور تبع تابعین ——— نص پا لیتے تھے تو اس کی پیروی کرتے تھے اور اجتہاد و رائے سے بالکل کام نہیں لیتے تھے۔ ان کے افکار اجتہاد مدون نہیں کئے جاتے تھے، نہ انہیں قانون و شرع کا درجہ دیا جاتا تھا۔ سوا اس صورت کے ان کا مرجع و مصدر قرآن و سنت ہو،

تدوین احکام و قضایا

لیکن جب اسلامی فتوحات کے دائرہ میں وسعت پیدا ہوئی اور اسلام دُور دراز مقامات میں پھیل گیا اور حفاظ و رواۃ شریعت ——— تہذیب و تمدن، حضارت، عمرانیت قضایا کے تجدد اور تنوع، حوادث کی کثرت اور اختلاف معاملات و احوال کے پھیلاؤ اور وسعت ——— کے مختلف اور متعدد گوشوں میں پہنچے، تو اندیشہ پیدا ہوا کہ احکام شریعت میں پراگندگی اور انتشار نہ پیدا

ہو جائے۔ کہیں تشریعی انارکزم نہ پیدا ہو جاتے، اس اندیشہ اور خطرہ کو روکنے کے لئے دو صورتیں عمل میں لائی گئیں۔

(۱) تدوین حدیث، تاکہ جو احکام از روئے حدیث ثابت ہوتے ہیں، انہیں مرتب و مدوّن کر لیا جائے۔

(۲) تدوین مجتہدات —— مجتہدین کرام نے جو اجتہادات کئے تھے ان کی تدوین، نیز ان اصولوں کی تدوین جن کے ماتحت انہوں نے تفریع مسائل اور استنباط احکام کا کام کیا تھا۔

پہلا کام —— تدوین حدیث —— خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے کہنے سے امام زہری نے اپنے ذمہ لیا، جو حدیثیں ان تک پہنچی تھیں، انہیں مدون کیا۔ یہ حدیثیں آخری صدی ہجری میں بلاد و امصار میں پھیل گئیں۔

دوسرا کام —— تدوین مجتہدات —— حضرات مجتہدین کرام نے کیا۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد د حنبل، نیز امام داؤد حضرت زید بن علی، حضرت امام جعفر صادق وغیرہ نے ان اہم امور کو سرانجام دیا۔

یہیں سے وہ دَور شروع ہوتا ہے کہ جب رجال تشریع معاملات زیر بحث میں کتاب و سنت اور اجتہادات ائمہ سے رجوع کرنے لگے۔

رجال تشریع اور مجتہدات ائمہ

مجتہدات ائمہ کی طرف رجوع کرنے کا مقصد کیا تھا۔ ؟ یہ کہ کتاب و سنت کے نصوص سمجھنے میں مدد ملے۔ اور استنباط مسائل میں آسانی ہو۔ ان مجتہدات کو حاصل دین اور قانون اساسی کا درجہ ہرگز حاصل نہیں تھا۔ مجتہدات سے مجتہدین کرام کی غرض صرف یہ تھی کہ اہل لوگ استنباط مسائل

احکام کرنا چاہئیں، ان کے لئے ایک روشن راستہ مقرر کر دیا جائے۔ اور جو اس کے اہل نہ ہوں، اُن کے لئے وہ راستہ بند کر دیا جائے۔

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مجتہدین کرام کی غرض و غائت مجتہدات سے یہ تھی۔ کہ اپنے بعد آنے والے رجال تشریع کے لئے تشریع کے اصول و ضوابط مقرر کر دیئے جائیں اور جو لوگ وسائل اجتہاد سے محروم ہوں، ان کے لئے مجتہدات تیار کر دیئے جائیں۔ کہ وہ احکام اور اوامر کو پہچان سکیں اور غلطی سے مبرا ہو جائیں۔

ائمہ کرام میں سے کسی کے ذہن و دماغ میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ اُمت اُن کے اجتہادی آرا کو حرف آخر اور فیصلۂ دائم کی حیثیت دے دے۔ نہ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ ان کے مجتہدات کی تدوین ارباب علم اور اسلام قانون اساسی کے نصوص کی طرف رجوع کرنے میں حائل ہو جائے اور بعد کے ارباب علم و فضل وہی سمجھیں۔ جو پہلے کے مجتہد سمجھ گئے ہیں اور وہی کہیں جو وہ کہہ گئے ہیں، اور وہی مستنبط کریں جو وہ کر چکے ہیں۔

اگر یہ صورت ہوتی کہ یہی مجتہدات آخری ہوتے تو اجتہاد حرام ہوتا کتاب و سنت کی طرف رجوع ناجائز ہوتا، متقدمین مجتہدین کے آرا اجتہاد ناطق اور دائم ہوتے تو یہ تشریع اسلامی کی بڑی کوتاہی اور اصول اسلامی کا بہت بڑا نقص ہوتا، یہ بات مصالح عوام اور اقتضاء زمانہ کے بالکل خلاف ہوتی۔ اسی جمود کا یہ نتیجہ ہوا کہ بعض اسلامی حکومتیں اسلامی قوانین چھوڑ کر غیر مسلم اقوام کے قوانین پر عمل کرنے لگیں۔

خدا کا قانون اساسی

پہلی بات یہ ہے کہ اسلام میں سلطنت شرعیہ خدا کے بنائے ہوئے قانون اساسی پر مبنی ہے،

اور اس کام کے لئے جن رجال کا انتخاب کیا ہے ان کے لئے شرط رکھی ہے کہ وہ شرائط اجتہاد پر پورے اترتے ہوں۔

ضروری ہے کہ ان کے اجتہادات کو حکومت اسلامیہ تسلیم کرے، اور اُن کے فیصلوں کو نافذ کرے۔ اسلام کا قانون، دنیا کی ہر دستوری حکومت کے ضابطہ میں مکمل ہے، اور ہر دور اور ہر زمانہ میں امت کی تمام ضروریات و حاجات کا کفیل ہے۔

پھر جب تشریع کا کام رُک گیا، اور اجتہاد کا بارگراں ایسے لوگوں نے اپنے دوش ناتواں پر اٹھا لیا۔ جو ہرگز اس کے اہل نہ تھے۔ اور اس بات کی تعین اس تشریع طوائف الملوکی کے زمانہ میں مشکل ہوگئی۔ کہ کون لوگ تشریعات کے اہل ہیں، علماء کے اجتماع اور تبادلۂ آراء کا سلسلہ بھی بند ہوگیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ افکار و آراء میں انتشار پیدا ہوگیا۔ کسی بھی اسلامی حکومت کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے آراء کی طرف توجہ کرے۔ اور ان پر عمل پیرا ہو، اس لئے کہ ان حضرات کو باہمی جنگ و جدال اور قیل و قال سے اتنی فرصت کب تھی کہ وقت کے اہم ترین مسائل کی طرف رجوع کرکے عوام کی صحیح رہنمائی کرتے؟

پھر علماء نے جب یہ دیکھا کہ یہ تشریعی طوائف الملوکی کسی حد پر رکتی ہی نہیں، تو انہیں فکر ہوئی کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے؟ حکمت اور دُور اندیشی کا تقاضا یہ تھا۔ کہ ایک نظام قائم کیا جاتا۔ جو ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتا، جو سلطنت شرعیہ کے سزاوار ہوتے۔ اور یہ نظام تشریع اور تشریعی طوائف الملوکی کے درمیان حد فاصل بن جاتا۔ لیکن اس کے بجائے تدارک کیا تو کس طرح؟ اجتہاد کا دروازہ ہی بند کر دیا۔

یہ ہوا کہ تشریع اپنی جگہ پر رُک گئی۔ اور پہلے سے بھی زیادہ غلط اور تکلیف دہ صورت پیدا ہو گئی۔ اس صورت نے بہت ہی عجیب انتشار پیدا کر دیا۔ ظاہر ہے، مصالح بدلتے رہے، حالات میں تنوع اور تجدد ہوتا رہا، مگر تشریع اسلامی اپنی جگہ پر رُکی کھڑی رہی، تشریع اسلامی اس جگہ پر آکر رُک گئی۔ جہاں اسے دوسری صدی ہجری میں ائمہ کرام نے اپنے زمانے کے حالات و حاجات، اپنے بلاد کے اقتضا اور ضرورت کے مطابق پہنچایا تھا۔ یہ اتنی بڑی کوتاہی تھی، جس کے اثرات بد آج تک ملت اسلامیہ کو بھگتنا پڑ رہے ہیں

فردی یا اجتماعی؟

تصریحات بالا سے یہ بات ثابت ہو گئی، کہ اگر اجتہاد فردی کا دروازہ کھل جائے، تو وہ تشریع اسلامی کے لئے ایک مستقل "شر" ہو گا۔ کیونکہ آراء کا اختلاف بڑھ جائے گا۔ اسی طرح اگر اجتہاد کا دروازہ بند رہے تو وہ بھی ایک شر ہی ہو گا۔ کیونکہ وہ تشریع کی حرکت کو روک دے گا۔ اور قانون اسلامی کو مصالح عوام سے بے نیاز کر دے گا۔ ان دونوں میں قطع نظر کر کے بہترین اجتہاد اجتماعی ہے۔ اور یہی وہ راستہ ہے جس پر صحابہ کرام گام فرسا تھے، حضرات تابعین اور تبع تابعین بھی اسی راہ کے رہرو تھے۔ حضرت ابو بکرؓ جب کسی مسئلہ کو کتاب و سنت میں نہیں پاتے تھے، تو اکابر صحابہ کو جمع کرتے تھے، ان سے مشورہ کرتے تھے۔ اور جب کسی رائے پر اجتماع ہو جاتا تھا، تو اسی کو نافذ کر دیتے تھے۔ یہی حضرت عمرؓ کا بھی دستور تھا۔

اندلس کی دولت امویہ کے دور میں قرطبہ کے اندر ایک "مشورہ گھر"

بنا لیا گیا تھا۔ جس کے ارکان میں بڑے بڑے علماء تھے۔ جن کا کام یہ
تھا کہ معاملات قضا و افتا میں اپنے مشوروں سے مستفید کریں، چنانچہ
اندلس کے حالات و سوانح میں اکثر ہم یہ جو دیکھتے ہیں کہ فلاں "عالم تشاور"
تھا، یا فلاں کو مشورہ کے لئے بلایا گیا۔ لیکن اس نے آنے سے انکار
دیا تو یہی وہ شوریٰ ہے کہ جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا، قرطبی نے ذکر کیا
ہے کہ اس مجلس شوریٰ نے امام مالک کے اخذ کردہ متعدد مسائل و
احکام سے اختلاف کیا، اور ان کے بجائے ابوالقاسم کے قول یا رائے پر
عمل کیا۔

جمعیۃ المجلہ! تیرھویں صدی ہجری کے آخر میں دولت عثمانیہ ترکیہ نے اس طرف توجہ کی اور تشریع اسلامی
کی حرکت میں جو وقوف پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا تدارک کرنے کے لئے
علمائے اُمت و فقہائے امت کی ایک جماعت قائم کی جس کا نام
"جمعیۃ المجلہ" تھا، کتب حنفیہ کے بعض انتخابات بھی "مجلۃ الاحکام"
کے نام سے مرتب کئے گئے تھے۔ اس کام کا آغاز کوتاہیوں سے خالی
نہیں تھا۔ لیکن اگر زمانہ نے مہلت دی ہوتی اور یہ چیز قائم رہ جاتی تو
تشریع اسلامی ایک مرتبہ پھر، مصالح عوام اور اقتضائے زمانہ کے
مطابق ہو جاتی!

اختیارات قضا اور رجال قضا اسلام میں اختیارات قضا جن لوگوں کو حاصل ہیں وہ "رجال قضا" کہلاتے
ہیں۔ آج کل کے زمانہ میں دستوری حکومتوں کا ایک اصول یہ بھی ہے
کہ ان کے رجال قضا، رجال آئین و قانون سے الگ ہوتے ہیں،

انتظامیہ اور عدلیہ کے ہر شعبے الگ الگ ہوتے ہیں، رجال قضا سے مراد انتظامیہ اور رجال آئین و قانون سے مراد عدلیہ ہے۔

لیکن صدر اسلام میں اختیارات تشریعی و قضائی ایک ہی ہاتھ میں ہوتے تھے۔ کیونکہ خلیفہ کے ہاتھ میں زمام ہوتی تھی، اور وہ اختیارات تشریعی و قضائی کا حامل ہوتا تھا، اگر وہ کوئی نص دیکھ لیتا تھا تو وہ اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتا تھا، اور اگر نص نہیں پاتا تھا، تو صحابہ میں سے فقہا اور مفتیوں سے مشورہ لیتا تھا، اور جب ایک رائے قائم ہو جاتی تھی، تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتا تھا، اس زمانہ میں رجال قضا وہ لوگ ہوتے تھے۔ جو پایۂ اجتہاد رکھتے تھے۔ انہی کو تشریعی اختیارات ہوتے تھے۔ ان کا قانون کتاب اللہ اور سنت صحیحۂ رسول تھی، یا وہ رائے جس پر تشریعی نے اجماع کر لیا ہو"

حضرت ابوبکرؓ کا طریق عمل

بغوی نے میمون بن مہران سے تخریج کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ جب کسی مسئلہ کا فیصلہ کرتے تھے تو سب سے پہلے کتاب اللہ میں اس کے احکام تلاش کرتے تھے۔ اگر نص مل گئی تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ اگر کتاب و سنت سے کوئی نظیر نہیں ملی تو وہ باہر آتے تھے۔ اور مسلمانوں سے کہتے تھے، میرے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے، کیا تم جانتے ہو کہ اس یا ایسے کسی مسئلہ میں رسول اللہ نے کچھ فیصلہ فرمایا ہے۔؟ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ لوگ رسول اللہ کے قضایا کا ذکر کرتے تھے۔ تو حضرت ابوبکرؓ فرماتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو اپنے نبیؐ کی باتیں یاد رکھتے تھے۔ اگر اس اجتماع میں بھی سنت رسولؐ کی طرف ہدایت نہیں

ملتی تھی تو اکابر و اعاظم صحابہ کو مجتمع کرتے تھے۔ اور ان سے مشورہ کرتے تھے۔ پھر اگر کسی رائے پر اجتماع ہو گیا۔ تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔

حضرت عمرؓ کا طرزِ کار

یہی اصول حضرت عمرؓ کا بھی تھا۔ وہ دیکھتے تھے کہ اگر کسی مسئلہ کا حل کتاب سنت سے نہیں نکلتا تو کیا حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں اس کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے؟ اگر معلوم ہو گیا کہ حضرت ابو بکرؓ نے اس معاملہ میں یہ فیصلہ کیا تھا، تو اسی کو نافذ کر دیتے تھے، ورنہ وہ بھی رؤس المسلمین جمع کرتے اور وہ اجماع رائے سے جو فیصلہ کر دیتے تھے اسی کو نافذ کر دیتے تھے۔ سب سے پہلے اختیارات قضائیہ پر ایک شخص وا حضرت عمرؓ نے مامور فرمایا تھا۔

حضرت عمرؓ نے ابو درداء کو مدینہ کی قضا، شریح کو بصرہ کی قضا ابو موسیٰ اشعری کو کوفہ کی قضا سونپی تھی۔ یہ سب حضرات اختیارات قضا، و تشریع کے حامل تھے۔ اس کا ثبوت ان تقرر کے پروانوں سے ملتا ہے۔ جو حضرت عمرؓ نے قضاۃ کو مرحمت فرمائے تھے۔ انہوں نے ابو موسیٰ اشعری کے رسالہ میں لکھا تھا: "الفهم فیما ورد علیك مما فیه نص، فی کتاب ولا سنته —" یعنی اگر تمہارے سامنے کوئی مسئلہ درپیش ہو، جس کا حل کتاب و سنت میں نہ ملتا ہو، تو سمجھ سے کام

جب ائمہ مجتہدین نے اپنے اجتہادات مدون فرمائے، اور قضا ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ تو قضاۃ کا کام یہ رہ گیا۔ کہ مجتہدین اور مفتیین کی اندھا دھند پیروی کرنے لگے۔ اور اپنی را

کو بیٹھے۔

امور بالا سے ثابت ہوتا ہے، کہ حکومت اسلامیہ میں قضا کی دو صورتیں تھیں۔

(۱) قضاۃ کا مرجع قانون اسلامی تھا۔ اور انہیں اختیارات قضائیہ کے ساتھ اختیارات تشریعی بھی حاصل تھے۔

(۲) قضاۃ کا مرجع صرف ائمہ کرام کے مجتہدات تھے، اور وہ تقلید کے سوا فکر و نظر سے بالکل کام نہیں لیتے تھے۔

قضاۃ کا تقرر

قضاۃ کا تقرر خلیفہ کا حق تھا کبھی وہ اپنے حق کو خود استعمال کرتا تھا، اور رجال قضا کو مقرر کر دیا کرتا تھا۔ اور کبھی یہ اختیار امصار و بلاد کے گورنروں (والیوں) کو دے دیا کرتا تھا۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے جب اشتر نخعی کو مصر کا گورنر مقرر کیا تو فرمایا — ثم اختر للحکم بین الناس افضل رعیتک فی نفسک یعنی آدمیوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لئے اس شخص کو مامور کرو جو، تمہارے نزدیک بہترین ہو۔

لیکن قضا کے تقرر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خلیفہ بے اختیار ہو گیا۔ اسے پھر بھی حق ہوتا ہے کہ وہ جن خصومات کے فیصلہ کو چاہے۔ دیکھے، پرکھے، جانچے، اس لئے کہ تمام اختیارات قضائیہ و تشریعیہ اس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اور یہ قضاۃ تو گویا اس کی نیابت کرتے ہیں، اور نیابت سے اصل حق سوخت نہیں ہوتا۔

اب ضرورت اس کی تھی کہ حکومت اسلامیہ میں قضاۃ کے لئے ایک

قانون مفصل رجوع اور حوالہ کے لئے موجود ہوتا، و ورِ اوّل میں تو اُن کا
مرجع وہ ذاتی اجتہادات تھے، جو اصول اجتہاد پر مبنی تھے۔ اور جن پر
تمام مجتہدین و مفتیین عمل پیرا تھے۔ اور دورِ ثانی میں دوسروں کے مجتہدات
پر تکیہ تھا۔ اور صرف انہی کی تقلید تھی۔ اس لئے احکام میں اضطراب پیدا
ہوا۔ اور قضاۃ کسی ایک قانون کے پابند نہیں رہ گئے کبھی ایک شہر
اور بعض مختلف ممالک اسلامی میں احکام ایک دوسرے کے مخالف
اور ضد ہونے لگے۔ اس سے افراتفری بڑھ گئی۔

اب یہاں سے وہ فرق ظاہر ہو گیا، جو عہد حاضر کی حکومات کے
رجال قضائیہ کے اختیارات میں اور حکومت اسلامیہ کے رجال قضائیہ کے
اختیارات میں ہے حکومت میں قضاۃ کے اختصاص کی اس طرح صر
نہیں ہے کہ ارباب اختیارات و تنفیذ اس میں دخل نہ دے سکیں، یا ان کے
اختصاص پر تعدی اور تصرف نہ کر سکیں، غرض ان کے حق میں کوئی دو
طاقت مداخلت نہیں کر سکتی، اسی طرح کوئی ایسا نظام بھی نہیں بنایا گیا
جو قضاۃ کا تعلق تنفیذ کے ارباب اختیار سے واضح کرتا ہو، احکام کی تنفیذ
تو والیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اگر وہ فیصلہ قضاۃ سے راضی ہوئے تو اسے
کر دیا۔ اسے ناپسند کیا تو لغو و معطل کر دیا۔

تعدی اور تصرف سے نجات

لیکن عہد حاضر میں یہ صورت نہیں
قضاۃ کے اختصاص کو قانون
واضح کر دیا گیا ہے، اور اس کے بعد اُن کے اختصاص اور حق پر تعد
اور تصرف کوئی امکان نہیں رہ گیا ہے، اسی طرح قضاۃ اور ارباب
کا علاقہ بھی واضح کر دیا گیا ہے، ارباب تنفیذ کا فرض ہے کہ وہ قضا

احکام اور فیصلوں کو نافذ کریں۔

اختیاراتِ تنفیذ!

ارباب تنفیذ کون ہیں؟ بلاد و امصار کے والی، فوجوں کے سپہ سالار عاصل اور ٹیکس وصول کرنے والے افسران، پولیس کے حکام اور تمام عمال حکومت!

عمال تنفیذ حکومات اسلامیہ میں مذکورۂ بالا لوگوں میں منقسم تھے اور وہ کسی خاص نظام کے ماتحت نہیں تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ والی کسی نظام کی پرواہ کرتے تھے۔ ہر ایک اپنے نفوذ کو بڑھانے اور دوسرے کے نفوذ کو کم کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔

والیوں کی طرف سے ایسا طرز کار اختیار کیا گیا تھا، کہ ان کے دور میں قاضی کی شخصیت پر، اس کے فیصلوں کا انحصار رہ گیا تھا۔ اگر قاضی کو والی کی تائید حاصل ہے تو اس کے فیصلے نافذ ہوں گے، اور اس کے فتوے کی وقعت کی جائے گی۔ ورنہ بصورت دیگر ارباب اختیار اس کے فیصلوں کو نافذ نہیں کریں گے۔ یہیں سے یہ صورت پیدا ہوئی کہ لوگ اپنی فریاد کو پہنچانے کے لئے قاضیوں کے بجائے والیوں کے والی کی جبہ سائی کرنے لگے۔ کیونکہ قاضیوں کے فیصلوں کو کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی اور یہ نتیجہ تھا، اختیارات کی حد بندی صحیح طور پر نہ کرنے کا!

وقت کی ضرورت!

سطور بالا سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام کا جہاں تک تعلق ہے اس نے زیادہ سے زیادہ وسعت نظر سے کام لیا ہے، اور اپنے پیروؤں کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش تفکر اور تعقل کی رکھی ہے، مسلمانوں نے جب تک اس

قوت سے فائدہ اٹھایا۔ اس وقت تک وہ ترقی کرتے رہے۔ ساری
دُنیا ان کے قدموں پر جبہ سا ہوتی رہی۔ فتوحات کے دروازے
کے لئے کھل گئے۔ قومیں اور ملتیں اُن کے آستانۂ جلال کی چاک
اپنے لئے باعثِ فخر و ناز سمجھتی رہیں، لیکن جب انہوں نے
اپنی جمود پرستی کے باعث ٹھکرا دی، تو زوال و انحطاط کا دور
ہُوا۔ اور وہی مُسلمان جو ساری دنیا کے امام اور مقتدا بنے ہوئے
ایسے گرے کہ دنیا کی دوسری قومیں اور ملتیں ان سے کہیں آگے
گیئں۔ اور وہ کچھ نہ کرسکے۔ سوائے اس کے کہ حسرت و افسوس
ہاتھ ملتے رہ جائیں۔

حالات کا تقاضا اور وقت کی پکار یہ ہے کہ مسلمان اللہ کی
ہوئی ان نعمتوں سے پھر فائدہ اٹھائیں، اجتہاد اور تفکرِ صالح کا
انہوں نے بند کر دیا ہے، پھر سے کھولیں۔ اور پھر اپنے شاندار
فراموش ماضی کی تجدید کا فریضہ انجام دیں۔ اسلام نے تو
اقتدار کا سرچشمہ، ملت کی ہیئت اجتماعی کو چند شرائط کے ساتھ
دیا ہے۔ اور وہ شرائط بھی کیا ہیں؟ صرف یہ کہ حدود و عدل
نہ ہو، کتاب و سنت کی روشنی میں پیروی کی جائے۔ یہ شرائط تو
ہیں اگر اسلام نے انہیں نہ عائد کیا ہوتا، تو بھی رضا کارانہ طور
اختیار کئے بغیر کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا۔ یہ ایسے شرائط ہیں
صواب میں انہیں اختیار کر لینے کے بعد وہ مقاصد خود بخود ختم
ہیں، جنہوں نے دوسری قوموں اور ملتوں کو برباد و ہلاک کیا
مسلمانوں کو ہلاکت اور بربادی کے دروازے پر لاکر کھڑا کر

اسلام نے انسانی ضروریات و مصالح، نیز نفسیات انسانی کا ہر ہر قدم پر لحاظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دیکھتے دیکھتے ایک عالمگیر مذہب بن گیا، اور دوسری قومیں جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہونے لگیں۔ تاریخ اپنے آپ کو پھر دُہرا سکتی ہے۔ حالات پھر روبراہ ہو سکتے ہیں، وہ عظمت خاص، جو تاریخ کے صفحات کی زینت ہے۔ پھر حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر مسلمان، مسلمان بن جائیں، اسلام کو سمجھیں، اور صدق دل سے اس کے بتائے ہوئے راستہ پہ عمل پیرا ہوں؟

مسئلہ خلافت

خلافت، امارت، امامت

امامت کبریٰ، خلافت، امارت مومنین، یہ ایک ہی معنی کے لئے مترادف الفاظ ہیں، مفہوم ایک ہے، الفاظ مختلف ہیں، علماء نے اس مفہوم سے مراد وہ منصب لیا ہے، جس کی حاکمیت عامہ، دین اور دنیا دونوں پر حاوی ہوتی ہے۔ جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ مصالح عوام پر نظر رکھے، اُمت کے حالات کا سدھار کرے، دین کی حفاظت کرے، سیاست دنیاوی کو صحیح اسلوب سے برتے:

اس موضوع پر بحث و گفتگو کے مختلف پہلو ہیں۔ ہم اس موضوع پر تین پہلوؤں سے گفتگو کریں گے۔

(۱) نصب خلافت واجب کیوں ہے۔؟

(۲) قیام خلافت کے شروط معتبر کیا ہیں؟

(۳) حکومت اسلامیہ میں خلیفہ کا درجہ کیا ہے؟

اب ان سہ گانہ عنوانات میں سے ہر ایک پر ہم الگ الگ گفتگو کریں گے۔

نصب خلافت کا وجوب

جمہور مسلمین کا اس پر اتفاق ہ
کہ شرعی لحاظ سے نصب خلاف
واجب ہے. اس ایجاب کے ثبوت میں ہمیں کئی چیزیں ملتی ہیں.

ایک تو خود صحابۂ کرام کا اجماع، کہ انہوں نے نصب خلافت
کو تدفین رسولؐ پر بھی مقدم رکھا.

دوسرے یہ کہ حدود کا قیام اور سرحدوں کا انتظام بغیر خلیف
کے ممکن نہیں، اور یہ اصول مسلم ہے کہ کوئی واجب جس ذریع
سے پورا ہوتا ہو اس ذریعہ کو اختیار کرنا بھی واجب ہے.

تیسرے یہ کہ نصب خلافت کے بعد بہت سے فائدے مرتب
ہوئے ہیں، اور بہت سی مضرتیں دور ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی بالاج
واجب ہے!

مسلمانوں کا ایک گروہ اس طرف بھی گیا ہے کہ نصب خلا
ازروئے عقل بھی واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کوئی اُمت
بھی اس قوت سے مستغنی نہیں ہو سکتی جو اس کے قوانین کو نافذ کر
جو اس کے حالات کی اصلاح کرے. غرض ایک ایسے حاکم
وجود ضروری ہے جو اس کے امور کا کفیل ہو، اور یہ ضرورت اج
بشری کی ضروریات میں سے ایک ہے.

جو لوگ نظر صحیح کے حامل ہیں وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں
ان دونوں راؤں میں اس طرح توفیق ممکن ہے کہ فرد اور
کے حقوق کی حفاظت، اور قوانین کے نفاذ کے لئے، ازروئے
نصب خلافت ضروری ہے۔ اور شرع چونکہ ان امور کی

کرتی ہے۔ جو مقتضائے عقل ہوں، لہٰذا نصب خلافت پر عقل و شرع
دونوں کا اتفاق ہے، البتہ فرق یہ ہے۔ کہ عقل ایک حاکم مطلق کی
ضرورت تسلیم کرتی ہے، اور شرع ایک ایسے حاکم کا وجود تسلیم کرتی
ہے، جس کی اُمت پشت پناہی کرتی ہو، جس کے ہاتھ پر قوم بیعت
کر چکی ہو، اور یہ بیعت جبر و قہر سے نہ ہوئی ہو، بلکہ اختیار اور رضا
سے ہوئی ہو، لہٰذا مقتضائے شرع ایک ایسا فرد اکمل ہے، جس کے
حقائق و شرائط کی بھی عقل سے پورے طور پر تائید ہوتی ہے"

ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں کہا ہے:-

"جمہور مسلمین سے بعض لوگوں نے نصب خلافت کے
وجوب کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ وہ عقلی اور
شرعی طور پر اس کے وجوب کو تسلیم نہیں کرتے، ان میں
بعض خوارج اور معتزلہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں،
ان حضرات کے نزدیک واجب یہ ہے، کہ
شرع کے احکام نافذ ہوں۔ اگر امت اصول عدل پر
عامل ہے اور خدائے تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرتی ہے تو
نہ اسے کسی امام کی ضرورت ہے، اور نہ نصب امامت
واجب ہے:

بہر حال علمائے امت اس پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کے لئے ایک
امام اکبر کا قیام، امامت عامّہ کا وجود، جس کے گرد امت کے
اموال و مصالح گردش کرتے ہوں واجب ہے۔

شروط معتبرہ کیا ہیں؟ ابوالحسن ماوردی نے "الاحکام السلطانیہ" میں روایت کی ہے۔ امامت کے اہل کے لئے شروط معتبرہ سات ہیں:۔

(۱) عدالت

(۲) اتنا علم جو اجتہاد کو کفائت کرتا ہو۔

(۳) سلامتیٔ حواس

(۴) سلامتیٔ اعضاء

(۵) اصابت رائے

(۶) شجاعت۔

(۷) نسب۔

یعنی ضروری ہے کہ امام قریش میں سے ہو، جس کی تائید نص سے بھی ہوتی ہے۔ اور جس پر اجماع امت بھی ہو چکا ہو؛ کیونکہ یوم سقیفہ کے موقعہ پر جب انصار سعد بن عبادہ کی بیعت امامت کر رہے تھے، تو حضرت ابوبکرؓ نے دلیل پیش کی تھی، اور کہا تھا رسول اللہؐ کا ارشاد ہے "الائمۃ من قریش" یعنی امامت قریش کا حق ہے۔ یہ سنکر وہی انصار جو ــــــ "منا امیر ومنکم امیر" یعنی ایک امیر ہم میں سے۔

ایک تم میں سے ــــــ کے نعرے لگا رہے تھے، خاموش ہو گئے۔ گویا انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی یہ روایت تسلیم کر لی اور اس کی تصدیق کر دی، اور ابوبکرؓ کے اس قول کو مان لیا ــــ "نحن الامراء وانتم الوزراء" ہم سردار ہیں، اور تم وزیر ہو، بمنزلہ فرمان

"کہ قدموا قریشا ولا تتقدموھا" ——— اس نص کے بعد
قریش کے حقدار امامت ہونے کے بارے میں کوئی منازعت باقی نہیں رہنی چاہئے۔ اور نہ کسی مخالف کو یارائے تکلم باقی رہنا چاہئے۔۔۔۔"

ان شرائط میں سے چھ شرائط ——— عدالت، علم، سلامتیٔ حواس، سلامتیٔ اعضاء، اصابت رائے، شجاعت ——— ایسے ہیں، جن سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ دین اور سیاستِ دنیا کی حفاظت کے لئے ان کا ہونا بہت ضروری ہے۔ سمجھ لینا چاہئے یہ چھ شرائط متفق علیہ ہیں۔

اب رہی ساتویں شرط نسب، یعنی امام کے لئے قریش ہونا کا لزوم سو مختلف فیہ ہے اور اس کے بارے میں جو نصوص پیش کی گئی ہے وہ اگر صحیح ہے۔ تو دوسرے بہت سے نصوص اس کے معارض بھی ہیں جن میں نسب کے اعتبار کو قابل ترک بتایا ہے۔ اور اعمال کے اعتماد کو اصل الاصول قرار دیا ہے۔ نیز جن میں، ان لوگوں کو للکارا گیا ہے جو عصبیت کے مرض میں گرفتار ہوں، اس کے علاوہ یہ ایسی شرط ہے جس میں اس مقصد کی غائت کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے، جو نصب خلافت و امارت کے سلسلہ میں پیش نظر ہے اس لئے کہ کسی چیز کی شرط کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مقصد تک پہنچنے میں ممد و معاون ہوتی ہو اگر یہ مان لیا جائے کہ امام کے لئے قریشی ہونا ایک شرط ہے، تو امامت کی غرض و غائت کا اقتضاء، اس شرط کی ہرگز تائید نہیں کرتا ہے، اس لئے کہ امور دین کی حفاظت معاملات سیاسی کی نگہبانی، یہ ایسے کام نہیں ہیں جو صرف قریشی ہی سے انجام پا سکتے ہوں۔

اور اگر مان لیا جائے، کہ "الائمۃ من قریش" کی حدیث صحیح ہے، تو یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ اس کی مصلحت یہ تھی کہ قریش قوت اور دبدبہ والے تھے۔ ان میں سے جو خلیفہ ہوتا وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں، جمع کلمہ میں حالات کے سدھارنے میں اپنے قبیلہ کی طاقت سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ لہٰذا یہ شرط دائمی نہیں، وقتی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ خلیفہ ایسے قبیلہ میں سے ہو، جو عصبیت سے بھرپور ہو، قوت وطاقت والا ہو۔

خلافت کے شروط معتبرہ میں سے جو شخص متفق علیہ شرائط کو پورا کرتا ہو، وہ بھی اس وقت تک مستحق اطاعت نہ ہوگا۔ جب تک وہ اہل حل وعقد کی بیعت نہ کرلیں، جنہیں اُمت نے صاحب عدالت، حامل علم ورائے سمجھ کر اس کام کے لئے منتخب کیا ہو۔

کیا امام اپنا ولی عہد نامزد کرسکتا ہے

بعض علماء کا خیال ہے کہ جس طرح امام، امام بیعت ہوتا ہے، اسی طرح امام، امامِ استخلاف و ولایت عہد بھی ہوتا ہے یعنی جس طرح اس کے تمام احکام واجب التعمیل ہوتے ہیں۔ اسی طرح اپنی جانشینی کے سلسلہ میں جسے اپنا خلیفہ یا ولی عہد وہ بنادے، اس کی تعمیل بھی کرنی چاہیئے۔ لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں۔ اس لئے کہ خلیفہ نے اپنے بعد کے لئے جو خلیفہ بنایا ہو، یا جسے ولی عہد مقرر کیا ہو، اگر اہل حل وعقد اس کی تائید وتوثیق نہ کریں، تو وہ ہرگز امام اور خلیفہ نہیں بن سکیگا۔ اور نہ اس کی اطاعت واجب ہوگی۔ لہٰذا اصل چیز اہل حل وعقد کی بیعت ہے۔ نہ کی استخلاف

اور ولائت عہد اگر مسلمانوں نے حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر کو بہتر پایا۔ اور ان کی بیعت کر لی۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوا۔ باقی یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت ابو بکرؓ کا حضرت عمرؓ کو اپنا ولی عہد بنانا، مسلمانوں کے لئے کوئی حجت یا دلیل یا حکم واجب الطاعت نہیں تھا۔ ایسے ہی مسلمانوں کو حق تھا۔ کہ وہ کسی ایسے شخص کی بیعت کر لیتے، جو ان لوگوں میں نہ تھا جنہیں خلافت کے لئے حضرت عمرؓ نے نامزد کیا تھا۔ لہٰذا استخلاف اور ولائت عہد، سلف کا کوئی ایسا حکم نہیں ہے۔ جو خلف کے لئے واجب اور ضروری ہو، اس کے بعد بھی اُمّت کو پُورا پُورا اختیار رہتا ہے، اور اسی کا قول، قول فیصل ہوتا ہے۔ کہ وہ جسے چاہے اپنا امام اور خلیفہ بنا لے، جس طرح اُمت کو یہ حق حاصل ہے، کہ وہ جس خلیفہ یا امام کو دیکھے۔ کہ وہ راہ صواب سے ہٹ رہا ہے، معزول اور برخواست کر دے،

لہٰذا خلیفہ کے تقرر کے بارے میں اصل رائے اہل حل وعقد کی ہے۔ کسی فرد واحد کی نہیں ہے، خواہ وہ کوئی ہو، حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت اس تعجیل سے کی تھی۔ کہ اہل حل وعقد سے مشورہ کی نوبت نہیں آنے پائی تھی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس کا کوئی برا اور تلخ نتیجہ نہیں نکلا۔ لیکن حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو خلافت کے لئے اس وقت نامزد کیا۔ جب کبار صحابہ کے ساتھ خوب طول طویل مشورے کر لئے اور اُن کے خلاف ان کی شدت اور سختی کے سوا کوئی شکائت نہ سُنی گئی۔

خلیفہ کی حیثیت ہم ابھی بتا چکے ہیں، کہ معاملات مسلمین کے انفصال کے لئے ضروری ہے کہ "شوریٰ" ہو، اور یہ کہ ایک ریاست عالیہ (خلیفہ یا امام یا امیر) ہو جس کی ارباب حل وعقد بیعت کر چکے ہوں۔

حکومت اسلامیہ میں اس حکومت کا درجہ کسی بھی دستوری حکومت کے مقابلہ میں کم نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ خلیفہ کی ساری طاقت خود اُمت ہے، جو ارباب حل وعقد کی صورت میں اس پر حاوی رہتی ہے۔ اسی لئے علمار اسلام نے یہ طے کر دیا ہے کہ اُمت خلیفہ کو معزول کر سکتی ہے، بشرطیکہ اس نے واقعی کوئی ایسی حرکت کی ہو، جس نے اس کے عزل کو ضروری قرار دے دیا ہو۔

حضرت ابو بکرؓ صدیق جب مسند آرائے خلافت ہوئے تو انہوں نے اپنے خطبہ میں فرمایا تھا۔

"اے لوگو! میں تمہارا والی بنایا گیا ہوں، حالانکہ میں تم سب سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو، اور اگر میں بھٹکوں تو مجھے ٹھیک کر دو!"

خطبہ کے خاتمہ پر حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا:۔

جب تک میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کروں، تم بھی میری اطاعت کرو، اور اگر میں خدا کی نافرمانی کروں، تو تم پر بھی میری اطاعت ضروری نہیں ہے:

ایسی ہی روایتیں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے بارے میں بھی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان حضرات کو اس کا احساس تھا کہ

اختیارات کا مرکز اور مرجع ...... اُمت ہی ہے۔ اور وہ خلیفہ پر حاکمانہ حیثیت رکھتی ہے، انہیں اس کا بھی احساس تھا کہ وہ امت کے سامنے مسئول اور جوابدہ ہیں۔

اسلام کا نظام خلافت کیا ہے؟

تمام دستوری حکومتوں کے مقابلہ میں اسلام کا نظام خلافت مختلف ہے۔ کیونکہ خلافت ایک ایسی ریاست عامہ ہے۔ جو امور دین اور معاملات دنیا، دونوں کی کفیل ہے، خلیفہ کو جس طرح کامل تشریعی اختیارات حاصل ہوئے ہیں، اسی طرح اُسے قضا اور تنفیذ کے اختیارات کاملہ بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ سیاست ملکی اور امور دنیاوی کا سارا نظام بھی اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ خلیفہ کا یہ کام بھی ہے کہ وہ نماز کی امامت کرے، حج کا امیر بنے، شعائر دینی قائم کرے، جمعوں میں خطبہ دے، عید وغیرہ کے اجتماعات میں تقریر کرے۔ ان کے علاوہ اور تمام دینی کام انجام دے، ان دونوں اختیارات کو اس کے ہاتھ میں رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ امور دین اور سیاست دونوں کی نگہبانی کرے، تاکہ جس طرح اس کی نظر شیؤن دینیہ پر ہو، اُسی طرح وہ حالات دنیا سے باخبر ہو، کیونکہ جب اس کی شیؤن اور حالات پر نظر نہ ہوگی، وہ رعیت کی اصلاح کیونکر کر سکیگا۔ اس کے حالات کو کیسے سدھار سکیگا۔ خلیفہ کے منصب کا مقصد اور اس کی بیعت کی غائت اس کے علاوہ اور ہے کیا؟

خلیفہ کے ذمہ امور دینی کی سربراہی سے یہ خیال کرنا، کہ وہ براہ راست خدا سے کوئی تعلق رکھتا ہے، یا وہ کسی قوت غیبی کا حامل ہے، غلط ہے۔ وہ بھی عام مسلمانوں کا ایک فرد ہے۔ مسلمانوں نے اس پر بھروسہ کیا؛ اور

اپنے امورِ دین اور حالات دنیا کی نگہبانی اسے سونپ دی، اور بیعت کر لی تاکہ وہ اپنے مصالح کا لحاظ کر کے اپنے فرائض انجام دے، اسی وجہ سے مسلمانوں کے لئے اس کے احکام کی سماعت و اطاعت ضروری قرار دیگئی.

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض جہال نے حکومت یا ریاست عالیہ کے ساتھ صفات الٰہی جو چپکا لئے ہیں اور خلفاء کی شان بڑھانے کے لئے جو امتیازات آسمانی عائد کر لئے ہیں، دینی نقطۂ نظر سے اُن کی کوئی اصل نہیں ہے. حضرت ابوبکرؓ سے کہا گیا۔ "یا خلیفۃ اللہ" —— اے خدا کے خلیفہ —— آپ نے فرمایا، "میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں. البتہ رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں"؛

خلیفۃ اللہ یا خلیفۂ رسولؐ ؟

جمہور علماء خلفاء کے ساتھ اس لقب (خلیفۃ اللہ وغیرہ) کو ناجائز سمجھتے ہیں، اور اس لقب کے استعمال کرنے والے کو فاسق و فاجر کہتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ خلیفہ یا جانشین بنانے کی ضرورت اسے پیش آتی ہے جو غائب ہو، یا جسے موت آتی ہو، لیکن اللہ نہ غائب ہو سکتا ہے نہ اسے موت آسکتی ہے۔

قرآن مجید میں متعدد آیات ہیں۔ جن سے اس خیال کی نفی ہوتی ہے۔ کہ رسول کو کسی شخص پر حاکمیت دینی حاصل تھی، پھر بھلا خلفاء کو یہ بات کہاں سے حاصل ہو سکتی تھی؟

خدائے تعالیٰ اپنے رسولؐ سے کہتا ہے" فذکر انما انت مذکر لست علیھم بمصیطر —— تذکیر کرو، تم تو صرف تذکیر کرنیوالے ہو، نہ کہ داروغہ —— ایک اور جگہ ارشاد ہؤا ہے: وما انت

علیہم بجبّار" ــــــــ تم ان پر جبار بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو ــــــــ ایک مقام پر فرمایا ــــــــ " لیس علیک ھداھم ولکن اللہ یھدی من یشاء " ــــــــ اُن کی راہ یابی تمہارے ذمہ نہیں ہے، یہ تو خدا کا کام ہے۔ جسے چاہتا ہے، ہدایت بخشتا ہے۔ ــــــــ "غرض بہت سی قرآنی آیتوں، رسولؐ کی سنتوں، خلفاء راشدین کے آثار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جماعت کی رائے پر بھروسہ کیا گیا، اور جب کبھی خلیفہ پر یہ ظاہر ہو گیا، کہ اس نے غلط رائے قائم کی تھی، اور کسی دوسرے نے صحیح قائم کی تھی، تو اس نے اپنی رائے بے تامل واپس لے لی۔

"کتاب الاسلام والنصرانیۃ" میں درج ہے "

مسلمانوں کا خلیفہ معصوم نہیں ہے، نہ وہ مہبط وحی ہے، نہ کتاب وسنت کی تفسیر اس کا خاص الخاص حق ہے فہم کتاب کے بارے میں بھی اسے کوئی خاص اختصاص نہیں حاصل ہے، احکام علم کے بارے میں بھی اسے کوئی مزیت نہیں ہے۔ وہ کسی خاص سربلندی سے بھی بہرہ ور نہیں ہے بلکہ وہ اور تمام طالبانِ فہم برابر ہیں، ان میں اگر کسی کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہے تو صفاء عقل اور کثرۃ اصابت کے لحاظ سے حاصل ہے، اُمت یا اس کے نائب ہی اُسے مقرر کرنے کا حق رکھتے ہیں، اُمت ہی کو اس کی نگرانی " نگہبانی، اور محاسبہ کا حق ہوتا ہے۔ جب مصلحت کا اقتضا ہو، اُمت ہی کو حق ہوتا ہے کہ اسے معزول کر دے۔

اسلام میں دنیا کے اندر کسی کو کوئی خاص اختیارات

نہیں حاصل ہیں۔ ہاں اختیار ہے تو موعظۂ حسنہ کا، دعوت الی الخیر کا تنفیر عن الشر کا، اور یہ وہ اختیار ہے۔ جو ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کو حاصل ہے۔

اُمت کی بالادستی

غرض ہر اعتبار سے اسلامی مملکت اور شرعی حکومت میں، اُمت ہی کو بالادستی حاصل ہے۔ خلیفہ ہو، یا امیر، یا امام، اس کی سربراہی صرف اسی وقت تک ہے، جب تک اُمت کو اس پر اعتماد ہو، اس اتحاد کے ختم ہوتے ہی وہ اپنے منصب سے الگ ہونے پر مجبور ہے۔!"

حکومتِ اسلامیہ کی خارجہ پالیسی

اور اُس کی تشکیل

غیر حکومتوں کے ساتھ جو تعلقات و روابط قائم کئے جاتے ہیں، وہی سیاست خارجی کہلاتے ہیں، پچھلے زمانہ میں اس قسم کے صلات باہمی مساعد نہیں ہوا کرتے تھے، کیونکہ قوی حکومت، ضعیف قوم کو غلام بنا لینا چاہتی تھی، اور ضعیف قوم کو ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ قوی قوم کہیں اسے کچل دے۔ لیکن اگر باہمی طور پر ضمانات موجود ہوں، تو طمع اور ہوس کا دروازہ بھی بند ہو جائے گا۔ اور خوف و دہشت کا سدِ باب بھی ہو جائے گا۔ لہٰذا ہر اُمت ایک دوسرے سے الگ رہتی تھی، اور کسی قوم کی سیاست خارجیہ جنگ و پیکار، اور قتل و غارت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتی تھی۔

عصرِ حاضر کے تعلقاتِ خارجہ

لیکن زمانۂ جدید کی قومیں جب ایک دوسرے سے ضروریات و احتیاجات رکھنے پر مجبور ہوتی ہیں، اور ایک دوسرے سے بے نیازی نہیں برت سکتیں، تو انہیں یہ حاجات متبادلہ مجبور کرتے ہیں۔ کہ تعلقات خارجیہ ایک دوسرے سے قائم کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں، خاص اصول بھی وضع کر لئے گئے ہیں۔ اور قوانین بھی بنا لئے گئے ہیں۔ اور ایسی قوتیں بھی رکھی گئی ہیں، جو ان قوانین کی تنفیذ کی کفیل ہوتی ہیں، اسی سلسلہ میں قانون دولی کا علم مرتب و منضبط ہوا، اور ایسے قوانین بنائے

گئے۔ کہ ہر حکومت کے حقوق، ایک دوسرے سے رابطہ کا معیار
ایک دوسرے کے فرائض وواجبات ـــــــ جنگ اور صلح کے
زمانہ میں ـــــــ واضح ہو گئے۔"

قوانین، امن و صلح -!

علما، قانون نے سب سے پہلے جو قواعد
بنائے، وہ امن و صلح سے متعلق تھے
تاکہ باہمی تعاون اور رفاقت، اور باہمی تبادل منافع انسانی امکانی،
استطاعت کے مطابق درجۂ کمال تک پہنچ جائے، انہوں نے یہ بھی طے
کر دیا، کہ باہمی تعلقات صلح وامن اس وقت تک منقطع نہیں کئے جائیں
گے، جب تک شدید ضرورت نے جنگ وپیکار پہ مجبور نہ کر دیا ہو، اور
جب تک امن وصلح کی بحالی کی تمام تدبیریں ناکام نہ ہوں، ان قواعد کی
رو سے ایسے احکامات مرتب کر دیئے گئے کہ غیر حکومت کے مقابلہ میں
ہر حکومت کے حقوق وواجبات واضح ہو گئے، تاکہ ہر ممکن طور پہ اسباب
اختلاف کا ازالہ اور انقطاع ہو جائے۔

اسی طرح ان علما، قانون نے جنگ وپیکار کے زمانہ کے قواعد
ضوابط بھی بنا دیئے، کہ جب اختلاف رونما ہی ہو جائے، اور لڑائی چھڑ
ہی جائے، تب بھی جہاں تک ممکن ہو، شر اور فتنہ کا وقوع کم سے کم ہو

قانون جنگ و امن

احکام سلمیہ میں حکومتوں پر واجب کیا
ہے۔ کہ وہ ان حکومتوں کو تسلیم کریں
حکومت کے "شرائط" پہ پوری اُترتی ہوں، اور ہر حکومت کے اس
کو تسلیم کیا گیا ہے، کہ سیاست داخلیہ میں اس کی آزادی کامل ت
کی جائے۔ اس کے حدود کا احترام کیا جائے۔ اس کی رعایا کے

معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ تجارت کے سلسلہ میں، دوسروں پر ناروا پابندیاں نہ عائد کی جائیں، سفرا اور قناصل کا پورا پورا احترام کیا جائے، غرض یہ اور اسی طرح کے احکام مرتب کئے گئے، تاکہ خلاف واختلاف کا امکان کم سے کم ہو جائے۔

احکام حربیہ میں یہ ضروری قرار دیا گیا کہ باقاعدہ اعلانِ جنگ کیا جائے۔ اور اس وقت کیا جائے، جب اتمام حجت ہو چکا ہو، اور لڑائی کے شروع ہونے کے بعد بھی۔ وہ آلات واسلحہ نہ استعمال نہ کئے جائیں جن سے انسان کی تعذیب ہوتی ہو، اور دشمن کے جو لوگ مجروح ہوں یا گرفتار ہو کر آئیں، اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ غرض یہ اور اس طرح کے دوسرے قوانین بنائے گئے۔ کہ جنگ کے اثرات کم ہوں۔ اس کی تباہ کاریاں محدود رہیں اور انسان، انسان کے ساتھ رحم وکرم کا سلوک کرے۔

اسلام کیا کہتا ہے۔! اب ہم بتاتے ہیں کہ اسلام نے حالت جنگ وصلح اور امن وپیکار میں، دولت اسلامیہ کے لئے کون سے اصول مرتب کئے ہیں؟ اور کس طرح کے قواعد کی تشکیل کی ہے؟

حکومت اسلامیہ اور غیر مسلم ممالک علماء اسلام اس پر متفق ہیں کہ دولت اسلامیہ کا قیام وحدت دینیہ پر مبنی ہے، اور وہ تمام عناصر جو اس وحدت کے اجزاء ہیں ان کا مجموعہ ہے، وہی "اُمت واحدہ" ہے۔ اگرچہ ان کی زبان مختلف ہو، بود وباش مختلف ہو، یا تمام ممیزات قومیہ مختلف ہوں، اس لئے کہ دین

فلیقاتل فی سبیل اللہ الذین یشترون الحیوۃ الدنیا بالاخرۃ
آپ اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے قتال کیجئے، جنہوں نے آخرت
کے بدلے دنیا کی زندگی خرید لی ہے۔

یا سورۃ انفال میں ارشاد فرمایا گیا:۔ "یا ایھا النبی حرض المومنین
علی القتال یعنی اے نبی! مسلمانوں کو (کفار و مشرکین سے) قتال پر
ابھارو۔!

یا سورۃ توبہ میں ارشاد ہوا ہے:۔ فاذا انسلخ الاشھر الحرم
فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم وخذوھم واحصروھم
واقعدوا لھم کل مرصد فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا
الزکوۃ فخلوا سبیلھم ان اللہ غفور الرحیم۔ یعنی جب امن کے مہینے تمام ہو
جائیں۔ تو مشرکوں سے قتال کرو، جہاں بھی ان کو پاؤ گرفتار کرو
اور ان کا محاصرہ کر لو، اور ہر گھات میں ان کی تاک لگاؤ، پھر اگر وہ توبہ
کر لیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں۔ تو انہیں ان کے راستہ پر جانے دو۔
بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یا فرمایا گیا:۔ قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الاخر
ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من
الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم
صاغرون۔ یعنی ان لوگوں سے مقاتلہ کرو، جو اللہ پر ایمان نہیں لائے
نہ یوم آخرت پر ایمان لائے، اور نہ اس چیز کو حرام جانتے ہیں۔ جسے اللہ
اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے، اور نہ یہ اہل کتاب سچے دین
(اسلام) کو قبول کرتے ہیں، یہاں تک کہ یہ نگوں سار ہو کر جزیہ دینے لگیں

یا ارشاد ہوا ہے :۔ وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ واعلموا ان اللہ مع المتقین ..... یعنی مشرکوں سے اکٹھے ہو کر لڑو، جس طرح وہ تم سے اکٹھے ہو کر لڑتے ہیں، اور جان لو اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے :

حدیث قتال !

(۲) بخاری اور مسلم کی ابن عمرؓ سے یہ روایت ہے کہ —— وقال رسول اللہ امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ، ویوتوا الزکوٰۃ فان فعلوا ذلک عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک مقاتلہ کروں، جب تک وہ کلمۂ توحید اور رسالت محمدیؐ پر ایمان نہ لے آئیں۔ نماز نہ قائم کریں، اور زکوٰۃ نہ دیں، اگر وہ یہ سب کچھ کرنے لگیں، تو جان و مال کو مجھ سے محفوظ کریں گے، سوا اس کے کہ اسلام کے اصول کے مطابق ان سے مواخذہ کی نوبت آئے۔ اور ان کا حساب کتاب اللہ کے ذمہ ہے —— ظاہر ہے یہ نص ہے اور اس سے یہ ثابت ہے کہ قتال کا حکم دیا گیا ہے، اور یہ کہ دعوتِ اسلام کا ایک طریقہ قتال بھی ہے۔

کافروں سے ربط و تعلق کی ممانعت

(۳) خدائے بزرگ و برتر نے قرآن کریم کی بہت سی آیات میں مسلمانوں کو ممانعت کی ہے کہ وہ کافروں کو دوست نہ بنائیں، ان سے ربط و محبت کے تعلقات قائم نہ کریں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا

ہے کہ مسلمان، غیر مسلموں کو نہ اپنا حلیف بنا سکتے ہیں، نہ ان سے موالات کر سکتے ہیں"

سورۂ آل عمران میں وارد ہوا ہے ——— لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین ——— یعنی مسلمانوں کیلئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائیں۔

سورۂ مائدہ میں آیا ہے:——— یاایھا الذین امنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض ومن یتولھم منکم فانہ منھم ——— یعنی اے مسلمانو! یہود اور نصاریٰ کو دوست مت بناؤ، تم میں سے جو انہیں اپنا دوست بنائے گا، اس کا شمار انہی میں ہوگا۔

سورۂ ممتحنہ میں کہا گیا ہے کہ:- یاایھا الذین امنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودۃ وقد کفروا بما جاءکم من الحق یخرجون الرسول وایاکم ان تؤمنوا باللہ ربکم ——— یعنی اے مسلمانو اپنے اور میرے دشمن کو دوست مت بناؤ۔ کہ تم انہیں دوستی کا پیام بھیجو۔ حالانکہ وہ اس خبر (اسلام) کا انکار کرتے ہیں جو تمہارے پاس سچائی کے ساتھ آئی ہے وہ پیغمبر کو اور تم کو اس لئے جلا وطن کرتے ہیں، اس لئے کہ تم اللہ پر ایمان لے آئے ہو"!

جبری تبلیغ (۴) جب صحیح اسلوب پر اسلام کی دعوت دی جائے تو اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب پر قائم رہنے کی پھر ان کے پاس کوئی معقول دلیل نہیں رہ جاتی، اس لئے کہ خدا نے بجز

لے جن زبردست دلائل سے اپنی وحدانیت اور اپنے رسولؐ کی صداقت ثابت کی ہے، ان کا کوئی توڑ ہی نہیں ہے۔ اور اس کے بعد مخالفین کے عذرات۔ ولائل پادر ہوا ہو جاتے ہیں۔ پھر جب انہیں حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اسلام کی دعوت دی جائے، اور اسے رد کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی حیلہ، یا عذر، یا دلیل نہ ہو، تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر ہم بزور بستی ان کو خیر اور فلاح کے راستہ پر لاکر کھڑا کر دیں، اور جبر و قہر سے کام لے کر انہیں راہ راست دکھائیں، اگر وسائل حکمت بھی انہیں راہ راست پر لانے میں ناکام ہوں، اور جبر و قہر سے بھی وہ راہ ہدایت نہ اختیار کریں تو پھر فرض ہو جاتا ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ اور شر کی جڑ کاٹ دی جائے۔ تاکہ ان کی گمراہی سوسائٹی کے دوسرے اعضاء میں نفوذ نہ کرے۔ جس طرح ایک عضو کا علاج نہ ہو سکے، اور اس سے دوسرے اعضائے بدن کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو تو اسے کاٹ دینا ہی بہترین علاج سمجھا جاتا ہے۔

یہ رائے رکھنے والے حضرات دولت اسلامیہ کی سیاست خارجیہ کو حسب ذیل اصولوں پر مبنی کرتے ہیں۔

(۱) **جہاد** ——— جہاد فرض ہے، اسے ترک نہیں کیا جا سکتا، سوا اس کے کہ حالات ایسا کرنے پر مجبور کریں، مثلاً مسلمان کمزور ہوں، اور غیر مسلم طاقت ور، لہٰذا، تیاری کے دوران تک جہاد ملتوی کیا جا سکتا ہے، صرف امان وغیرہ پر اسے نہیں چھوڑا جا سکتا۔

جب قتال مسلمانوں کے سامنے یا ان کے قریب ہو رہا ہو، تو ہر

یقین ہو گیا تھا کہ مصلحت عامہ کا تقاضا یہی ہے کہ جدال و قتال بند کر دیا جائے ۔ تاکہ مسلمان مشرکین عرب کی زیادتیوں سے محفوظ ہو جائیں، اور اپنے دین کے مخالفوں سے اختلاط پیدا کریں، اور انہیں خدا کی آیات سنائیں، اور دعوتِ اسلام دیں، نتیجہ یہ ہُوا کہ مشرکین دین اسلام میں فوج در فوج داخل ہونے لگے، اور معاہدۂ التوا، جنگ سے مسلمانوں کو بڑی نصرت ملی ۔ اس التوا، جنگ سے جو فائدہ انہیں ہُوا ۔ وہ ہرگز جنگ و پیکار سے نہ حاصل ہوتا ۔ یہاں تک کہ بعض علماء کا قول ہے کہ "فتح مبین" سے مراد انا فتحنا لک فتحا مبینا مکہ نہیں ہے بلکہ صلح حدیبیہ ہے ۔!

امان وقتی میں اگر امام حالات کا تقاضا ، اور امت کی مصلحت یہ دیکھے کہ اسے توڑ دیا جائے ۔ تو وہ ایسا کر سکتا ہے، لیکن نقض امان سے پیشتر اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ مومنیں (امان یافتہ لوگوں) کو وہ متنبہ کر دے اور قتال سے پیشتر انہیں خبردار کر دے ۔ تاکہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے، اور یک بیک وہ حملہ کی زد میں نہ آ جائیں یہ اصول اس ارشاد رسول پر مبنی ہے ۔ فی العھود وفاء لا غدر —

یعنی عہد کی پابندی کرنی چاہیئے، بدعہدی سے پرہیز کرنا چاہیئے ۔

"مسلمانوں کی طرف سے اگر وقتی امان توڑی جائے تو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انتباہ و اطلاع کے ساتھ مومنین (امان یافتہ لوگوں) کو اتنی مہلت دی جائے کہ نقض امان کی اطلاع ان سب کو ہو جائے ۔ اور ان کی مملکت کے ایک ایک گوشہ میں اس کی خبر ہو جائے، تاکہ وہ اپنی قرار داد واقعی تیاریاں کر سکیں، اور مسلمانوں پر بے وفائی اور بدعہدی

کا الزام نہ لگا سکیں، اور اگر نقض امن خود مومنین (امان یافتہ لوگوں) کی طرف سے ہو تو پھر کسی انتباہ کی ضرورت نہیں ہے، اور اب مقاتلہ کے لئے کسی اطلاع کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے خود نقض عہد کیا ہے۔ خود اپنی امان توڑی ہے، خود غدر اور بے وفائی پر آمادہ ہوئے ہیں۔

رہائن کے ساتھ رعائت! البتہ اس صورت میں بھی مسلمانوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ ان کے پاس جو رہائن (یعنی یرغمال کے طور پر ان کے پاس مومنین میں سے جو لوگ) ہوں انہیں ہرگز قتل نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ غداری اور بد عہدی کے مقابلہ میں اپنے عہد اور پاس وفا پہ قائم رہنا بہر حال بہتر ہے، جیسا کہ فرمان رسول ؐ ہے ــــــ "لا تخن من خانک" ــــــ یعنی جو تم سے خیانت کرے تم اس سے خیانت نہ کرو۔"

اب امان مؤبد یعنی دائمی امان کو لیجئے، یہ باقاعدہ معاہدہ کے ماتحت ہوتی ہے اور یہ عہد کوئی فرد واحد یا عامی نہیں کر سکتا، صرف امام یا اس کا نائب کر سکتا ہے، یہ اقدام اہل کتاب اور مشرکین غیر عرب کے ساتھ صحیح ہے، اور مرتدین، نیز مشرکین عرب کے ساتھ قطعاً جائز نہیں ہے، جب اس امان کے عہدنامہ پہ دستخط ہو جائیں، تو ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اس کا پاس کرے، اور کسی حالت میں بھی نہیں ٹوٹ سکتی،

ذمیوں کی امان کب ٹوٹتی ہے، ذمیوں کی امان تین صورتوں میں ٹوٹ سکتی ہے۔

(۱) کوئی اسلام لے آئے۔

(۲) کوئی دار الحرب چلا جائے۔

(۳) مسلمانوں پر زیادتی کرے۔

باقی جزیہ دینے سے انکار کرنا، یا کسی مسلمان کی خطا کرنا، یا کسی جرم کا ارتکاب کرنا، بشرطیکہ وہ شخصی ہو، اجتماعی نہ ہو، نقض عہد کو مستوجب نہیں ہوتا، یہ پابندیاں جو مسلمان پر عائد کی گئی ہیں، وہ اس اصول پر مبنی ہیں کہ اگر ذمی سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جس کی تاویل ہو سکتی ہو، یا جو محتمل شک ہو اس سے "ذمہ" کا معاہدہ نہیں ٹوٹتا، بلکہ وہ بدستور عائد رہتا ہے۔

(۴) دارالاسلام ——————— شرع کی اصطلاح میں دارالاسلام وہ ہے، جس میں اسلام کے احکام جاری ہوں اور اس میں ہر وہ شخص مامون ہو، جو مسلمانوں کی امان میں ہو، اور، خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی۔

اور دارالحرب وہ ہے جس میں احکام اسلام کا اجرا نہ ہوتا ہو اور مسلمانوں کی امان میں جو ہوں وہ مامون نہ ہوں؛

بہرحال اس رائے کے اصحاب نے اپنی رائے اور اصول کی بنیاد جو قرار دی ہے وہ یہ ہے کہ غیر مسلمین کو، جب اسلام کی دعوت دی جائے، اور انہیں دلائل حقہ سے روشناس کر دیا جائے، اور ان کے دلائل رد کر دیئے جائیں، ان کے شکوک رفع کر دیئے جائیں، ان کے عذرات باطل کر دیئے جائیں، اور ان پر آیات قرآنی واضح کر دی جائیں اور پھر بھی وہ اپنی ضد پر اڑے رہیں، اور اسلام نہ قبول کریں، اور اس کے آیات سے اعراض کرتے رہیں، اس کی دعوت مسترد کرتے رہیں تو گویا وہ خود مسلمانوں کو جنگ کی دعوت دے رہے ہیں، اور اس

صورت میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ان غیر مسلموں کو راہ حق پر جبراً
لے آئیں، کیونکہ جب وہ دعوت، حکمت، اور موعظہ حسنہ سے راہِ راست
پر نہیں آئے۔ تو اب اس کے علاوہ چارۂ کار ہی کیا ہے کہ ان پر جبر کیا
جائے۔ اور انہیں راہ صواب پر گامزن کر دیا جائے۔؛

مسلم اور غیر مسلم:! دوسرے فریق کا یہ خیال ہے کہ دولت اسلامیہ کا تعلق غیر مسلم حکومتوں سے
اس اصول پر مبنی ہونا چاہیئے، جو علمار قانون ودلی نے مقرر کر دیا ہے
اور جو عہد حاضر کے اصول و قانون سے مطابق ہو، اور یہ کہ اسلام صرف
اس بنار پر کسی غیر مسلم کے قتل کو جائز نہیں قرار دیتا کہ اس کا مذہب
اسلام کے علاوہ کوئی اور ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے ہرگز یہ روا نہیں ہے
کہ وہ لوگوں سے صرف اس بنار پر مقاتلہ کریں، کہ وہ مذہب اور دین
میں اُن کے مخالف ہیں، مسلمانوں کو قتال وجدال کی اجازت صرف اس
صورت میں دی گئی ہے، کہ غیر مسلم، مسلمانوں پر زیادتی کریں، اور اُن
کے حقوق پامال کریں، اور انہیں پریشان کریں، یا دعوت اسلام کی
راہ میں حائل ہوں، ایسی صورت ہو، تو بیشک قتال وجدال واجب ہے
تاکہ ظلم وزیادتی کا استیصال ہو جائے، اور دعوت اسلامیہ کا راستہ
صاف ہو جائے۔ لیکن اگر یہ صورت ہو کہ مسلمانوں کے دینی معاملات
پر دراز دستیاں نہ ہو رہی ہوں، نہ مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو، نہ دعوت
اسلام کے راستہ میں سنگ گراں حائل ہوں۔ تو کسی طرح بھی جدال و
قتال واجب نہیں ہے۔ نہ ان سے معاملت ناجائز ہے، نہ ان سے کاروبار
حرام ہے، غرض اس گروہ کی رائے میں جدال وقتال کی اس بنار پر

اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کہ یہ بھی دعوتِ اسلام کا ایک طریقہ ہے
کی اجازت تو جب ہی مل سکتی ہے جب دعوت اسلام پر نارواپابن
ہوں، اور مقصود ظلم و زیادتی کرنے والوں کی سرکوبی ہو۔

دلائل و بینات :۔ اس گروہ کے دلائل و براہین حسب ذیل ہیں

آیات قتال کی تشریح

(۱) قرآن کریم میں آیات قتال
ہوئی ہیں، وہ زیادہ تر مکی و مدنی
سورتوں میں ہیں، اور اُن میں جدال و قتال کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ
وجہوں سے دیا گیا ہے۔

(الف) دفع ظلم، اور قطع فتنہ،

(ب) دعوت اسلام کی حمایت،

اس لئے کہ عہد رسول ؐ میں کفار ——— عام اس سے کہ مشرک
عرب ہوں یا اہل کتاب ——— ہر صورت میں مسلمانوں کی ایذارسانی
تھے۔ اور ہر ظلم و زیادتی، اور فتنہ و شرارت پر تلے رہتے تھے۔ ان
کوشش یہ ہوتی تھی کہ خواہ کتنا ہی ظلم و جبر کرنا پڑے، لیکن جو اس
قبول کر چکا ہے۔ وہ ترک اسلام کرکے، پھر اپنے آبائی دین پر
آجائے، یا جو شخص اسلام قبول کرنے والا ہو، وہ اپنے اس ارادہ
باز آجائے۔

اس شرارت و فتنہ سے کفار و مشرکین عرب کا مقصد یہ تھا کہ
اسلام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کریں، اور دعوتِ اسلام کا راستہ مسدود
دیں۔

پس، خدائے بزرگ و برتر نے مسلمانوں پر واجب کر دیا کہ

سرکشوں، اور خطاکاروں سے جدال و قتال کریں، ان کی زیادتی کا سر کچل دیں، ان کی پیدا کی ہوئی رکاوٹوں کو دور کر دیں، یہاں تک کہ فتنہ کا قلع قمع ہوجائے اور شر کی جڑ کٹ جائے۔ اور مدعوئین اسلام اور دعوتِ اسلام میں کوئی حد فاصل، کوئی روک، کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، تاآنکہ دین صرف خدا ہی کا رہ جائے۔

آیاتِ قرآنی سے استدلال | خدائے تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں، جو مدنی سورت ہے، ارشاد فرمایا ہے:-

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا، ان اللہ لا یحب المعتدین وا قتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم والفتنۃ اشد من القتل ولا تقاتلوھم عند المسجد الحرام حتی یقاتلوکم فیہ، فان قاتلوکم فاقتلوھم کذلک جزاء الکافرین، فان انتھوا فان اللہ غفور رحیم، وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ، فان انتھوا فلا عدوان الا علی الظلمین

یعنی اللہ کے راستے میں قتال کرنے والوں سے مقاتلہ کرو، لیکن زیادتی مت کرو، بلاشبہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اور تم انہیں جہاں پاؤ ہلاک کرو، اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکال دیا، اور کفر سخت تر ہے قتل سے، اور ان سے مسجد حرام کے نزدیک مقاتلہ

سیاقِ عبارت کے لحاظ سے اس جگہ شاہ رفیع الدین صاحب مرحوم نے "فتنہ" کا ترجمہ "کفر" کیا ہے اور یہ ہمارے نزدیک بھی اقرب الی الصواب ہے۔ (رئیس احمد جعفری)

مت کرو، یہاں تک کہ وہ اس کے درمیان تم سے لڑیں، تم انہیں مارو،
یہی سزا ہے کافروں کی، اور اگر وہ باز آجائیں تو بلاشبہ خدا بخشنے وال
ہے۔ اور لڑو ان سے یہاں تک کہ کفر نہ رہے، اور اللہ کا دین رہ جائے،
اور اگر وہ باز آجائیں تو سوا ظالموں کے زیادتی کسی پر نہ کرنا،

اسی طرح سورۂ نساء میں جو مدنی سورۃ ہے، وارد ہوا ہے۔

وما لكم لا تقاتلون في سبيل الله والمستضعفين من الرجال
والنساء والولدان الذين يقولون ربنا اخرجنا من هذه القري
الظالم اهلها واجعل لنا من لدنك وليا واجعل لنا من لد
نصيرا ——— اور اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہوئے تم ناتوان
مردوں سے، اور عورتوں سے، اور لڑکوں سے نہ لڑو، وہ جو کہتے ہیں اے
پروردگار ہمارے ہم کو اس شہر سے نکال، کہ یہاں کے رہنے والے ظالم
ہیں۔ اور اپنی طرف سے ہمیں دوست دے، اور اپنی طرف سے ہمیں
مددگار دے۔

اسی طرح خدائے تعالیٰ نے سورۂ انفال میں جو مدنی سورت ہے
ارشاد فرمایا ہے۔

وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله فان
انتهوا فان الله بما يعملون بصير ——— اور ان سے مقاتلہ کرو
یہاں تک کہ کفر باقی نہ رہ جائے، اور دین صرف خدا کا رہ جائے، اور اگر
وہ باز آجائیں، تو جو کچھ وہ کرتے ہیں، خدا اسے دیکھتا ہے ———

اسی طرح سورۃ حج میں ارشاد ہوا ہے، جو مکی سورت ہے:۔

اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا وان الله على نصرهم لقد

(۱) الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ

یعنی جن پر ظلم کیا گیا، انہیں مقاتلہ کی اجازت دی گئی۔ اور بلاشبہ اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ وہ لوگ کہ نکالے گئے اپنے گھروں سے ناحق، (اس جرم میں)، کہ انہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے۔

ناجائز مقاتلہ۔!

(۲)، جمہور مسلمین کا اس پہ اتفاق ہے کہ عورتوں، بچوں، راہبوں، بوڑھوں، اندھوں، بیماروں، اور اس طرح کے دوسرے لوگوں سے نہ مقاتلہ جائز ہے، نہ ان کا قتل جائز ہے اور جدال و قتال دعوتِ اسلام کا ایک جزو ہوتا، اور طرقِ دعوت میں سے ایک طریقہ ہوتا، کہ دین اسلام کا کوئی مخالف باقی نہ رہنے پائے تو ان لوگوں کو مستثنیٰ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور لوگوں کا استثنا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ قتال صرف انہی لوگوں سے جائز ہے جن کے عدوان، ظلم اور سرکشی کو دفع کرنا مقصود ہو،

اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ اس لئے مستثنیٰ کئے گئے ہیں، کہ ان کی حیثیت تو تابع کی ہوتی ہے۔ (جو ان کے بڑوں کی رائے، وہ ان کی رائے، مثلاً شوہر کافر ہے تو اس کی بیوی بھی اس کی پیروی پر مجبور ہے، باپ کافر ہے تو اولاد بھی کافر ہی ہوگی۔) تو یہ خیال عورتوں، اور بچوں کے بارے میں تو صحیح بھی ہو سکتا ہے، لیکن مستثنیات کے باقی (باقی مستثنیٰ اصحاب)، کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔؟ خصوصاً راہبوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔؟ (وہ تو اپنے دین (غیر اسلامی) کے مبلغ اور داعی کہلاتے ہیں۔

(۳) کہ یہ وسائل قہر و اکراہ دعوتِ دین کے طریقہ سے خارج

ہیں ان کا شمار دعوت کے طریقوں میں نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ دین کی بنیاد اعتقاد اور قلبی ایمان پر ہوتی ہے۔ اور یہ بنیاد دلیل و حجت پر مبنی ہو سکتی ہے نہ کہ تلوار اور نیزہ پر۔

چنانچہ خدا کا ارشاد ہے۔ لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی ـــــــ یعنی دین کے معاملہ میں جبر روا نہیں اس لئے کہ ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے"۔

اسی طرح یہ بھی فرمایا گیا کہ ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعًا افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین یعنی اگر تمہارا رب چاہتا تو اس کرہ ارض کا ہر فرد مسلمان ہوتا، کیا تم لوگوں پر جبر کرنا چاہتے ہو، یہاں تک کہ وہ سب مسلمان ہو جائیں"!

دولت اسلامیہ کی سیاست خارجیہ کے اصول

غرض اس رائے کے جو لوگ حامی ہیں، انہوں نے دولت اسلامیہ کی سیاست خارجیہ کو، اصول و قواعد ذیل پر مبنی قرار دیا ہے۔

(۱) اسلام کی طرف سے غیر مسلموں کو دعوتِ اسلام دینا، امت اسلامیہ پر فرض کفایہ ہے۔ اگر کوئی ایک جماعت پیام دعوت لیکر کھڑی ہو جائے تو یہ فرض باقی امت پر سے ساقط ہو جائے گا۔ اگر کوئی فریق بھی اس پیام کو لے کر نہ کھڑا ہو تو ساری اُمت اسلامیہ گنہ گار ہو گی۔ اس لئے کہ محمدؐ کی رسالت عام ہے، وہ خدا کی طرف سے تمام آدمیوں کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اس میں کسی اُمت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، نہ اس کا امتیاز ہے کہ کون رسولؐ کے زمانہ

گرامی ہی موجود تھا۔ اور کون ان کے اس دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد، عام ہست دبود میں آیا۔ ! رسالت سب کے لئے ہے مدعو سب ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا تھا کہ جو کچھ ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا اس کی تبلیغ فرمائیں، چنانچہ آپ اپنی حیات گرامی کے زمانہ میں دعوت و تبلیغ پر قائم رہے، اور زبان مبارک خطوط اور پیامبروں کے ذریعہ آپؐ نے برابر دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا،

خطبہ حجۃ الوداع :-! آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں خدا کو اپنی تبلیغ کا گواہ کیا تھا، اور حکم دیا تھا کہ جو لوگ یہاں اس وقت موجود ہیں، وہ آپؐ کا پیام ان لوگوں تک پہنچا دیں، جو غیر حاضر ہیں، اور موجود نہیں ہیں۔ اس فرمان کے مطابق مسلمانوں پر واجب ہو گیا کہ کسی زمانہ میں بھی اسلام کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے، اور محمدؐ پر جو کچھ نازل ہوا ہے، وہ ہر اس شخص تک پہنچا دیا جائے جس تک اسلام کا پیام نہیں پہنچا ہے۔

چنانچہ دولت اسلامیہ کے شیون خارجہ میں سے پہلی جو چیز ہے، وہ "دعوت اسلام" کی تنظیم، اور مبلغوں کا تیار کرنا ہے، اور انہیں ان ملتوں اور امتوں میں منتشر کر دینا ہے جن کا مذہب اسلام نہیں ہے اور ایسے تمام شہروں اور ملکوں میں ان کا جال بچھا دینا ہے، اور اس سلسلہ میں اپنے امکان و استطاعت کے مطابق جملہ آسانیاں اور سہولتیں بہم پہنچانا واجب اور لازمی ہے۔

غیر مسلموں سے تعلق اور علاقہ کی بنیاد؛

(۲) مسلمانوں اور غیر مسلموں میں تعلق اور علاقہ کی بنیاد

صلح و امن ہے۔ سوا اس صورت کے ایسے حالات نہ پیدا ہو جائیں. جو جنگ کو واجب کر دیتے ہوں، یا دعوت اسلام میں رکاوٹ ڈالتے ہوں، یا مسلمانوں کے حقوق اور زندگی پر چھاپہ مارتے ہوں، یا مسلمان مبلغوں اور داعیوں کی آمد پر، ان کی تبلیغ پر، اور ان کے کاموں پر ناروا پابندیاں عائد کرتے ہوں، اور جو لوگ راہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں، ان کے لئے فتنہ و شر کے دروازے کھول دیتے ہوں؛

(۳) دارالاسلام و دارالحرب"

دارالاسلام سے یہ مراد ہے وہ علاقہ جہاں اسلامی احکام نافذ ہوں اور مسلمان علی الاطلاق امن و امان میں ہوں، اور دارالحرب سے مراد وہ علاقہ ہے جن کا امن دارالاسلام کا سا نہ ہو، وہاں مسلمانوں پر، ان کے حقوق پر، ان کے مراسم پر زیادتیاں ہوتی ہیں. نیز ان کی دعوت اسلام پر، اور داعیانِ اسلام پر بھی ناروا پابندیاں عائد ہوں۔

اب ثابت ہو گیا کہ دولت اسلامیہ اور غیر مسلم حکومت کے مابین دارالاسلام اور دارالحرب کا اختلاف کیا ہے؟

اگر غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو، ان کی دعوت اسلام رد کی جا رہی ہو، اور مسلمان اس ظلم کو رفع کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے ہوں، اور اپنی دعوتِ اسلام کے لئے آمادۂ عمل ہو گئے ہوں، اور ان علاقوں سے انہوں نے تعلقات منقطع کر لئے ہوں، اور

حمایت و حفاظت کا عہد ٹوٹ گیا ہو، اور دونوں ممالک (دارالاسلام اور دارالحرب) کے رہنے والے ایک دوسرے کے ملک میں مامون نہ رہ گئے ہوں، تو یہ جائز ہے،

لیکن وہ غیر مسلم قوم جس نے مسلمانوں پر ظلم نہ کیا ہو، اور دعوتِ اسلام میں آڑے نہ آتی ہو، اور انہیں آزاد چھوڑ دیا ہو کہ وہ اپنے دین پر جس طرح چاہیں عمل کریں۔ اور جس طرح چاہیں اپنے براہین قائم کریں۔۔ نہ وہ داعی (اسلام) کے راستہ میں رکاوٹ ڈالتی ہو، نہ مدعو، (غیر مسلم) کے لئے فتنہ کا سامان پیدا کرتی ہو، تو ایسی حکومت سے نہ جدال و قتال جائز ہے نہ اس سے امن و صلح کے تعلقات کا قطع کرنا روا ہے، اس کے اور مسلمانوں کے درمیان امان ثابت ہے، اس بنیاد پر کہ اصل تو بہرحال صلح و امن ہے، اور یہ بنیاد اسی وقت ٹوٹ سکتی ہے جب مسلمانوں پر زیادتی ہو، یا ان کی تبلیغ و دعوت پر ناروا اور ناقابل برداشت پابندیاں ہوں؛

افکار و آراء کا اہم فرق، ان دونوں گروہوں کے افکار و آراء میں جو فرق ہے، اسے اگر مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں، کہ پہلے گروہ کے نزدیک جہاد اس لئے مشروع ہے کہ دعوتِ اسلام کے طریقوں میں سے ایک طریقہ بھی ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ غیر مسلم مجبور ہے کہ دینِ اسلام قبول کرے، خواہ برضا و رغبت ——— حکمت اور موعظۂ حسنہ ——— یا بہ جبر و اکراہ ——— غزوہ اور جہاد سے ———

اور دوسرے گروہ کے نزدیک جہاد اس لئے مشروع ہے کہ مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے، اسے دفع کیا جائے اور دعوتِ اسلام کے راستہ میں جو رکاوٹیں

انہیں روکا جائے۔ لیکن اگر کوئی اسلام کی دعوت نہ قبول کرے۔ اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں سے مقاومت بھی نہ کرے۔ دعوتِ اسلام کے راستے میں نہ ہو تو نہ اُس سے جدال و قتال جائز ہے اور نہ اس کے امن کو خوف سے بدلنا روا ہے۔ اس طرح پہلے گروہ کے نزدیک مسلمانوں اور غیر مسلموں میں امان کا تعلق صرف اس طرح قائم ہو سکتا ہے کہ انہیں امان عام یا خاص دے دی گئی ہو یا اُن سے کوئی عہد کر لیا گیا ہو یا انہیں ذمی بنا لیا گیا ہو اور دوسرے گروہ کے نزدیک مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جنگ قطعاً جائز نہیں ہے جب تک غیر مسلموں پر ظلم نہ کریں دعوتِ اسلام میں رکاوٹ نہ ڈالیں، داعیانِ اسلام کو تکلیف نہ پہنچائیں، نومسلموں پر عرصۂ حیات نہ تنگ کریں۔

دوسرے الفاظ میں پہلا گروہ، دارالاسلام اور دار الحرب کو اختلاف دین پر مبنی قرار دیتا ہے، اور دوسرے گروہ کے نزدیک، اختلاف اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب انقطاع عہد ہو، گویا اختلاف کی بنیاد اسلام یا عدم اسلام نہیں ہے، بلکہ امن اور وحشت ہے۔

ہر دو افکار پر محاکمہ

نظر صحیح ان لوگوں کی تائید کرتی ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے، مسلمانوں اور نامسلمانوں کے درمیان تعلق کی بنیاد مسالمت اور امان قرار دی ہے، نہ کہ حرب و قتال، سوا اس صورت کے کہ مسلمان فتنہ میں مبتلا کر دیئے گئے ہوں، ان کے دین کے معاملہ میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہوں، ان کی دعوتِ اسلام کا دروازہ بند کر دیا گیا ہو، اس صورت میں بلا شبہ مسلمانوں پر جہاد فرض ہے، کہ وہ شر کو دفع کر دیں، اور دعوت و تبلیغ کا راستہ کھول دیں۔

قرآن کریم کی چند آیتیں! اس خیال کی تائید سورہ ممتحنہ (مدنی) کی آیات سے بھی ہوتی ہے:

لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین۔ انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علیٰ اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولٰئک ھم الظٰلمون

. . . .

"ان لوگوں پر احسان کرنے سے نہیں منع کرتا، اللہ کہ جو تم سے نہیں لڑے دین کے معاملہ میں اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا، یہ کہ تم ان پر احسان کرو، ان سے انصاف کرو، بلاشبہ انصاف کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔ سوا اس کے کہ منع کرتا ہے احسان کرنے سے اُن لوگوں کے بارے میں لڑے تم سے دین کے معاملہ میں اور نکال دیا تم کو تمہارے گھروں سے اور تمہارے اخراج کے سلسلہ میں مدد کی، اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے وہ ظالموں میں سے ہے۔"

اسی طرح سورہ نساء (مدنی) میں وارد ہوا ہے:

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا . . . . یعنی، اگر وہ تم سے الگ رہیں اور تم سے مقاتلہ نہ کریں تو ان سے صلح رکھو، اللہ نے تمہارے لئے ان سے لڑنے کی کوئی صورت نہیں رکھی ہے ——"

یا سورۂ توبہ (مدنی) میں ارشاد ہوا:

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللّٰہ ..... یعنی اگر وہ
صلح پر مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔[1]

قرآن شریف کی بہت سی آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل روح، امن و صلح ہے، اور سچ پوچھئے تو یہ مستبعد بھی ہے، کہ اسلام نے مسلمانوں اور نا مسلمانوں کے درمیان ایک غیر منقطع اور دائمی جنگ کا تعلق پیدا کر دیا ہو، اور جہاد و قتال اس لئے مشروع کیا گیا ہو، کہ دعوتِ اسلام کا ایک طریقہ یہ بھی ہے یہ مستبعد یوں ہے کہ اسلام دین میں "اکراہ" کو پسند نہیں کرتا۔ وہ اسے بھی ناپسند کرتا ہے کہ لوگوں کو خلاف مرضی دین اسلام میں داخل کر لیا جائے۔ اور یہ ممکن بھی کس طرح ہے کہ جبر و جور سے ایمان پیدا ہو جائے، اور تلوار کی نوک دل تک بھی پہنچ جائے؛ دعوتِ اسلام، دعوتِ توحید اور دعوت اخلاص اللہ کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ ہے دلیل و حجت، نہ کہ تلوار و خنجر (چنانچہ اسلام کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ جب کبھی غیر مسلموں نے فتنہ و شر سے علیحدگی اختیار کئے رکھی، اور مسلمانوں کو دعوتِ اسلام میں آزاد چھوڑ دیا، تو مسلمانوں نے کبھی تلوار نہیں اٹھائی، اور کبھی اعلانِ جنگ نہیں کیا

آیات قتال کی نوعیت!

فریق اول جن آیات قتال سے دلیل لاتا ہے، وہ اس کے نزدیک مطلق ہیں، مقید نہیں ہیں لیکن یہ دلیل صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کیوں نہ تطبیق کی یہ صورت نکالی جائے کہ آیات مطلقہ کو بھی آیات مقیدہ پر محمول

[1] ترجمۂ قرآن۔ شاہ رفیع الدین مرحوم

کیا جائے ؟

مثلاً اللہ تعالیٰ نے قتال کا حکم قطع فتنہ، حمایت دعوت کے لئے دیا ہے۔ اس حکم قتال کے ساتھ کہیں سبب بیان فرمایا گیا ہے۔ اور کہیں سبب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ جہاں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ دوسری آیات میں ذکر ہو چکا ہے۔ لہٰذا یہاں سبب بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اگر آیات میں تعارض ہوتا، تو ہم یہ سمجھتے کہ آیات متاخرہ، آیات متقدمہ کی ناسخ ہیں۔

ہم آیات مقیدہ کو منسوخ بھی نہیں مان سکتے، کیونکہ جدال وقتال کا وجوب، دفع عدوان کے لئے مجمع علیہ ہے، آج تک اس وجوب کے نسخ کے بارے میں کسی نے بھی کچھ کہنے کی جرأت نہیں کی ہے۔

آیات کے تعارض، اور آیات مطلقہ سے آیات مقیدہ منسوخ ہونے کو بھی نہیں مانا جا سکتا۔ اس طرح تو بہت سی آیتیں ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گی، اور پھر نہ معلوم کتنی بہت سی آیتوں کو ہمیں منسوخ ماننا پڑے گا۔ چنانچہ اس اصول پر بعض مفسرین کے قول کے مطابق صرف آیت سے، تقریباً ایک سو بیس آیتیں منسوخ کرنا پڑیں گی، یہ وہ آیتیں ہیں جن میں عفو کی ترغیب دی گئی ہے۔ جدال حسن کا ذکر کیا گیا ہے۔ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ کی ممانعت کی گئی ہے تو کیا یہ آیتیں ایک مطلق کی وجہ سے ان حضرات کے نقطۂ نظر کے موافق منسوخ مان لی جائیں؟ یہ تو کسی طرح بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

حدیث نبویؐ سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

پہلا گروہ اپنی دوسری دلیل حدیث نبوی کہ اُمِرتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں۔ پیش کرتا ہے۔ لیکن اس سے بھی اس کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ عام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اس حدیث میں ناس سے مراد "مشرکین عرب" ہیں۔ مشرکین عرب کے علاوہ، دوسرے غیر عرب مشرکین اور اہل کتاب کے لئے دوسرا حکم ہے۔ وہ حکم یہ ہے کہ وہ اگر صلح پر مائل ہوں، اور مسالمت کی دعوت دیں، اور جزیہ دینے پر آمادہ ہوں تو ان سے صلح کی جائے۔

غرض حدیث بالا میں "ناس" سے مراد خاص طور پر مشرکین عرب ہیں، جو مسلمانوں پر ـــــ حد سے زیادہ ظلم و جور کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ وہ ان سے مقاتلہ فرمائیں، یہاں تک کہ اُن کا شر ٹوٹ جائے۔ اور ان کا وہ گھمنڈ کہ ہم تو وہی کریں گے جو ہمارے باپ دادا کرتے تھے، دُور ہو جائے۔ اور ان کی سرکشی کا زور کم ہو جائے۔ ان کے شر کو اس کے سوا کسی طرح دفع کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ کہ یا تو وہ اسلام لے آئیں، یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کچل دیئے جائیں۔

مشرکین عرب سے اگر ذرا بھی اصلاح احوال کی اُمید ہوتی تو انہیں بھی ذمی بنانے کی اجازت دے دی ہوتی۔ اور ان سے جزیہ لینا قبول کر لیا جاتا، جس طرح سے دوسرے مشرکوں کے ساتھ کیا گیا۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ حدیث ایک خاص گروہ کے بارے میں ہے اور اس میں جس "قتال" کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ دفع شر کے لئے ہے

بکہ دعوت اسلام کے لئے اور یہ قتال دعوتِ اسلام کے لئے ہوتا، توتمام مشرکوں اور کافروں سے رسول اللہؐ جہاد فرماتے، اور کسی سے صلح نہ کرتے۔

کافروں سے پیمان دوستی

اس گروہ کی تیسری دلیل یہ ہے، کہ کافروں کو دوست بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن یہ کوئی دلیل نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ اس نہی کا مورد یہ ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کافروں سے موالات نہ کی جائے۔ انہیں حلیف نہ بنایا جائے، ان کی مدد نہ کی جائے۔ لیکن اگر موالات مسالمت کی ہم معنی ہو، حسن معاملت کا مفہوم رکھتی ہو، باہمی کاروبار اور تبادلۂ منفعت اس سے مقصود ہو، تو اس کی نہ شرعاً ممانعت ہے، اور نہ یہ غیر مناسب ہے۔ اور ایسا ہو بھی کیونکر سکتا تھا۔ جب کہ خود خدائے تعالیٰ نے مسلمان کے لئے جائز کر رکھا ہے، کہ وہ کافرہ (کتابیہ) سے نکاح تک کر سکتا ہے۔ کیا شادی بغیر موالات، اور محبت کے ہو سکتی ہے؟ غرض اس سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے۔ تو یہی کہ کافر مشرک، اگر مسلمانوں سے برسرپیکار ہوں، جنگ آزما ہوں، ان پر ظلم اور زیادتی کرتے ہوں، ان سے مقاتلہ کر رہے ہوں، تو انہیں حلیف بھی نہیں بنایا جا سکتا، اور ان سے موالات بھی نہیں کی جا سکتی۔

امام رازی کا قول کافروں سے موالات کے بارے میں

امام فخرالدین (رازی) نے اپنی مشہور تفسیر میں فرمایا ہے کہ "موالات کے تین درجے ہوتے ہیں!

(۱) وہ موالات جو کفر پر راضی ہو، یہ موالات حرام ہے، اس لئے کہ

کفر کے ساتھ رضامندی بجائے خود کفر ہے۔

(۲) دنیاوی زندگی کے سلسلہ میں ایک موالات ہوتی ہے، جسے معاشرت جمیلہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کی اسلام ممانعت نہیں کرتا۔

(۳) کفار کی طرف سے یہ جانتے ہوئے کہ ان کا دین باطل اور ان کا عقیدہ غلط ہے، میلان کا اظہار ان کی امداد و اعانت ان کی حمایت اور پشت پناہی یہ بھی شرعاً منع ہے، اس لئے کہ اس صورت میں موالات کا جاری رکھنا یہ مطلب رکھتا ہے کہ گویا کافروں کا طریقہ پسندیدہ ہے اور ان کا دین اچھا ہے، یہ طرز عمل بھی تعلیمات اسلامی کے منافی ہے۔

جو علماء صلح کی سپرٹ کے مؤید ہیں، ان میں امام فخرالدین رازی بھی ہیں، چنانچہ وہ اپنی تفسیر میں لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

حب خدائے تعالیٰ نے توحید کے دلائل کو شافی اور قاطع طور پر بیان فرما دیا اور ہر عذر کو باطل کر دیا، تو فرمایا کہ ان دلائل توحید کے ایضاح و تشریح کے بعد، اب کافروں کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ کہ اپنے کفر پر قائم رہیں، پھر بھی جبر و قہر کے ساتھ انہیں مسلمان بنانا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ دنیا دارالابتلا ہے، یہاں اگر دین کے معاملہ میں قہر اور قسر سے کام لیا جائے گا، تو ابتلا اور امتحان کا مطلب ہی غلط ہو جائے گا۔ اور اس کی نظیر خدا کا یہ قول ہے کہ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ

اس تاویل کی تائید خدائے تعالےٰ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ "لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ" کہنے کے بعد "قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ" ارشاد ہوا یعنی خدا جانتا ہے کہ دلائل ظاہر ہوگئے، بینات واضح ہوگئے، اور اب بھی اگر کوئی ان دلائل اور بینات کو نہ مانے تو بظاہر اسے راہِ راست پر لانے کا طریقہ یہی ہے کہ جبر و قہر سے اسے راہِ صواب پر گام فرسا کیا جائے۔ لیکن پھر بھی اس کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ یہ طرزِ عمل "تکلیف اور ابتلا" کے منافی ہے ــــــ" [1]

امام ابن تیمیہ کے ارشادات

امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ" میں ارشاد فرمایا ہے:۔

"قتال مشروع یعنی جہاد کا مقصود یہ ہے کہ مذہب (دین) صرف خدا ہی کا باقی رہ جائے، اور خدا ہی کا کلام سربلند رہے، تو جو اس راہ کا مانع ہوگا، اس کا قتل اور اس سے قتال باتفاق مسلمین جائز ہے، اور جو لوگ اہل ممانعت و مقاتلہ نہ ہوں، ــــ مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، راہب، اندھے، بیمار وغیرہ سوا اس صورت کے کہ وہ اپنے قول یا عمل سے مقاتلہ کریں۔ جمہور علماء کے نزدیک ان کا قتل ناجائز ہے، اگرچہ بعض علماء کی یہ رائے بھی ہے کہ عورتوں اور بچوں کے علاوہ سب کا قتل صرف جرم کفر میں جائز ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر کبیر (امام رازی)

اس لئے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں ۔ اور اُن سے مقاتلہ جائز ہے،
جو ہم سے قتال پر آمادہ ہو، یا جو ہماری دعوت وتبلیغ
کے راستہ میں آڑے آتا ہو، اس سے قتال جائز ہے ۔
خدائے تعالےٰ کا ارشاد ہے ——— وَقَاتِلُوْا
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ
اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ——— یعنی اُن لوگوں سے مقاتلہ کرو
جو خدا کے راستہ میں تم سے مقاتلہ کرتے ہوں، لیکن ظلم و
زیادتی نہ کرو، ——— اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند
نہیں کرتا ۔ [1]

سنتِ رسولؐ کی تائید!

سنن رسول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔ ایک مرتبہ رسول اللہ
مقتول عورت کے پاس سے گزرے ، جو کسی غزوہ میں قتل ہوئی تھی ، اور لوگ
اس کے پاس کھڑے ہوئے تھے ، آپؐ نے پوچھا : کیا اس نے بھی مقاتلہ
کیا تھا ؟ پھر آپؐ نے ایک شخص سے فرمایا : " جاؤ ، خالد سے کہو بچوں
کو ، اور مجبوروں کو قتل نہ کریں ، اسی طرح ایک موقعہ پر سرورِ رسالتؐ نے
فرمایا : شیخ فانی طفل صغیر ، اور عورت کا قتل ناجائز ہے اس حکم کی مصلحت
یہ ہے ، کہ قتل انہی لوگوں کا جائز ہے ، کہ جن کے قتل میں بندگان خدا کی صلاح
و فلاح مضمر ہو ۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے :۔ اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ
امام رازی نے اپنی تفسیر میں سورۂ بقر کی اس آیت
" وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا " کی تفسیر

---

[1] ملاحظہ ہو السیاست الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ (ابن تیمیہ)

کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"یہ آیات مجمل ہیں ان کی تفسیر اور شان نزول پہ غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ حالت احرام میں، بلد احرام میں، شہر احرام میں، مسلمانوں کے لئے قتال اس صورت میں جائز ہے۔ کہ مشرکین خود ان پہ دراز دستی کریں۔ بشرطیکہ وہ پر سکون رہیں، اپنے عہد پہ قائم رہیں، ظلم و زیادتی نہ کریں۔"

ناسخ و منسوخ کی حیثیت!

ان آیات میں ناسخ و منسوخ کا سوال نہیں ہے۔ یہ واقعات کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اور ان کے احکام اپنی جگہ پہ قائم ہیں۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ان میں نسخ نہیں ہے۔ اور جو شخص حکم قتال کو عمومی طور پر مراد لے تو وہ ان آیات کا ایسا مفہوم مراد لے رہا ہے، جو ان کا اصل مفہوم نہیں ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیات غزوہ کے وقت نازل ہوئی تھیں، اور یہ وہ وقت تھا جب مشرکین عرب مسلمانوں پہ زیادتی کر رہے تھے۔ سورۂ انفال کی آیات غزوۂ بدر میں اتری تھیں، اس زمانہ میں مشرکین دراز دستیوں پہ تلے ہوئے تھے۔ سورۂ برأت کی آیات بھی مشرکین کے نکث عہد کے سلسلہ میں اتری تھیں، اسی لئے فرمایا:۔

— اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ — یعنی ان سے مقاتلہ ضرور کرو، جنہوں نے معاہدے توڑ دیئے اور اخراج رسول کی کوشش کی اور جنہوں نے پہل کی۔

مشرکین کا ظلم و جور

مشرکین خود مسلمانوں کو جدال و قتال پر مجبور کر
رہے تھے۔ اور اگر مسلمان آمادۂ قتل نہ ہوتے
تو مشرکین کا اعتدا اخراج رسول پر منتج ہوتا، مسلمان فتنہ میں مبتلا ہوتے
انہیں ایذا دی جاتی۔ ان کی دعوت و تبلیغ بند کر دی جاتی، ان میں سے
ہر چیز مشرکین کے اعتدا اور زیادتی کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھی
اور اس کے مقابلہ میں مقاتلہ جائز تھا۔ لہٰذا ان مواقع پر رسول اکرمؐ کا
قتال حق کی مدافعت اور دعوت حق کی حمایت کے لئے تھا۔ اسی لئے جواز
قتل کی شرط میں تقدیم دعوت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اور دعوت حجت او
برہان پر مبنی ہوتی ہے، نہ کہ تلوار اور سنگین پر۔ پس اگر کفار و مشرکین
ہمیں دعوت کا حق نہ دیں، اور قوت سے روکیں، داعی کو دھمکائیں
یا قتل کریں، تو ہم پر فرض ہے کہ حمایت دعوت اور نشر دعوت کے
لئے ہم مقاتلہ کریں، اور یہ مقاتلہ اس لئے نہیں ہوگا۔ کہ انہیں زبرد
مسلمان بنا لیا جائے۔ کیونکہ خدا اس سے منع فرماتا ہے۔

فرماتا ہے ——— لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ
مِنَ الْغَیِّ ——— یا فرمایا ——— اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا
مُؤْمِنِیْنَ ——— بلکہ اس کا حق کے لئے ہوگا، کہ ہم دا
اسلام دے سکیں۔

خواہ مخواہ جنگ نہیں کی جا سکتی

اگر یہ صورت ہو کہ دعوت اسلام
پر پابندی نہ ہو، دعاۃ کو ایذا
پہنچائی جاتی ہو، انہیں قتل نہ کیا جاتا ہو، انہیں ڈرایا دھمکایا نہ جا
مسلمانوں پر ظلم و زیادتی نہ ہوتی ہو، تو ہم پر خدا نے اس حالت

ہرگز قتال فرض نہیں کیا ہے۔ کہ ہم خواہ مخواہ خدا کے بندوں کا خون بہائیں، لوگوں کے جسم وجان کا رشتہ منقطع کریں۔ یا کسی اور طمع کے سبب حرب وپیکار پر آمادہ ہوں۔

صحابہ کی لڑائیاں

صدر اول میں حروب صحابہ پر غور کیجے، تو معلوم ہوگا کہ صحابہ نے جتنی لڑائیاں لڑیں، وہ سب صرف حمایت اسلام کے لئے تھیں، اس لئے تھیں، کہ مسلمان کفار ومشرکین کے ظلم وجور سے محفوظ رہیں، اس لئے نہیں تھیں کہ مسلمان خود ظلم کریں؛

روم والے بلادعربیہ کی سرحدوں پر دھاندلی مچایا کرتے تھے۔ جو شخص اسلام قبول کرلیتا تھا اسے طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے۔

فارس کے لوگ ان سے بھی دو قدم آگے بڑھے ہوئے تھے۔ یہ وہ تھے۔ جنہوں نے رسول اللہ کے مکتوب گرامی کو پھاڑ ڈالا تھا۔ دعوت اسلام رد کردی تھی، مسلمانوں کو شدید ایذائیں پہنچاتے تھے، اسلام کے قاصد قتل کر دھمکی دی تھی۔ غرض اسی طرح کی بہت سی حرکتیں کرتے رہتے تھے، لہٰذا ان کے خلاف تلوار اٹھانا۔ لازمی اور ضروری تھا؛

قوی اور ضعیف کی کشمکش

اس کے بعد فتوحات کو لیجئے، تو معلوم ہوگا، کہ قوی اپنے کمزور پڑوسی پر دست ظلم دراز کرتا تھا، کوئی بھی غالب قوم، مغلوب قوم کے ساتھ رحم وکرم کا برتاؤ نہیں کرتی تھی۔ دنیا کی کوئی قوم عربوں کے مقابلہ میں نہیں پیش کی جاسکتی تھی۔ جس نے اپنے فتوحات کے دور میں ضعیف اور کمزور اقوام کے ساتھ عربوں سے زیادہ رحم وشرافت کا سلوک کیا ہو، اور اس کی

شہادت خود علمائے فرنگ دیتے ہیں۔

غرض قتال کے بارے میں صاف بات یہ ہے، کہ جہاد و دفاع
حق حمایت دعوت اور نصرت دین کے لئے فرض کیا گیا ہے۔

ہماری ان تصریحات سے ثابت ہو گیا کہ اعداء اسلام کا یہ دعو
بالکل جھوٹ ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ اور حیا بلوں اور متعص
کا یہ قول بھی غلط ہے کہ اسلام دین الٰہی نہیں ہے، کیونکہ خدا نے رحمٰن و
خون ریزی کی اجازت نہیں دے سکتا، نیز اسلام کے دشمنوں کا یہ دعو
بھی مہمل ثابت ہو گیا کہ عقائد اسلامیہ مدنیت و حضارت کے لئے ایک مستق
خطرہ ہیں، اسلام تو سارے جہان کے لئے رحمت عامہ ہے، اور بس۔

اسلام اور جنگ

جدال و قتال اور جنگ و پیکار کے احکام و ہدایات

افراد و اشخاص ہوں، یا اقوام و ملل ان کی سیرت اور کردار کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ برسرِ جنگ ہوں، صلح و امن کی حالت میں ہر شخص رحم دل اور بااخلاق نظر آتا ہے، لیکن لڑائی کی صورت میں اس کا چہرہ خوفناک ہو جاتا ہے۔ اور اس کے افعال میں درندگی اور بہیمیت آ جاتی ہے۔ بالکل یہی حال قوموں اور ملتوں کا ہے۔ جب تک امن و صلح کی کیفیت قائم ہے، وہ آئینِ مدنی کا احترام کریں گی۔ قانون و دل کو ملحوظ خاطر رکھیں گی۔ خونریزی اور عہد شکنی سے اجتناب کریں گی، تعذیبِ انسانی اور تعزیر و انتقام کا خیال بھی دل میں نہ لائیں گی۔ لیکن اگر کسی قوم سے ان کی جنگ چھڑ جائے۔ تو پھر انسانیت کا جامہ اتار کر وہ میدانِ جنگ میں کود تی ہیں، پھر نہ انسانیت کا احترام باقی رہ جاتا ہے، نہ اصولوں کا پاس، نہ عہد و پیمان کا لحاظ، پھر ہر بے اصول جائز ہو جاتا ہے، ہر عہد شکنی میں ثواب بن جاتی ہے، ہر ننگ انسانیت حرکت، ضروری اور ناگزیر صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر دشمن کے ساتھ جتنا جتنا، لرزہ خیز اور ہولناک برتاؤ کیا جائے۔ وہ عین انسانیت ہے۔ پھر "دشمن" کو شکست دینے، ہلاک کرنے، اور برباد کر ڈالنے کے سلسلہ میں جو کچھ بھی کیا جائے وہ کم ہے، پھر رحم کا برتاؤ بزدلی ہے، انسانیت کا اظہار قوم سے

غداری ہے۔ نرمی اور ملاطفت کا سلوک، بے حیائی اور بے غیرتی ہے جنگ کی صورت میں ان لوگوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا ہے۔ جو جنگ سے الگ تھلگ رہتے ہیں یعنی شہری باشندے، فوجیں میدان میں لڑتی ہیں، وہاں جتنی بھی خونریزی ہو کم ہے۔ لیکن عہد جدید کا جنگی اصول یہ ہے، کہ دشمن سپاہیوں سے زیادہ دشمن شہریوں کو ہدف مظالم بنایا جاتا ہے، تاکہ اس واویلا میں دشمن قوم کا حوصلہ ٹوٹ جائے۔ اور وہ اپنی حکومت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے، جب امریکہ اور جاپان میں لڑائی ہو رہی تھی، تو ہیروشیما کے باشندے، ایک شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن ایٹم بم نے انہیں آن کی آن میں ختم کر دیا، کس قدر عجیب و غریب واقعہ ہے۔ میدانِ جنگ میں ایٹم بم نہیں پھینکا گیا۔ جہاں مسلح دشمن لڑ رہا تھا، وہاں پھینکا گیا، جہاں جنگ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بڈھے، عورتیں، بچے، بیمار۔ ان لوگوں کا جنگ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، یہ جنگ میں حصہ بھی نہیں لے سکتے۔ ان میں اتنی سکت بھی نہیں ہوتی کہ اپنی مدافعت کر سکیں، اس کے باوجود جنگ کی تلوار ان کی گردن پر بھی چلتی ہے۔ جنگ کا نیزہ ان کا سینہ بھی چھیدتا ہے جنگ کی شقاوت انہیں بھی نہیں معاف کرتی، اور جنگ کا دیوا انہیں بڑی بے دردی سے، اپنے تنورِ شکم کا ایندھن بنا لیتا ہے، اور اس طرح انسانیت تڑپتی رہتی ہے، سسکتی رہتی ہے، کوئی اس پر رحم نہیں کرتا، کوئی اس کا خیال نہیں کرتا، کسی کو اس کی بے بسی پر ترس نہیں آتا۔

عہد جدید یعنی عہد تہذیب و تمدن سے پہلے، تو حالت اور زیادہ ابتر تھی، اس وقت تک تو انسان پر حقارت اور ہزیمت کا وہ ملمع بھی

نہیں چڑھا تھا۔ جو آج نظر آتا ہے۔ وہ بالکل برہنہ اور عریاں تھا، نہ اپنے جذبات کو چھپانے پر قادر تھا، نہ اپنی نفسی کیفیت پر پردہ ڈال سکتا تھا۔ بے جھجک، اور بلے تامل، وہ اصول شکنی کرتا تھا۔ عہد و پیماں توڑ ڈالتا تھا۔ اور پوری درندگی کے ساتھ، پوری سفاکی اور خوں آشامی کے ساتھ وہ اپنے ہم جنسوں یعنی انسانوں کو انتقام اور تعزیر و تعذیب کا نشانہ بناتا تھا۔ نہ بچوں پر رحم کرتا تھا، نہ عورتوں کے ساتھ رعایت کرتا تھا، نہ بوڑھوں کا لحاظ کرتا تھا، اور نہ بیماروں پر اسے ترس آتا تھا۔ جو سامنے آگیا وہ ہدف ستم بنا۔ جس پر ہاتھ پڑ گیا۔ اس کی گردن سلامت نہ رہ سکی۔ جو گرفتار ہوا، وہ قید حیات سے چھوٹا؛

دنیا کی وہ قومیں اور ملتیں، جو آج بام عروج پر پہنچی ہوئی ہیں، اور جو آج بھی مہذب قسم کے جرائم ہیں، اتنی ہی جری اور بیباک ہیں، جتنے عہد بربریت میں ان کے آبا، اور اسلاف، جنگ آج بھی، ان کے کردار اور سیرت کو جانچنے کا بہترین معیار ہے۔ جنگ شروع ہوئی، اور یہ حقیقت نظر کے سامنے آئی۔ کہ جن لوگوں کا چہرہ روشن اور تابناک نظر آتا ہے۔ نقاب اٹھ جانے کے بعد وہ کتنے بھیانک اور خوفناک نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر ان میں کسی طرح کی معقولیت نظر ہی نہیں آتی۔ پھر وہ سراپا شقاوت اور قساوت بن جاتے ہیں ——!

دنیا کا آج بھی یہی حال ہے۔ اور آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے بھی یہی حال تھا۔ تبدیلی جو کچھ ہوئی ہے وہ صرف ظاہر میں ہوئی ہے۔ پہلے انسان کو خوں آشامی اور سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شرم نہیں آتی تھی، لہٰذا، بغیر عذر و معذرت کے وہ درندہ بن جاتا تھا، اب

سفاکی اور خوں آشامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسان شرماتا ہے، البتہ
جب درندہ بنتا ہے تو اس درندگی کی توجیہہ کرنی پڑتی ہے اسے جائز
ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اس کاروائی کا مقصد ضمیر کو اور دنیا کو فریب دینا
ہوتا ہے۔ ورنہ کسی دلیل یا توجیہ سے ظلم کو رحم ثابت نہیں کیا جا سکتا۔
ظلم، ظلم ہی ہے، خواہ اس کے بین دلیل، کتنے ہی خوشنما الفاظ کے گورکھ
کیوں نہ موجود ہوں۔

لیکن اس سارے دور میں اسلام ایک ایسا دین نظر آتا ہے، جس
نے جنگ و پیکار کے سلسلہ میں واضح ہدایات دیئے۔ اور بڑی سختی کے
ساتھ اپنے پیروؤں سے ان پر عمل درآمد کرایا۔ ان ہدایات میں
اس بات کا پورا لحاظ رکھا، کہ کسی پر ظلم نہ ہونے پائے۔ کوئی زیادتی کا
نشانہ نہ بنے، عدل اور انصاف کا اصول کبھی اور کسی حالت میں بھی
ٹوٹنے نہ پائے۔ حالات خواہ کیسی ہی بدترین، اور اشتعال انگیز اور
جذبات کو ہیجان میں لانے والی صورت اختیار کر لیں۔ لیکن جوابی یا
انتقامی طور پر بھی ایسا رویہ نہ اختیار کیا جائے۔ جو انسانیت کے اعلیٰ
اصولوں کو مجروح کرتا ہو، جس سے انسانی حیات و اقدار پہ حرف آتا ہو، یا
بعد میں ندامت اور پشیمانی کا موجب بن سکے۔

یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم قوموں کی تاریخ جنگ، بلکہ تاریخ حیات
ظلم اور سفاکی، شقاوت اور قساوت، سفاکی اور درندگی، بہیمیت اور
بربریت کے لرزہ خیز حوادث سے بھری پڑی ہے۔ خواہ وہ عہد تنزل
ہو، یا دور عروج کی روشن خیالی۔ لیکن اسلام کے دامن پر اس طرح
کے دھبے کہیں نظر نہیں آتے، جب اس کا طنطنہ ساری دنیا پر چھایا ہوا

تھا، اور دنیا کے ممالک اس کی تحویل میں آرہے تھے، جب اس کا پرچم دنیا کے ایک بڑے حصہ پر لہرا رہا تھا۔ اور فتوحات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، اس کی ساری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا، جو اس کے بنائے ہوئے اصولوں کے خلاف ہو، جس سے انسانیت کی فلاح و اصلاح پر حرف آتا ہو، اس نے جنگ کے میدان میں بھی، عدل و انصاف، اور رحم و کرم کو اپنا اصول رکھا، اور پھر بعد میں مفتوحوں اور محکوموں کے ساتھ بھی اس کا اصول ایسا رہا، کہ وہ اپنی قوم، نسل اور مذہب کو چھوڑ کر، اسلام کے حلقہ بگوش بنتے چلے گئے۔ اس نے کسی موقعہ پر بھی یہ گوارا نہیں کیا کہ کمزور دل کو مارے، بے بسوں کو ہلاک کرے۔ محکوموں کو لوٹ لے اور تباہ کر دے۔ یہ اس کا ایسا شاندار کارنامہ ہے، جس کا اعتراف دشمن اور مخالف بھی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اور اس کی یہی خصوصیت ہے، جس نے انتہائی ناموافق اور ناسازگار حالات میں بھی اسے سربلند رکھا۔ اس کے اتحاد اور شان میں فرق نہیں آنے دیا، یہی وہ چیز ہے، جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ اور دوسری قوموں کے لئے اس کے کردار کی یہ جھلک آج بھی مایۂ تقلید اور موجب پیروی ہے، جس پر عمل کر کے آج بھی دنیا کو مصیبتوں اور ہلاکتوں کے طوفان سے بچایا جا سکتا ہے۔

اسلام نے جنگ و پیکار اور جدال و قتال کی اجازت صرف دفع دشمن اور قلع قمع فتنہ کے لئے دی ہے، جنگ کی صورت میں بھی اسلام نے تخفیف مصائب کے سلسلہ میں جو مراعات احکام صادر کئے ہیں، وہ ان کے مقابلہ کہیں بہتر و برتر ہیں، جو انسانی رحم و کرم پر مبنی ہیں۔

یہ احکام متعدد پہلوؤں سے قانون بین الاقوامی کے احکام سے متفق ہیں، نہ صرف متفق بلکہ ان سے برتر اور اعلیٰ ہیں، البتہ اختلاف جو کچھ ہے وہ صرف یہ ہے کہ احکام دینی اور شرعی حیثیت بھی رکھتے اور ان کی تنفیذ میں مسلمان کی قوت یقین اور اس کا ایمان بھی کارفرما ہے جس طرح سے اور دوسرے احکام میں یہی جذبہ نظر آتا ہے اس کے برعکس دوسروں کے ہاں یہ چیز مفقود ہے۔

قانون بین الاقوامی کے احکام میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے لئے قوت تنفیذیہ نہیں ہے، جو ان کی بجا آوری کی ضامن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مفکرین احکام دولیہ کو ایسا قانون کہتے ہیں جو ناقص کے اقسام میں سے ایک ہے، یہ قانون صرف اس صورت میں نافذ ہو سکتا ہے کہ کوئی قوت اس کی حمایت، حفاظت اور تنفیذ کے لئے موجود ہو جس سے احکام کو کسی حالت میں رد نہ کیا جا سکے۔

اسلام کے جنگی احکام

برعکس ازیں اسلام کے احکام اور احکام حربیہ ایک طرف تو عدل و رحمت کے آئینہ دار ہیں، دوسری طرف مسلمان کی قوت ایمان ہے، جو ان کے اور اجرا کی ضامن ہے، اور اس سلسلہ میں کسی طرح کی خیانت کی بھی نہیں۔

اس سلسلہ میں حدیث ذیل بھی پیش نظر رہنی چاہیئے۔

سلیمان بن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ "

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِذَا أَمَّرَ أَمِيْرًا عَلٰى جَيْشٍ أَوْ سَرِيَّةٍ أَوْصَاهُ فِيْ خَاصَّةٍ بِتَقْوَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَمَنْ مَعَهُ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرًا ثُمَّ

غزوا باسم اللہ فی سبیل اللہ قاتلوا من کفر باللہ اغزوا ولا
تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ۔ ولا تقتلوا ولیدا واذا لقیت
عدوک من المشرکین فادعھم الی احدی خصال ثلاث
فایتھن ما اجابوک الیھا فاقبل منھم وکف عنھم ، ادعھم
الی الاسلام فان اجابوک فاقبل منھم وکف عنھم ، ثم
ادعھم الی التحول من دارھم الی دار المھاجرین واعلمھم
انھم ان فعلوا ذلک ان لھم ما للمھاجرین وعلیھم ما علی المھاجرین
فان ابوا ان یتحولوا منھا فاخبرھم انھم یکونون کاعراب
المسلمین یجری علیھم حکم اللہ الذی یجری علی المومنین
ولا یکونون فی الفیء والغنیمۃ نصیب الا ان یجاھدوا مع المسلمین
فان ابوا فاسألھم الجزیۃ فان اجابوک فاقبل منھم وکف
عنھم واذا حاصرت اھل حصن فارادوک ان تجعل لھم
ذمۃ اللہ وذمۃ نبیہ فلا تجعل لھم ذمۃ اللہ وذمۃ نبیہ
ولکن اجعل لھم ذمتک وذمۃ اصحابک فانکم ان تخفروا
ذممکم وذمۃ اصحابکم خیر من ان تخفروا ذمۃ اللہ
وذمۃ نبیہ واذا حاصرت اھل حصن فارادوک ان تنزلھم
علی حکم اللہ فلا تنزلھم فانک لا تدری اصبت حکم اللہ
فیھم ام لا ، ثم اقضوا فیھم بعد ما شئتم "

احکام شرعی نقطۂ نظر سے — اس حدیث کی بنیاد پر اسلام کے حربی احکام شرعی نقطۂ نظر سے حسب ذیل ہوں گے ۔ ان کا تقابل ہم بین الاقوامی قوانین سے کرتے

جائیں گے۔

(۱) قوانین بین الاقوامی میں سے ایک اہم قانون یہ ہے کہ اگر حکومت کسی دوسری حکومت کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر مجبور ہو تو اس پر واجب ہے کہ باقاعدہ اعلانِ جنگ کرے۔ اور اس کی رعایا کو اپنے ارادۂ جنگ سے مطلع کر دے۔ اس اعلان کی غرض یہ ہے کہ اچانک حملہ نہ ہو، اور بد عہدی نہ ہو، اگرچہ یہ قانون صرف قانون ہے اس پر عمل در آمد ضروری نہیں۔

اب شرعِ اسلامی کو ملاحظہ فرمائیے۔ کفار سے مقاتلہ کرنے سے پیشتر مسلمانوں پر واجب ہے کہ انہیں باقاعدہ دعوت دیں، وہ دعوت اگر رد ہو جائے تو جنگ کریں۔

امام ابو یوسف کا قول ہے کہ: ــــــ "لم یقاتل رسول اللہ قوما قط فیما بلغنا حتی یدعوھم الی اللہ و رسولہ" ــــــ

"یعنی رسالت مآب نے جب تک خدا اور رسول کی طرف دعوت نہیں دے لی، کسی سے جنگ نہیں کی" ــــــ صاحبؒ الاحکام السلطانیہ کا قول ہے ــــــ

ومن لم یبلغھم دعوۃ الاسلام یحرم علینا الاقدام ویحرم ان یبدئھم بالقتال قبل اظہار دعوۃ الاسلام لھم و اعلامھم من معجزات النبوۃ و من ساطع الحجۃ

جب تک دعوت اسلام نہ دے لی جائے اس وقت تک ہمارے لئے جائز نہیں ہے کہ اقدام اور حملہ کریں یہ بات قطعاً حرام ہے کہ دعوت اسلام دینے سے پہلے ہم جنگ کا آغاز کریں ضروری ہے کہ پہلے ان پر اتمام حجت

بما یقودھم الی الاجابۃ۔ کرلیں، جو قبول اسلام کی موجب ہو۔

اسلام میں اس بات کا یہاں تک لحاظ رکھا گیا ہے کہ امام کو حق ہے کہ اگر وہ ضرورت سمجھے اور مصلحت دیکھے، کہ دشمن سے صلح کا توڑنا ضروری ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن کس طرح؟ اس طرح کہ تحت صلح کا اعلان دشمن کے ایک ایک چپۂ اور گوشہ میں پھیلا دے۔ وہ اس وقت تک قتال نہیں کر سکتا، جب تک دشمن کے ہاں تحت صلح کی خبر خوب شائع و ذائع نہ ہو جائے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ دشمن پر بھی اچانک حملہ نہ ہو، اور اس سے بدعہدی نہ کی جائے۔ اور وہ اس حالت میں آجائے جو صلح سے پہلے تھی۔

غیر جنگ جو طبقہ

(۲) قوانین دولی میں سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ جو لوگ غیر فوجی ہوں انہیں دشمن نہ سمجھا جائے۔ اور انہیں تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ لیکن قانون بھی صرف زینت قرطاس ہے۔ ورنہ اس پر عمل درآمد کا یہ حال ہے کہ غیر جنگجو لوگوں کو بدترین دشمن سمجھ کر انہی کو زیادہ سے زیادہ ہدف ستم بنایا جاتا ہے۔

لیکن شریعت اسلامیہ نے کوئی مجمل بات نہیں کی ہے۔ بلکہ صاف صاف کہہ دیا ہے کہ عورتوں اور بچوں، راہبوں یا ویدیوں، بوڑھوں، بیماروں، اور نکموں کا قتل قطعاً ناجائز ہے، نیز جو لوگ جنگ آزما نہ ہوں انہیں بھی قتل نہ کرنا چاہیئے، اور اس قانون پر، اسلامی حکومت نے ہمیشہ سختی سے عمل درآمد کیا۔

(۳) قوانین دولی میں سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ بیمار دل اور

زخمیوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا جائے۔ شناخانوں کی حفاظت کی جائے۔ مریضوں اور ڈاکٹروں کی مدد کی جائے۔ مریضوں اور زخمیوں کو ڈھونے والی فوجوں کی بھی اعانت کی جائے۔

اس قانون کی معقولیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اصل سوال یہ نہیں ہے کہ قانون درست ہے یا نہیں؟ اصل سوال یہ ہے کہ اس قانون پر عمل درآمد کس طرح ہوتا ہے۔؟ اور آیا عمل درآمد ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ یہ قانون کتاب آئین میں درج ہے۔ لیکن جنگ کے دوران میں عملی طور پر، یہ معطل ہوتا یہ ہے۔ کہ نہ شفاخانے بمباری سے محفوظ رہتے ہیں۔ نہ مریض، نہ ان کی تیمارداری کرنے والے لوگ، ان سب کو اس طرح نشانۂ جور و ظلم بنایا جاتا ہے۔ جس طرح میدانِ جنگ میں لڑنے والے سپاہیوں کو رعائت، مروت، رحم، یہ وہ الفاظ ہیں، جو ہرگز بیماروں اور طبّی امداد پہنچانے والوں کے کام نہیں آتے۔

شریعت اسلامیہ نے "وصفا" اور "عسفا" کے قتل سے سختی سے منع کیا ہے، اول الذکر اصطلاح مملوک کے لئے ہے اور، ثانی الذکر خدمت کرنے والوں کے لئے، اس میں وہ لوگ بھی آ گئے، جو زخمیوں اور بیماروں کی تیمارداری کرتے ہیں، ان کی ضرورتیں پوری کرنے ہیں ان کا غم بٹاتے ہیں، انہیں دکھ اور پریشانی کی حالت میں مدد دیتے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا یہ رعائت اسلامی حکومت نے کبھی واپس لی ہو یا

معطل کی ہو۔

عذاب دینے کی ممانعت

(۴) قوانین دولی میں سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ زخمیوں کو تکلیف نہ دی جائے۔ دشمن کو عذاب نہ دیا جائے۔ ایسے آلات واسلحہ نہ استعمال کئے جائیں، جن سے تعذیب میں اضافہ ہوتا ہو، کنویں میں، نہروں میں اور کھانے پینے کی چیزوں میں زہر نہ ملایا جائے۔

اس قانون کے بھی دل خوش کن ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن عہد مظلم کو چھوڑیئے۔ اس روشن خیالی اور عروج انسانیت کے اس دور میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اس اصول کا احترام رکھا گیا ہو، اس کا لحاظ رکھا گیا ہو، اور اسے عملی جامہ پہنایا گیا ہو۔ اگر عمل ہوا، تو اس طرح کہ، نت نئی، انسانیت سوز چیزیں ایجاد کی گئیں، جراثیم پالے گئے، ان کی پرورش اور نگہداشت کی گئی۔ جب ہلاکت آفرینی کا فریضہ انجام دینے کے لئے ان کی تعداد حد سے زیادہ فزوں ہوگئی، تو انہیں عوام پر چھوڑ دیا گیا، طرح طرح کی گیسیں ایجاد کی گئیں، ان کا سلسلہ اس کے سوا کیا تھا کہ انسان سسک سسک کر مرے اور مٹ جائے۔

رسول اللہ صلعم نے دھوکے اور مثلہ سے منع فرمایا ہے -اور فرمایا ہے —— لَا تُعَذِّبُوْا عِبَادَ اللّٰہِ —— یعنی اللہ کے بندوں کو عذاب نہ دو —!

البتہ شریعت اسلامیہ میں وضاحت کے ساتھ ان لوگوں کے قتل کی ممانعت کی گئی ہے جو جنگ سے الگ تھلگ ہوں، اس کی بھی ممانعت کی گئی ہے، کہ زندہ یا مردہ کو آگ میں جلایا جائے۔ اس کی بھی ممانعت کی گئی ہے، کہ فصلوں کو، پھلوں کو، کھیتوں کو خراب اور

ا۔ دشمن کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کرنے کو مثلہ کہتے ہیں۔

ناکارہ بنایا جائے ۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کے ان ہدایات پر ان ملوک و سلاطین نے بھی سختی سے عمل کیا۔ جن کا برتاؤ خود مسلمانوں کے ساتھ یعنی اپنی قوم اور ملت کے ساتھ حد درجہ بہیمانہ اور سفاکانہ تھا۔ حجاج بن یوسف ثقفی کتنا بڑا خول آشام انسان تھا۔ اس نے ہزارہا مسلمانوں کو بے جرم و خطا موت کے گھاٹ اتارا، انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیں، لیکن اس کے سارے دورِ حیات میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اس نے غیر مسلموں پر ظلم کیا ہو، بلکہ ملتی ہے تو یہ کہ اس نے باہر فسادت و سنگ دلی غیر مسلموں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا۔

محصورین جنگ کے ساتھ سلوک

(۵) قانون دولی نے اسے جائز ٹھہرایا ہے، کہ محصورین کو اتنا تنگ اور پریشان کیا جائے کہ وہ تسلیم و اطاعت پر مجبور ہو جائیں،

یہی ایک ایسا قانون ہے، جس پر نہایت خلوص اور بیباکی کے ساتھ دنیا کی ترقی یافتہ قومیں، دوران جنگ میں عمل کرتی ہیں، اور محصورین کو زچ کرنے اور پریشان کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتیں، اور محصورین کو اس طرح تنگ کیا جاتا ہے بلکہ، اسطرح تعذیب کا شکار بنایا جاتا ہے، کہ وہ اپنی جان سے عاجز آ جاتے ہیں، اور ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہ جاتا ہے کہ حد درجہ ذلت اور رسوائی کے ساتھ اپنے آپ کو دشمن کے حوالہ کر دیں۔

شریعت اسلامیہ نے حصار دشمن کی حالت میں، بان اور منجنیق استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، اور ہر ایسے کام کی اجازت دی ہے، جو فتح و ظفر میں ممد و معاون ہو لیکن یہ بھی کہدیا ہے کہ دشمن کے درخت

نہ ڈالے جائیں، اس کا پانی زہرآلود نہ کیا جائے۔

یہی نہیں، بلکہ محصورین کے ساتھ یہ رعایت رکھی ہے کہ وہ اگر حصار سے تنگ آجائیں، اور ذرہ صلح و مفاہمت کی طرف مائل ہوں، تو محاصرہ اٹھایا جائے۔ اور معتدل و نرم شرائط پر صلح کر لی جائے۔ تاریخ اسلام میں اس طرح کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، کہ مسلمانوں نے مغلوب و عاجز دشمن سے جب صلح کی تو اپنے شرائط نہیں ٹھونسے، بلکہ خود اس کے پیش کئے ہوئے شرائط پر صلح کر لی۔ اور اسے عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کا موقعہ دیا۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے دھوکہ کی اجازت نہیں دی ہے۔ اثنا، قتال کے لئے جو احکام اسلام نے دیئے ہیں، ان سے بھی تخفیف ویلات مخصوص ہے۔ مثلاً یہ کہ مثلہ نہ کیا جائے، عذاب نہ دیا جائے، ضروریات زندگی کا اتلاف نہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ اگر مسلمانوں کے دشمن مثلہ کریں، یعنی کسی مسلمان پر قابو پاکر، اس کے ہاتھ، پاؤں، ناک کان، کاٹ ڈالیں تو افضل یہ ہے کہ اس تکلیف دہ مثال کی پیروی نہ کی جائے۔ یعنی مستحسن یہ ہے کہ مسلمان کے قبضہ میں اگر دشمن کا کوئی آدمی آجائے، تو اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جائے۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ غزوۂ احد میں جب مشرکین نے حضرت حمزہ رض بن عبدالمطلب رض ——— کا مثلہ کیا، تو رسول اللہ نے فرمایا ——— لئن اظفرنی اللہ بہم لامثلن بضعفی ما مثلوا بنا ——— یعنی اگر خدا نے مجھے ان پر غالب کیا تو اس کا دوگنا مثلہ کروں گا، جتنا انہوں نے ہمارا کیا تھا۔ ——— اس پر قرآن میں وارد ہوا ہے:۔

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم

لھوخیر للصابرین، واصبر وما صبرك الا باللہ

یعنی اگر تمہیں اذیت دی جائے۔ تو تم بھی اتنی ہی اذیت سکتے ہو، جتنی تمہیں پہنچائی گئی تھی، اور اگر تم صبر کرو تو صبر کرنے کے لئے وہ بڑی اچھی چیز ہے۔ ——— پھر رسول اللہ نے ''بل نصبر ——— ہاں ہم صبر ہی کریں گے۔

عمران بن حصین کا قول ہے کہ رسول اللہ نے ہمارے سامنے خطبہ ایسا نہیں دیا، جس میں ہمیں صدقہ کا حکم نہ دیا ہو، اور مثلہ کی نہ فرمائی ہو"

ان احکام کی بنیاد یہ ہے کہ اسلام نے قتال وجہاد کو مشروع خدا کے بندوں پر عذاب، اور مصیبت نازل کرنے کی ہدایت ہے۔ بلکہ اس سے مقصد صرف یہ قرار دیا ہے کہ شر کا دفعیہ ہو، کی حفاظت ہو، اسلام کی دعوت میں کوئی رکاوٹ نہ پیش آئے تو ایک وسیلہ ہے، جسے صرف ضرورت ہی کے وقت استعمال کیا ہے۔ اور اس کے معمولی سے معمولی حدود و شرائط کو نظر انداز کیا جا سکتا؛

خدائے بزرگ و برتر نے، جب اپنے رسولؐ کو مبعوث فرمایا انہیں حکم دیا، کہ وہ خلقِ خدا کو دین کی دعوت دیں۔ لیکن انہیں تک قتل و قتال کی اجازت نہیں دی، جب تک مسلمانوں پر مظالم نہیں ہوئے۔ انہیں گھر سے بے گھر نہیں کیا گیا، خواہ مخواہ ان مال و دولت کو تباہ و برباد نہیں کیا گیا۔ جب یہ سب کچھ ہو لیا، تب تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ :-

اُذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا وانّ اللہ علی نصرھم

ترجمہ ——— "یعنی جن لوگوں پر ظلم کیا گیا، انہیں مقابلہ کی اجازت دی
گئی اور بلاشبہ اللہ ان کی مدد پر قادر ہے ———.

مقابلہ اور موازنہ

اوپر کی سطروں میں قوانین دولی اور قوانین اسلام
کو پہلو بہ پہلو پیش کیا گیا ہے، ان دونوں کو
سامنے رکھکر بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ دنیا کے مدبرین نے
گ و پیکار کے سلسلہ میں جو قوانین بنائے ہیں، وہ اس لئے ناکام ہیں،
ان کی تنفیذ خود ان کے ہاتھ میں ہے، وہ ان کی تنفیذ کے سلسلہ میں، کسی
سامنے جواب دہ نہیں ہیں، اس کے برعکس مسلمان ان قوانین پر
رنے پر اس لئے مجبور ہیں، کہ وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہیں، ان
ین پر عمل نہ کریں تو گنہگار ہوں گے، انسان اپنے بنائے ہوئے آئین
رانداز کر سکتا ہے، لیکن اگر اس آئین کے بارے میں یہ عقیدہ ہو کہ وہ خدا
ہے تو پھر اس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی، مسلمانوں میں یہ قانون اس لئے کامیاب
غیر مسلموں کے ہاں اس لئے ناکام۔!

غزواتِ نبوی

اِسلام کے جنگی احکام غزواتِ نبویؐ کی روشنی میں

گزشتہ صفحات میں تفصیل سے یہ بات ذہن نشین کرائی جا چکی ہے کہ جنگ و پیکار کے سلسلہ میں اسلام کے احکام و ہدایات کیا ہیں، اور یہ احکام و ہدایات نظری اور عملی طور پر ان قوانین سے کتنے مختلف، کتنے شائستہ اور کتنے انسانیت نواز ہیں، جو دنیا کے مدبرین نے اپنی فہم و خرد کے مطابق بنائے ہیں۔ اور جن پر دیانت داری سے وہ کبھی بھی عمل نہ کر سکے، نہ ماضی میں، نہ حال میں، اور شاید نہ مستقبل میں عمل کر سکیں گے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام و ہدایات کے بعد ایک بہت ہی مختصر سا خاکہ غزوات نبوی کا پیش کر دیا جائے؛ تاکہ معلوم ہو سکے کہ خدا کے ان احکام پر کہاں تک عمل کیا گیا۔

اس سلسلہ میں اسلامی اور مسلمانوں کی تاریخوں سے استفادہ کرنے کے بجائے ایک فرانسیسی مستشرق موسیو سدیو کا لکھا ہوا خاکہ ہم پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ضمناً یہ بھی معلوم ہو سکے کہ غیر مسلم اہل علم بھی ہمارے اس دعوے کو تسلیم کرتے ہیں۔

ہجرت | جب قریش کو یہ معلوم ہوا کہ مدینہ میں رسول اللہ صلعم کے انصار و مددگار ہیں، اور مکہ کے مسلمان بھی وہاں چلے گئے

ہیں ۔ تو انہیں اندیشہ پیدا ہوا، کہ کہیں آپ بھی مدینہ نہ چلے جائیں، سب نے مل کر اس باب میں مشورہ کیا اور یہ رائے قرار پائی، کہ آپ کو قتل کر دیا جائے ۔ مگر سب قبائل کے آدمی متفق ہو کر ایک دم سے ماریں، کہ آپ کا خون سب کے ذمہ عاید ہو جس کا مقابلہ اور انتقام دشوار ہو جائے ۔ جبریلؑ نے آکر سب حال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا، کہ وہ آپ کی چادر مبارک اوڑھ کر آپ کی جگہ پہ سو رہیں، اور جن جن لوگوں کی امانتیں آپ کے پاس تھیں وہ بھی ان کے حوالے کر دیں، کہ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیں ۔ پھر خود آپ مکان سے باہر نکلے، دشمن دروازہ پر منتظر تھے، آپ نے سورہ یٰسٓ پڑھنا شروع کی ۔ اور فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (ہم نے انہیں ڈھانک لیا، اور وہ نہیں دیکھتے) پہنچ کر اسے دہراتے گئے، اور سب اعدا کے سروں پہ خاک ڈال کر نکلے، چلے گئے کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ آپ کب گئے ۔

اپنے مکان سے نکل کر آپ حضرت ابوبکرؓ کے مکان پہ گئے اور ان سے کہا، کہ اللہ تعالے نے مجھے ہجرت کا اذن دے دیا ہے ۔ پھر دونوں صاحب غار ثور میں جا کر چھپ گئے ۔ بروز شنبہ پنجم ربیع الاول سنہ ۱ھ تین روز کے بعد غار سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے، اس سفر میں حضرت ابوبکرؓ اور عامر بن فہیرہ حضرت ابوبکرؓ کے مولی اور ایک کافر عبداللہ بن اریقط تین شخص آپ کے ساتھ تھے ۔ ابن اریقط کو رہنمائی کے لئے ہمراہ لے لیا تھا ۔ قریش نے رسول اللہؐ کے تعاقب میں سراقہ کو بھیجا تھا، لیکن اللہ تعالے نے اس سے آپ کو نجات دی، اور آپ یوم دوشنبہ ۔ ۱۲ ۔ ماہ مذکور کو

نمازظہر کے وقت مدینے پہنچ گئے۔ پہلے آپؐ نے قبا میں قیام فرمایا، اور ایک مسجد کی بنیاد قائم کی، اس کے بعد جب علی ابن ابی طالب بھی وہاں آگئے، تو آپؐ بروز جمعہ قبا سے نکلے اور مدینے میں داخل ہوئے۔ وہاں جس شخص کے مکان پر آپؐ کا گزر ہوتا، ہر ایک انصاری یہی کہتا کہ یا رسول اللہؐ تشریف لائیے، اور لوگ ناقہ کا راستہ گھیر لیتے تھے۔ مگر آپؐ نے فرمایا، اسے چھوڑ دو، کیونکہ خدا نے اسے حکم دے دیا ہے۔ اور وہ حکم کے مطابق خود اپنی جگہ چلی جائے گی۔ آخر کار اونٹنی اس مقام پر جاکر بیٹھی، جہاں اب مسجد نبوی صلعم ہے۔ اور آپؐ اتر کر ابوایوب انصاری کے گھر میں اس وقت تک مقیم رہے کہ آپؐ کے لئے مسجد اور رہنے کا مکان بن گیا، یہ زمین آپ نے خود مول لی تھی۔

اوس و خزرج کے قبائل کا نام انصار اور مکہ کے مسلمانوں کا نام مہاجرین رکھا۔ حضرت علیؓ کو اپنا بھائی بنایا، اور باقی مہاجرین و انصار کے باہم اخوت قائم کر دی۔ اور دین اسلام کی شریعت تلقین کرنے لگے۔ تمام مخلوق آپ کے افعال و اقوال کی تقلید کرتی۔ اور ہر ایک معاملہ میں حکم کے لئے آپ کے پاس آتی تھی۔ ۳ھ ہجری سے قبل لوگوں نے آپ سے یہ بیعت کی تھی، کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ چوری، زنا، اور اپنی اولاد کے قتل سے بچیں گے۔ معاملات نیک نیتی سے کریں گے۔ یہود اور ان کے مال و متاع کو امن سے رہنے دیں گے۔ سلمان بن فارسی اور عبداللہ بن سلام بھی مسلمان ہو گئے۔ اس سے اسلام کی عزت زیادہ ہو گئی۔ لیکن یہود نے منافقین کا ساتھ دیا، اور سازشیں کرنے لگے۔

قریش نے بھی مسلمانوں پر تشدد کشروع کیا، اپنے شعراء کو بھڑکایا

کہ وہ آپؐ کی ہجو کریں۔ آپ نے بھی قبیلۂ خزرج میں سے حسان بن ثابت کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ کو جواب دینے کے لئے مقرر کیا۔ روزہ و زکوٰۃ کو شریعت کا ایک رکن قرار دیا۔ نماز کے لئے بجائے بیت المقدس کے کعبہ کی سمت معیّن کی گئی۔ اذان کے واسطے ۲ھ میں وحی نازل ہوئی۔ اسی سنہ میں آپ نے عبداللہ بن جحش اسدی کو آٹھ دیگر آدمیوں کے ساتھ نخلہ کی طرف قریش کی خبر دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ مقام مکہ اور طائف کے درمیان ہے۔ راستہ میں قریش کا ایک قافلہ ان پر گذرا اور اُسے انہوں نے لُوٹ لیا۔ اور دو آدمیوں کو دوشنبہ کے روز شام کے وقت جمادی الاخریٰ کے اخیر روز گرفتار بھی کرلیا۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہُوا کہ یہ واقعہ ماہ رجب میں ہُوا ہے جو ماہ احرام میں سے ہے اور کفار نے ماہ حرام کی حرمت نہ کرنے پر مسلمانوں کو ملامت کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی ———

ویسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ قل قتال فیہ کبیر وصدٌ عن سبیل اللہ وکفر بہ من المسجد الحرام واخراج اھلہ منہ اکبر عند اللہ والفتنۃ اکبر من القتل ——— (اے پیغمبر لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ماہہائے حرام میں لڑائی کی نسبت کیا حکم ہے۔ کہہ دو ان میں لڑنا بڑا گناہ ہے۔ اللہ کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر اور مسجد حرام سے انکار کرنا ہے۔ لیکن اس کے لوگوں کو اس سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور فتنہ و فساد تو قتل سے بھی بڑھ کر بُرا ہے۔

غزوۂ بدر

آپ کا سب سے اول غزوہ غزوۂ بدر ہے۔ اس کی
تفصیل یوں ہے کہ ابوسفیان بن حرب اور قریش کے
تیس آدمی مع مال سے لدے ہوئے اونٹوں کے ملک شام سے آ
رہے تھے۔ رسول اللہ صلعم نے مسلمانوں کو ان کی طرف جانے کی
تحریک کی، ابوسفیان نے اس کی خبر سنتے ہی مکہ سے مدد منگائی۔ اور
ابوجہل ساڑھے نوسو آدمی لے کر مدینے کی طرف چلا، اس جمعیت
میں ایک سو سوار بھی تھے۔ رسول اللہ صلعم بھی تین سو تیرہ آدمی لیکر
۱۲ رمضان ۲ھ ہجری کو مدینے سے نکلے۔ آپ کے ساتھ فقط دو
سوار تھے، اور ستر اونٹ جن پر باری باری سے لوگ سوار ہو لیتے
تھے۔ آپؐ بدر کے مقام پر جاکر اُترے۔ جہاں آپؐ کے اور حضرت
ابوبکرؓ کے واسطے ایک عریش (منڈھیا) بنا دی گئی، یہ دونوں اس
میں بیٹھے۔ باقی لوگ کھڑے ہوئے، ابوجہل بھی بدر میں آ پہنچا۔
مشرکین میں سے عتبہ و شیبہ۔ ربیعہ کے بیٹے اور ولید بن عتبہ پہلے میدان
جنگ میں نکلے۔ اور مبارز طلب کیا۔ رسول اللہ صلعم نے علی بن ابی طالب
حمزہؓ اپنے چچا، اور عبیدۃ بن الحارث بن عبدالمطلب اپنے چچازاد بھائی
کو ان کے مقابلہ کا حکم دیا۔ حمزہ نے شیبہ کو، اور علیؓ نے ولید کو قتل کر
دیا، پھر دونوں نے عتبہ پر حملہ کرکے اسے بھی مار ڈالا۔ عبیدہ کو جن کی
ٹانگ کٹ گئی تھی، میدان سے زندہ اُٹھا لائے۔ مگر وہ سپاہ اسلام
کے کیمپ میں آکر مرگئے۔ صبح کو جمعہ کے روز بتاریخ ۱۷ رمضان بڑی
گھمسان کی لڑائی ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلعم عریش سے نکل آئے اور قتال
کے واسطے مسلمانوں کو جوش دلایا۔ مٹھی بھر کنکریاں قریش کی طرف پھینک کر

فرمایا۔ اُن کے منہ کالے ہو گئے۔ پھر اپنے اصحاب کو حملہ کا حکم دیا۔ قریش کو شکست ہوئی۔ ان کے ستّر آدمی مارے گئے جن میں ابوجہل بھی تھا اور ستّر آدمی گرفتار ہوئے جن میں عباس رسول اللہؐ کے چچا اور عباس کے بھائیوں کے دو بیٹے عقیل بن ابی طالب حضرت علیؓ کے بھائی اور نوفل بن الحارث بن عبدالمطلب بھی تھے، صناوید قریش میں سے چوبیس آدمیوں کی لاشیں بدر کے ایک گڑھے میں ڈال دیں[له]۔ اسی غزوہ میں یہ آیت اللہ تعالیٰ کے یہاں سے نازل ہوئی: "اِذْ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انّی ممدکم بالف من الملٰئکۃ" یہ وہ وقت تھا کہ تم اپنے پروردگار کے سامنے فریاد کرتے تھے۔ اس نے تمہاری فریاد سن لی، اور فرمایا کہ ہم تمہاری ہزار فرشتوں سے مدد کریں گے)

غزوۂ بنی قینقاع

یہ لوگ یہود تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے عہد توڑ دیا تھا۔ آپ نصف شوال ۳ھ ہجری میں ان کی طرف لشکر لے کر نکلے پندرہ روز تک ان کا محاصرہ کیا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے بلا شرط ہتھیار ڈال دیئے۔

غزوۃ السویق

بدر میں قریش کے جو آدمی مارے گئے تھے، ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک رسول اللہ صلعم پر چڑھائی کر کے ان کا انتقام نہ لے لونگا، تب تک خوشبو نہ لگاؤں گا اور نہ عورتوں کے پاس جاؤں گا۔ وہ اس جوش میں لشکر لے کر مدینہ کی طرف چلا۔ کچھ لوگ مدینے کو اس نے روانہ کئے۔ جنہوں نے انصار کے

له ۔ کیونکہ اس وقت ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ قبر کھودنا ممکن نہ تھا۔

چند آدمی قتل کر دیئے۔ رسول اللہ صلعم دو سو سوار سے نکلے۔ اور ابوسفیان کے تعاقب میں چلے۔ مگر وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر نہائت سرعت سے نکل گیا اور فرار میں بوجھ سے ہلکا ہونے کے لئے، راستے میں بہت سے ستوؤں کے تھیلے ڈالتا گیا۔ اسی وجہ سے اس غزوہ کا نام "غزوۃ السویق" یعنی ستوؤں کا معرکہ شہرت پا گیا۔

غزوۂ احد ۴ر شوال ۳ہجری کو بروز چہار شنبہ ابوسفیان تین ہزار قریش کے دلاوروں کو لے کر نکلا، اور ذی الحلیفہ میں پہنچا۔ اس کی بیوی ہند بن عتبہ بھی اس کے ساتھ تھی اور پندرہ عورتیں اور بھی تھیں، یہ دف بجاتیں اور بدر کے مقتولین پر نوحہ و بین کرتی جاتی تھیں۔ اور اس طرح مشرکین کو مسلمانوں سے لڑنے کی ترغیب دیتی تھیں۔ رسول اللہؐ بھی خبر سُنکر ایک ہزار آدمیوں کی جمعیت لے کر روانہ ہوئے۔ اُن میں عبداللہ بن اُبی منافق بھی تھا۔ جس کے ماتحت تین سو منافق تھے۔ یہ لوگ راستے سے لوٹ گئے۔ اور رسول اللہ صلعم صرف سات سو آدمیوں کے ساتھ آگے بڑھ کر وادی اُحد کے پاس پہنچے، پہاڑ کی طرف پشت کرکے لڑائی کے لئے تیار ہوئے۔ ساتویں شوال کو فریقین میں لڑائی ہوئی۔ حضرت حمزہؓ عم نبی نے ارطاط علم بردار مشرکین کو قتل کر دیا۔ پھر سباع بن عبدالعزی کو قتل کرنے میں مشغول تھے کہ جبیر بن طعم کے حبشی غلام وحشی نے انہیں آکر قتل کر دیا۔ ادھر ابن قمیۂ اللیثی نے مصعب بن عمیر حامل لواء المسلمین کو مار ڈالا۔ اور غلطی سے سمجھا کہ اس نے رسول اللہ صلعم کو مارا ہے۔ رسول اللہؐ نے اس کے بعد لواء حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اب مشرکین کو شکست ہو گئی۔ مسلمان تیر اندازوں نے

غنیم کی شکست کو دیکھ کر غنیمت کا لالچ کیا۔ اور اپنی جگہ سے جہاں پر
رہنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا لوٹ کا مال حاصل کرنے کے لئے چلے گئے
خالد بن الولید نے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اور کفار کے
لشکر میں سردار تھے موقع کو غنیمت سمجھا، اور مشرکین کے سوار پیکر رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقب سے آپڑے۔ پھر کسی نے بآواز بلند یہ پکار دیا
کہ محمدؐ کو قتل کر دیا گیا، مسلمان یہ سنتے ہی بھاگے اور رسول اللہ صلعم کے
چار اگلے دندان مبارک پر صدمہ آیا، چہرۂ اقدس پر بھی ایک کھرونچا سا
لگا، اور آپ کے دونوں لب زخمی ہو گئے۔ ابوبکرؓ۔ عمرؓ، اور علیؓ بھی مجروح
ہوئے۔ ہند بنت عتبہ نے مسلمان شہداء کے ناک کان کاٹ لئے اور
ان کا ہار بنا کر اپنے گلے میں ڈالا۔ حضرت حمزہؓ کا پیٹ چاک کر کے
ان کا کلیجہ دانتوں سے چبا ڈالا۔ اس لڑائی میں کل ستر آدمی کام آئے
.... بائیس ۲۲ مشرک مارے گئے۔ اور اس واقعہ کے بعد یہ آیت نازل ہوئی
لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ اَوْ یُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ
———— (اے پیغمبر تمہارا تو کچھ بھی اختیار نہیں، چاہے، خدا ان پر رحم
کرے یا ان کی زیادتیوں پر نظر کر کے ان کو سزا دے۔

غزوۂ بیر معونہ :-! صفر سنہ ۴ ہجری میں ابوبراء بن مالک بن
ملاعب الاسنہ جو ابھی تک اپنے دین
(شرک) پر تھا مدینہ آیا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر
آپ کچھ لوگ نجد کو بھیجیں اور وہاں دعوت اسلام کرائیں تو امید ہے کہ
وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے۔ رسول اللہ صلعم نے ستر آدمی ان کے
... سے وہاں بھیج دیئے۔ یہ لوگ مدینہ سے چار منزل تک سفر کر کے ...

پر جاکر اُترے۔ اور رسول اللہ کا فرمان عامر بن الطفیل کے پاس ایک شخص کے ہاتھ بھیجا۔ اس کم بخت نے خط لیجانے والے کو بھی مار ڈالا۔ اور فوج لیکر یکایک اصحاب رسول اللہ ؐ پر آپڑا۔ تمام مسلمان مارے گئے، صرف ایک کعب بن زید مقتولین میں چھپ کر زندہ بچ گئے جنہوں نے آکر رسول اللہ ؐ کو اس واقعہ کی خبر دی۔

غزوۂ بنی النضیر (یہود)

بنی نضیر نے اس زمانے میں عہد توڑ دیا تھا۔ اور دھوکے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا منصوبہ باندھا تھا۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاکر ان کا محاصرہ کیا۔ یہ واقعہ ربیع الاول کی چھٹی تاریخ کا ہے۔ آخر اس بات پر فیصلہ ہوا کہ یہود بنی نضیر مدینے سے جدھر چاہیں چلے جائیں، اور ہتھیاروں کے سوا جس قدر مال اونٹوں پر جا سکے لے جائیں۔ ان میں سے بعض تو خیبر کو چلے گئے، اور بعض نے ملک شام کا راستہ لیا۔ یہی لوگ سب سے اوّل اہل کتاب ہیں، جن کو جزیرۃ العرب سے ملک شام کی طرف جلاوطن کیا گیا۔ اور یہی ان کا اوّل حشر ہے۔ جس کا ذکر اللہ تعالےٰ کے اس قول میں آیا ہے:۔ ھو الذی اخرج الذین کفروا من اھل الکتاب من دیارھم لاول الحشر (وہ خدا ہی تو تھا جس نے ان اہل کتاب کو جنہوں نے کفر کیا اُن کے گھروں سے پہلے حشر کے لئے نکالا) یہ اُن کا پہلا حشر تھا۔ جب حضرت عمرؓ نے ان کو خیبر سے شام کی طرف جلاوطن کر دیا۔

غزوۂ ذات الرقاع

اس غزوہ میں رسول اللہ ؐ صلی اللہ علیہ وسلم نجد کی طرف تشریف لے گئے تھے؛

جمادی الاول سنہ ۴ ہجری میں ذات الرقاع میں آپ کو غطفان کے
کچھ آدمی ملے تھے ۔ فریقین کا سامنا ہوا مگر لڑائی نہیں ہوئی ۔

غزوۃ الثانیہ!

پھر شعبان سنہ ۴ ہجری میں بدر کی جانب کوچ کیا ۔ اور ابوسفیان کے انتظار میں
وہاں مقیم ہوئے ۔ جو کہ رسول اللہؐ کے مقابلہ کے لئے مکے سے نکلا تھا ۔
مگر بعض وجوہ سے واپس چلا گیا ۔ تب رسول اللہ صلعم بھی اپنے آدمیوں
کو لے کر واپس چلے آئے ۔

غزوۃ الخندق یا غزوۂ احزاب!

رسول اللہ صلعم کو یہ خبر ملی کہ عرب کے بیشتر
قبائل آپ کے خلاف مجتمع ہو گئے ہیں ۔ تو آپ نے مدینے کے گرد خندق
کھدوائی ۔ قریش اور ان کے متبعین کنانہ کو دس ہزار آدمی سے اور غطفان
اور ان کے متبعین اہل نجد بھی چڑھ آئے اور مدینہ کے یہود بنی قریظہ
بھی ان دشمنوں سے مل گئے اور رسول اللہ صلعم سے عہد شکنی کی ۔ اب
مسلمان بڑی مشکل میں پڑ گئے تھے ۔ دونوں فریق بیس سے زیادہ دنوں
تک صرف ایک دوسرے پہ دور سے تیر چلاتے رہے ۔ اور کوئی معرکہ
کارزار گرم نہیں کیا ۔ دشمنوں کی طرف سے ایک شخص عمرو بن عبد ود جو
بن غالب کی نسل سے تھا، مقابلہ کے لئے نکلا تو حضرت علیؓ نے جا کر
اسے قتل کر دیا ۔ پھر اس کے بعد ایسی آندھی چلی کہ دشمنوں کی ہانڈیاں
اوندھی ہو گئیں ۔ اور سب برتن گرا دیئے ۔ اور اللہ تعالے نے ان میں
باہم اختلاف ڈال دیا ۔ جس سے غنیم بے نیل مرام واپس چل دیئے ۔
اس لڑائی میں چھ مسلمان درجۂ شہادت کو پہنچے تھے ۔ اور اسی و

نسبت یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ "یاایہا الذین امنوا اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذجاءتکم جنود فارسلنا علیہم ریحا وجنودا لم تروھا" مسلمانو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو۔ جو اس نے تم پر کیا تھا۔ جب تم پر لشکر کے لشکر آچڑھے تھے۔ تو ہم نے ان پر آندھی اور فوج بھیجی جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ غزوہ ۴ھ یا ۵ھ ہجری میں ہوا ہے۔

غزوۂ بنی قریظہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خندق سے مدینے کو واپس تشریف لائے، تو اسی وقت بنی قریظہ کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ اور ذیقعد ۵ھ ہجری میں ۵۰ روز تک مدینے میں ان کا محاصرہ کیا پھر ان کے بچوں اور عورتوں کو لونڈی غلام بنا کر مردوں کو قید کر لیا۔ سب کئی سو آدمی تھے۔ انصار کے مکانات میں یہ لوگ اس وقت تک قید رہے کہ خندقیں نہ کھدیں۔، بعد ازاں اُن سب کی گردنیں ماردی گئیں۔

غزوۂ ذی قرد ربیع الاول ۶ھ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چشمۂ ذی قرد کی طرف لٹیروں کے تعاقب میں تشریف لے گئے۔ یہ مقام مدینہ سے دو منزل کے فاصلہ پر ہے، عیینہ بن حصن الفزاری آپ کے شیر دار اُونٹ چراگاہ سے اڑا لے گیا تھا۔ آپ نے یہ اونٹ چھڑا لئے۔ اور واپس چلے آئے۔

غزوۂ بنی المصطلق شعبان ۵ھ یا ۶ھ ہجری میں آپ بنی المصطلق پر حملہ آور ہوئے۔ ان کا سردار حارث بن ابی ضرار تھا۔ ایک چشمہ "مریسیع" نام پر فریقین میں جنگ ہوئی۔

لہ انہوں نے خلاف معاہدہ غزوۂ خندق میں دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔

دشمن شکست کھاکر بھاگ گئے۔ مسلمانوں نے انہیں قتل کیا، اور اُن کے
اہل وعیال کو پکڑ لیا۔ مالِ غنیمت بھی بہت سا ہاتھ آیا۔ حارث کی بیٹی
بی بی جویریہ بھی انہیں میں گرفتار ہوکر آئیں جو تقسیم غنیمت کے وقت ایک
مسلمان ثابت بن قیس کے حصے میں پڑیں۔ ان کے حصہ دار سے اداان
سے مکاتبت[1] دینے پر تصفیہ ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ان کی رقم کتابت دے کر ان سے نکاح کر لیا۔ جب مسلمانوں نے یہ دیکھا
کہ بنی المصطلق آپؐ کے سسرالئے ہو گئے تو سب نے اپنے اپنے حصہ
کے لونڈی غلام آزاد کر دیئے۔ ان سب کی تعداد ایک سو کے قریب
پہنچ گئی تھی۔

بیعتِ رضوان

روز دوشنبہ غرۂ ذی قعدہ ۶ھ ہجری کو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو مہاجرین وانصار کے ساتھ
مدینے سے نکلے۔ آپ نے عمرہ کا ارادہ کیا تھا۔ قربانی کے اونٹ
جمعیت سے آگے آگے رواں تھے۔ آپؐ سفر کرتے ہوئے "ثنیۃ المرار"
تک پہنچ گئے۔ یہ مقام حدیبیہ کا ڈھلوان اور شہر مکہ کے بالکل نیچے
ہے۔ وہاں قریش کی طرف سے اہل طائف کا سردار قوم "عروۃ بن
مسعود الثقفی" آپ کے پاس آیا، اور کہا کہ "قریش نے قسم کھائی ہے کہ
آپ کو کسی طرح مکہ میں زبردستی نہ آنے دیں گے"۔ پھر وہ یہ پیام پہنچا
کر قریش کے پاس پلٹ گیا۔ اور ان سے بیان کیا کہ میں کسرے اور قیصر

---

[1] لونڈی یا غلام اپنے آقا کو یہ اقرار نامہ لکھ دے کہ ایک مقدار زر نقد کی ادا کرکے
وہ آزادی حاصل کریگا تو اس کو مکاتبت کہتے ہیں۔ فریقین باہم تحریری معاہدہ کرکے پابند
ہو جاتے ہیں، اور رقم باقساط ادا کی جاتی ہے۔

کے شاہی درباروں میں حاضر ہو چکا ہوں مگر لوگوں کو ان کی بھی ایسی تعظیم و تکریم کرتے نہیں دیکھا جیسی کہ محمد کے اصحاب محمد صلعم کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں"

ادھر رسول اللہ صلعم نے حضرت عثمانؓ بن عفان کو شہر مکہ میں ارسال کیا۔ اور ابوسفیان بن حرب و دیگر سرداران قریش سے کہلا بھیجا کہ آپ قریش سے لڑنے نہیں آئے ہیں، بلکہ بیت اللہ کی زیارت اور تعظیم کی نیت سے آئے ہیں۔ قریش کے آدمیوں نے عثمانؓ سے کہا، کہ اگر تم چاہو تو بیت اللہ کا طواف کر لو، انھوں نے جواب دیا کہ "میں اس وقت تک کبھی طواف نہیں کر سکتا جب تک کہ رسول اللہ صلعم آ کر طواف نہ کر لیں" قریش نے عثمانؓ کو قید کر لیا۔ مگر رسول اللہ صلعم کو یہ خبر پہنچی کہ قریش نے عثمانؓ کو قتل کر ڈالا ہے، اور یہ معلوم ہوتے ہی رسول اللہ صلعم نے اپنے ہمراہیوں سے بیعت طلب کی۔ اور سب اصحاب نے ایک درخت کے سائے میں مرنے مارنے پر آپؐ سے بیعت کی۔ اس بیعت کا نام بیعت رضوان پڑ گیا۔

غزوۂ خیبر!

اس کے بعد اواسط محرم ۷ھ ہجری میں آپؐ نے غزوۂ خیبر پر چڑھائی کی، یہاں کے باشندے (یہود) حجاز اور نجد کی تجارت کے مالک تھے۔ اسی غزوہ میں زینب بنت الحارث یہودیہ نے رسول اللہ صلعم کو زہر ملا کر بکرے کا گوشت دیا۔ آپؐ نے ایک لقمہ اس میں سے کھا بھی لیا، جس کی شکایت مرتے دم تک باقی رہی، اور کبھی کبھی آپؐ کو اس زہر کی تکلیف ستایا کرتی تھی۔

خیبر پر جنگ شروع ہوئی، پہلے حضرت ابوبکرؓ عَلَم لے کر نکلے وہ بڑے زور شور سے حملہ آور ہوئے — اور خوب لڑے، پھر پلٹ آئے۔

دوسرے دن حضرت عمرؓ بن خطاب نے عَلَم لیا، وہ ابوبکرؓ سے بھی زیادہ زور کے ساتھ دشمنوں سے لڑے اور واپس چلے آئے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں کل ایک ایسے شخص کو رائت دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے۔ اور وہ خود اللہ اور اس کے رسول کا محبوب ہے" مہاجرین و انصار سب نے اس بات کی تمنا کی کہ رسول اللہ صلعم ہم میں سے کسی کو نشان جنگ دیں گے۔ کہ اسی اثنا میں حضرت علیؓ مدینے سے آئے۔ جن کی آنکھوں میں آشوب تھا۔ رسول اللہ صلعم نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں میں لگا دیا۔ وہ فوراً اچھے ہو گئے۔ پھر انہیں رائت دیا۔ حضرت علیؓ میدان میں گئے۔ اہل قلعہ سے لڑے، کسی دشمن نے ان پر ایک وار کیا۔ جس سے ان کی ڈھال ہاتھ سے گر گئی۔ کہیں قلعہ کے پاس ایک دروازہ پڑا ہوا تھا۔ حضرت علیؓ نے اٹھا کر اپنی ڈھال بنا لیا دس روز سے زیادہ حصار کے بعد اللہ تعالےٰ نے وہ قلعہ ان کے ہاتھ سے فتح کرا دیا۔ یہ دروازہ اس قدر وزنی تھا کہ حضرت علیؓ نے اس کو پھینک دیا تو آپؓ کے بعد صحابہ میں سے ایک سا تھ آٹھ آدمی بھی اُسے جنبش تک نہ دے سکے۔

غرض کہ خیبر اور نیز فدک والوں نے رسول اللہ صلعم سے اس شرط پر صلح کی درخواست کی کہ جب تک وہ اس ملک میں رہیں، نصف پیداوار رسول اللہ صلعم کو دیا کریں گے۔ اور رسول اللہ صلعم کو اختیار رہیگا کہ

جب چاہیں انہیں ملک سے نکال دیں۔ آپ نے اسے منظور کر لیا۔ خیبر تو عام مسلمانوں کی ملک ہوا، اور فدک رسول اللہ صلعم نے اپنے لئے رکھا کیونکہ فدک بدون لشکرکشی کے فتح ہوا تھا۔

غزوۂ وادی القریٰ

پھر رسول اللہ صلعم "وادی القریٰ" کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا محاصرہ کیا۔ اور فتح کرکے اس پر متصرف ہوئے۔ بعد ازاں مدینہ واپس تشریف لائے۔

اسی زمانے میں وہ مہاجر بھی مدینے میں آگئے جو اب تک ملک حبش میں مقیم تھے۔ ان میں جعفر بن ابی طالب حضرت علی کے بھائی بھی تھے۔ اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ دل کی دو مرادیں اس وقت پوری ہوئی ہیں، میں نہیں جانتا کہ کس کی خوشی مناؤں، فتح خیبر کی۔ یا جعفر کے آنے کی۔

مکاتیب نبویؐ

سنہ ۹ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عبداللہ بن حذافہ کے ہاتھ کسرےٰ پرویز کو ایک خط لکھا تھا۔ جسے اس نے پھاڑ کر پھینک دیا۔ اور اپنے عامل یمن باذان کو لکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسرےٰ کے پاس جانے کے لئے خط بھیجے۔ اگر وہ حکم کی تعمیل نہ کریں تو ان سے لڑے۔ رسول اللہ صلعم نے یہ سنکر فرمایا کہ اللہ تعالےٰ اس کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دے گا۔ یہ دعا پوری ہوئی، اللہ تعالےٰ نے اس کے بیٹے شیرویہ کو اس پر مسلط کر دیا جس نے اسے مار ڈالا۔ اور باذان کو اس کی اطلاع دیکر حکم دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قسم کی پرخاش نہ کرے۔ اور اس بات کا یہ اثر ہوا کہ باذان اور وہ اہل فارس جو یمن میں تھے سب مسلمان ہو گئے۔

رسول اللہ صلعم نے دوسرا فرمان دحیہ کلبی کے ہاتھ قیصر روم کو بھیجا:

قیصر نے پیغمبر صلعم کے خط کی نہائت تعظیم کی. اور وحیہ کو بڑی عزت
ساتھ واپس کیا۔

مقوقس والی مصر کو بھی آپ نے ایک فرمان بھیجا تھا۔ جو طالب
ابی بلتعہ لے کر گئے تھے. مقوقس نے بھی طالب کا بہت احترام
اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خچر اور ایک گدھا، اور دو لونڈیاں تحفہ
بھیجیں۔ ان دو میں سے ایک بی بی ماریہ قبطیہ ابراہیم بن النبی صلی اللہ
وسلم کی والدہ تھیں، نجاشی کو بھی آپ نے ایک خط عمرو بن امیہ کے
روانہ کیا تھا۔ اس نے آپ کی ہدائت کو بدل قبول و منظور کیا۔ اور جعفر
طالب کے ہاتھ پر جو اس کے پاس تھے مسلمان ہو گیا۔ شجاع بن وہب
آپ کا فرمان لے کر حرث بن ابی شمر الغسانی کے پاس پہنچے. تو اس نے
پڑھ کر کہا "میں خود ان کے پاس لڑنے کے لئے جاتا ہوں" آپ نے
فرمایا "اس کا ملک برباد ہو جائے گا" سلیط بن عمرو آپ کا فرمان ہوذہ
یمامہ کے پاس لے کر گیا تھا. اس نے کہا کہ اگر پیغمبر اپنے بعد اپنی حکو
مجھے دیں تو میں مسلمان ہوں اور ان کی نصرت و مدد کرتا ہوں اور
سے لڑنے جاتا ہوں۔ آپ نے دعا مانگی. یا اللہ تعالے اس کے مق
میں میری مدد کر، چنانچہ وہ چند روز کے بعد مر گیا۔ منذر بادشاہ بحرین
بھی آپ نے خط لکھا تھا. علاء بن الحضرمی یہ خط لے کر گئے تھے۔
مسلمان ہو گیا۔ اور جس قدر عرب بحرین میں تھے، وہ بھی اسلام لے

عمرۃ القضاء

عمرۃ القضاء کے لئے آپ ماہ ذی
میں دو ہزار مسلمانوں کی جمعیت سے
اور قربانیاں آگے آگے لے کر مکہ کے قریب پہنچے۔ قریش جب

کے سے نکل آئے مگر وہ آپس میں کہنے لگے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بڑی تنگی وسختی میں مبتلا ہیں، یعنی مفلس و فاقہ کش ہیں، سب قریشی وارالندوہ کے پاس صف باندھ کر کھڑے ہوئے تاکہ مسلمانوں کے داخلہ کا نظارہ کریں۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس مسلمان پر رحم کرے گا، جو آج اپنی قوت اور جرأت انہیں دکھائے گا۔ خود آپ طواف کے چار گشتوں میں تیز تیز دوڑنے کی سی چال سے چلے۔ اور پھر صفا و مروہ کے درمیان دوڑے۔

خالد بن ولید کا مع ہمرائیوں کے اسلام لانا

۸ھ ہجری میں حضرت خالد بن الولید اور عمرو بن عاص اور عثمان بن طلحہ بن عبدالدار رسول صلعم کی خدمت میں آکر مسلمان ہو گئے۔

غزوۂ موتہ

سب سے اوّل مسلمانوں کی روم پر لشکر کشی اسی غزوہ سے شروع ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث بن عمیر کو عمرو بن شرجیل الغسانی حاکم بصرہ کے پاس خط دیکر بھیجا تھا۔ حارث موتہ کے مقام پر مارے گئے۔ اس واسطے آپ نے جمادی الثانی ۸ھ ہجری میں تین ہزار آدمی ان کا انتقام لینے کی غرض سے روانہ کئے۔ یہ لشکر موتہ واقع ملک شام تک پہنچا تھا کہ رومی اور نصرانی عرب کوئی ایک لاکھ کے قریب ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو کر فراہم ہو گئے۔ زید بن حارث مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مسلمانوں کا رایت تھا۔ وہ شہید ہو گئے تو ان کے بعد جعفر بن ابی طالب نے علم فوج لیا۔ اور ان کی شہادت کے بعد عبداللہ بن رواحہ نے نشان

اٹھایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو یکے بعد دیگرے رائت
لینے کا حکم دیا تھا۔ اور جب عبداللہ بن رواحہ بھی شہید ہو گئے تو
لشکر نے اپنے اتفاق آرار سے خالد بن الولید کو اپنا سردار مقرر کیا۔
اور یہ رائت لے کر دشمنوں سے لڑے، اللہ تعالےٰ نے انہیں فتح
عطا کی۔ پھر خالدؓ مسلمانوں کو لے کر مدینے لوٹ آئے۔

قریش اور رسول اللہؐ کے درمیان صلح کی شکست اور فتح مکہ ۸ھ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم

اور قریش کے درمیان جو معاہدۂ صلح ہوا تھا، اس کے رُو سے بنی بکر
قریش کے اور خزاعہ مسلمانوں کے ساتھیوں میں تھے۔ ۸ھ ہجری میں
بنی بکر نے قریش کے ایک گروہ کی اعانت سے خزاعہ کے کچھ لوگ
قتل کر دیئے۔ جس سے فریقین میں صلح ٹوٹ گئی۔ ابوسفیان مسلمانوں
کے خوف سے رسول اللہ کے پاس آیا کہ معاہدہ کی تجدید کر لیجئے
مگر یہاں اُسے کچھ جواب نہ ملا۔ جیسے آیا تھا، اسی طرح واپس گیا۔
پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ ہزار مہاجرین والفار
اور عرب کے دوسرے قبائل کے آدمی مدینہ سے ہمراہ لئے اور
مکہ کو روانہ ہوئے۔ جب قریب پہنچے تو عباسؓ رسول اللہ کے چچا سوار
ہو کر قریش کو خبر دینے گئے۔ قریش نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
آئے۔ اور امن کے خواستگار ہوئے۔ راستے میں عباس آکر ابوسفیان
سے مل گئے۔ عباسؓ انہیں اپنے ہمراہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
لائے۔ ابوسفیان مسلمان ہو گئے۔ آپ نے لشکر کے تمام قبائل صف
باندھ کر ان کو دکھائے۔

پھر رسول اللہ نے لشکر کو حکم دیا کہ مکہ میں میچے کی طرف کداُ اور کدا کی گھاٹی کی جانب سے داخل ہوں، چنانچہ ۲۰ رمضان ۸ھ ہجری کو بروز جمعہ مسلمان کعبے میں داخل ہوئے۔جب تمام لوگوں کو اطمینان ہو گیا، اس وقت رسول اللہ صلعم اپنے مقام سے نکلے اور بیت اللہ کا طواف کیا۔ اندر جاکر خانۂ کعبہ میں بھی نماز پڑھی۔بتوں کو توڑ کر پھینک دیا اور فرمایا: جاءالحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا (اے پیغمبر لوگوں سے کہدے دین حق آگیا۔اور باطل مٹ گیا۔باطل تو نیست و نابود ہونے والا تھا)

پھر آپ نے چند ٹکڑیاں بھیجیں کہ مکے کے اطراف میں جاکر مخلوق میں اسلام کی دعوت کریں۔یہ لوگ لڑائی کے لئے نہیں گئے تھے۔

خالد بن الولید اپنے ہمراہی لئے ہوئے جذیمہ کے ایک چشمہ پر پہنچے اور انہیں اسلام لانے کو کہا۔ان لوگوں نے کچھ ایسی باتیں کیں جن سے خالدؓ کو یہ معلوم ہوا کہ وہ مطیع نہیں ہوتے۔خالدؓ نے انہیں قتل کر دیا۔مگر جب یہ خبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی، تو آپ نے فرمایا۔اے اللہ جو کچھ خالدؓ نے کیا، میں اس سے بری ہوں۔پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو کچھ مال دے کر بھیجا کہ اُس سے انہوں نے مقتولین کا خون بہا ادا کیا۔اور جو تھوڑا سا مال فاضل بچ رہا، وہ بھی ان کی خوشنودی خاطر کے لئے انہیں دے دیا۔

غزوۂ حنین

فتح مکہ کے بعد قبیلۂ ہوازن اپنے زن۔بچوں اور مال و متاع کو ساتھ لے کر رسول اللہؐ سے لڑنے آیا۔ثقیف اور بنی سعد بن بکر بھی ان کے ساتھ تھے۔یہ بنی سعد وہی لوگ تھے جن میں رہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پیا تھا۔

رسول اللہ صلعم ۶ شوال ۸ھ ہجری کو بارہ ہزار آدمی لے کر اُن کے
مقابلے کے لئے مکّے سے نکلے۔ اور طائف کو چلے۔ جب آپ مقام
حنین میں پہنچے جو بہ نسبت طائف کے مکّے سے قریب ہے اور کشادہ
وادی ہے تو اس وقت مشرکین مقام اوطاس میں پڑے ہوئے تھے۔
اس کے بعد فریقین کا مقابلہ ہُوا۔ اور مسلمان اس معرکہ میں ایسے سراسیمہ
ہو کر بھاگ نکلے کہ کسی نے کسی کی پروا بھی نہ کی، صرف رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم چند مہاجرین والنصار اور اپنے خاندان کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھے
رہے۔ آخر مسلمان بھی پلٹے اور مشرکین پر فتح حاصل کی اور مفرورین کے
تعاقب میں انہیں قتل اور اسیر کیا۔ انہیں اسیران جنگ میں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن شیمأ بھی تھی۔ جو بی بی حلیمہ آپ کی
دائی کی بیٹی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اکرام کیا۔ اور
زادِ راہ عنایت فرما کر اسے حسب درخواست اس کی قوم میں بھیج دیا
اس غزوہ میں مسلمانوں کو اپنی کثرت پر کچھ گھمنڈ ہوا تھا، اور کسی نے
کہا تھا کہ ہم اب قلت کے سبب سے مغلوب نہ ہوں گے۔ اس لئے یہ
آیت نازل ہوئی۔ یوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئا و
ضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین ثم انزل اللہ
سکینۃ علی رسولہ وعلی المومنین وانزل جنودا لم تروھا وجعل کلمۃ
الذین کفروا السفلی وکلمۃ اللہ ھی العلیا واللہ عزیز حکیم۔
(اللہ بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کر چکا ہے اور خاص کر حنین کے
دن، جب کہ تمہاری فوج کی کثرت نے تم کو مغرور کر دیا تھا۔ تو وہ کثرت
تمہاری کچھ بھی کام نہ آئی۔ اور تنگ ہو گئی زمین تم پر باوجود کشادگی

پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے، پھر اللہ نے اپنے رسولؐ پر اور نیز مسلمانوں پر اپنی طرف سے تسلّی نازل فرمائی، اور تمہاری مدد کو ایسے لشکر بھیجے، کہ تم کو دکھائی نہیں دیتے تھے اور کافروں کی بات پست کر دی اور بات خدا ہی کی بلند ہے۔ اور اللہ غالب ہے حکمت والا۔

طائف کا محاصرہ

ثقیف حنین سے بھاگ کر طائف میں چلے گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جا کر ۸ھ ہجری میں بیس روز سے کچھ اوپر اس کا محاصرہ کیا۔ پھر جعرانہ کو مراجعت کی جہاں حنین کی غنیمت جمع تھی۔ اس میں چوبیس ہزار اونٹ، اور چالیس ہزار سے زیادہ بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ یہ سب مال آپ نے انصار کے سوا اوروں کو دے دیا۔ اس سے انصار کے دلوں میں کچھ رنج گذرا۔ آپ نے یہ بات معلوم کر کے انصار کو بلایا، اور ان سے فرمایا، "اے گروہ انصار! تم ناچیز دنیا کا خیال کرتے ہو، میں نے تو لوگوں کو تالیفِ قلوب کے لئے یہ مال دے دیا ہے۔ تاکہ وہ مسلمان ہو جائیں، اور تمہارے اسلام پر بھروسہ کر کے تم کو یہ مال نہیں دیا۔ کیا تم اس سے راضی نہیں کہ اور لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں، اور تم رسول اللہؐ کو اپنے گھر لیجاؤ۔ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، اگر یہ ہجرت کا معاملہ نہ ہوتا تو میں انصار ہی کا ایک شخص ہونے کو پسند کرتا، تمام مخلوق ایک گھاٹی کے راستے سے جاوے۔ اور انصار دوسری گھاٹی سے جائیں۔ تو میں انصار ہی کی گھاٹی میں چلونگا۔ اے اللہ تو انصار اور انصار کے بیٹوں اور اُن کے بیٹوں کے بیٹوں سب پر رحم کر"!

اس کے بعد ہوازن کے کچھ لوگ آپؐ کے پاس خواہاں رحم ہو کر

حاضر ہو گئے۔ آپ نے اپنا حصہ اور بنی عبدالمطلب کا حصہ انہیں دے دیا۔ اور تمام اسیرانِ جنگ کو چھوڑ دیا جن کی تعداد آٹھ ہزار تھی اور مالک بن عوف جو ہوازن میں ایک بڑا شخص تھا، مسلمان ہو گیا۔ اور آپ نے اسی کو اس کی قوم پر اور جو لوگ ان قبائل کے مسلمان ہو گئے تھے ان سب پر حاکم مقرر کر دیا۔

اس باب میں جو خاکہ غزواتِ نبوی کا پیش کیا گیا ہے وہ ان تمام غزوات پر حاوی ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پیش آئے ان میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا، جس سے یہ ثابت ہو کہ مسلمانوں نے تلوار اٹھا کر دشمن کے ساتھ ظلم کیا۔ یا جنگ کے دوران میں اُسے نشانۂ ستم بنایا۔ یا اس کی مجبوری اور بے کسی سے فائدہ اٹھا کر اسے ذلت آمیز شرائط قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ بلکہ جو کچھ معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ دشمن کے ساتھ ہر موقعہ پر رعائت کی گئی۔ اس کے ساتھ ہر حالت میں حسن سلوک کیا گیا۔ جب اس نے عہد شکنی کی، معاہدہ توڑا۔ ظلم کیا، قول سے پھر گیا تب بھی اس پر ظلم نہیں کیا گیا۔ اُس سے انتقام نہیں لیا گیا۔

ان واقعات کی روشنی میں صحیح طور پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کے قوانین جنگ و صلح آج بھی دنیا کے ہر قانون سے بالاتر ہیں!

صلح و امن سے متعلق

اسلام کے احکام و ہدایات

گزشتہ باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام نے اپنے جنگی احکام میں دھوکہ، فریب، اتلاف مال، تعذیب اور مثلہ وغیرہ کی شدید ممانعت کی ہے۔

اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام نے صلح و امن کے زمانے میں مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں سے تعلقات و روابط رکھنے کا کیا حکم نامہ مرتب کیا ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے جو احکام دیئے ہیں، وہ عدل و انصاف پر مبنی ہیں اور ان میں اس کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ افراد کے حقوق پر زیادتی نہ ہونے پائے۔ معاملات و کاروبار میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو۔

قرآن میں آیا ہے:۔

لا ینھاکم اللہ عن الذین
لم یقاتلوکم فی الدین و
لم یخرجوکم من دیارکم
ان تبروھم و تقسطوا
الیھم ان اللہ یحب
المقسطین ○ انما

دین کے معاملہ میں جو غیر مسلم تم سے
مقاتلہ نہ کریں، اور تمہیں جلاوطن
کرنے کی سعی نہ کریں، ان کے ساتھ
اچھا برتاؤ کرنے اور ان کے ساتھ
انصاف سے اللہ منع نہیں کرتا۔
بے شک اللہ تعالیٰ انصاف

ينهاكم الله عن الّذين قاتلوكم فى الدّين واخرجوكم من ديارهم وظاهروا على اخراجكم ان تولوهم ۚ ومن يتولهم فاولئك هم الظلمون	البتہ خدا ان لوگوں سے دوستی رکھنے کو منع کرتا ہے، جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں مقابلہ کیا اور تمہیں بے وطن کیا اور تمہیں جلاوطن کرنے کی کوشش کی۔ ایسے لوگوں سے تم میں سے جو دوستی کرے گا، وہ ظالموں میں سے ہو گا۔

رسول اللہ کا ارشاد ہے: الامن ظلم معاهدا او كلفه فوق طاقته، او انتقصه او اخذ منه شيئا بغير طيب نفسه فانا حجيجه يوم القيمة — یعنی خبردار جس نے معاہد پر ظلم کیا یا اُسے برداشت سے زیادہ تکلیف دی، یا اسے نقصان پہنچایا، یا بغیر اس کی خوشنودی کے اس سے کچھ لیا، تو قیامت کے روز میں اس کا دعویدار ہوں گا۔

مسلم اور غیر مسلم کے مابین ربط و تعلق

اس سلسلہ میں اسلام نے جو احکام صادر کئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جو غیر مسلم دین کے معاملہ میں مسلمانوں سے جنگ نہ کریں اور ان پر زیادتی نہ کریں، تو خواہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دارالاسلام میں مقیم ہوں یا اپنے علاقہ میں بود و باش رکھتے ہوں، وہ احکام امن و صلح کے ماتحت آتے ہیں، کیونکہ رائے راجح یہی ہے کہ مسلم اور غیر

کے مابین اصل علاقہ جو ہے وہ صلح و امن اور امان ہے، نہ کہ جدال و قتال کا۔

ایک دوسری رائے یہ بھی ہے کہ حق و امان سے وہی غیر مسلم بہرہ ور ہو سکتے ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کے امام سے باقاعدہ امان حاصل کر لی ہو، اور باقاعدہ مسلمانوں کے "ذمہ" میں آ گئے ہوں۔

اسلام نے مسلمانوں اور ذمیوں کے مابین بالکل مساوات قائم رکھی ہے، وہ انہیں آسانیوں کے مستحق ہیں جن سے متعلق مسلمان متمتع ہوں، اور انہیں وہی دکھ جھیلنا پڑیں گے جن سے مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کی حریت و آزادی کی بھی پوری پوری رکھوالی کی جائے گی، مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں ان کے دین پر چھوڑ دیں، اور ان کے اعتقاد سے تعرض نہ کریں، ان پر کسی طرح کا جبر نہ کریں۔

اس مساوات کی بنیاد پر ان کے لئے جائز ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ تمام جائز معاملات میں کاروبار کریں۔

صاحب بدائع کا قول یہ ہے کہ:۔

ذمی مسلمانوں کے شہروں میں رہیں گے۔ ان سے خرید و فروخت کریں گے۔ اور چونکہ وہ مسلمانوں کے "ذمہ" میں ہیں، اس لئے بے خوف سب کچھ کریں گے، سو ممکن ہے آگے چل کر یہی معاملت ان کے اسلام کا وسیلہ بن جائے۔

غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں سہولتیں

جن چیزوں کا کاروبار نیز معاملت مسلمانوں کے لئے

حرام ہے، وہ ذمیوں کے لئے حرام نہیں ہے۔ مثلاً شراب اور سود، ذمیوں کے لئے جائز ہے کہ اس کی تجارت جس طرح چاہیں کریں، لیکن بلاد مسلمین میں وہ کھلے بندوں اس کی تجارت نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ اسلامی شہر میں وہی کاروبار کھلے بندوں ہو سکتا ہے جو شعار اسلامی کے منافی نہ ہو۔

مساوات کی اس بنیاد پر، عقوبات میں ذمی اور مسلم کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے، مثلاً قصاص میں۔

النفس بالنفس و العین بالعین والانف بالانف والاذن بالاذن، والسن بالسن والجروح قصاص۔"

جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت، اور جراحت کی سزا کا اصول ذمی اور مسلم پر یکساں عائد ہوگا۔

×

دیت ضمان، اور تعزیرات کے احکام میں بھی ذمی اور مسلم برابر ہیں، وہی سزا ذمی کو ملے گی جو مسلمان کو ملے گی۔

احوال شخصی (پرسنل) میں اسلام ذمیوں سے کوئی تعرض نہیں کرتا، انہیں اجازت ہے کہ اپنی ریت، رسم، اصول قاعدے اور دین ومذہب پر عمل کریں، اس طرح نکاح وطلاق کے معاملہ میں بھی وہ بالکل آزاد ہیں، البتہ اگر خود ذمیوں کی طرف سے مسلمان عدالت میں مرافعہ کیا جائے اور وہ خود، احکام اسلامی کا اپنے اوپر اجرا کرانا چاہیں تو دوسری بات ہے۔

میراث کے مسئلہ میں ذمی اور مسلم کی مساوات

میراث میں مسلمان اور ذمی حرمان میں برابر ہیں، ذمی اپنے کسی مرحوم مسلمان عزیز کا وارث نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح مسلمان اپنے کسی انجہانی عزیز کا وارث نہیں بن سکتا۔

معاملت اور حسن معاشرت میں ایسے احکام اسلام نے مشروع کئے ہیں، جنہوں نے دشمنوں کے دل بھی کھول دیئے اور انہیں بھی ان کی تعریف کرتے ہی بن پڑی۔ اسلام نے ذمیوں کا کھانا مسلمانوں کے لئے جائز ٹھہرایا ہے، ان کا ذبیحہ بھی مسلمانوں کے لئے جائز ہے، ان کے ساتھ شادی، بیاہ اور وصلت و پیوند کا رشتہ بھی جائز ہے۔ مثلاً قرآن میں آیا ہے:-

وطعام الذین اوتو ا الکتاب حل لکم و طعا مکم حل لہم والمحصنت من المومنات والمحصنٰت من الذین اوتو الکتب من قبلکم۔	اہل کتاب (عیسائیوں، یہودیوں) کا کھانا تمہارے لئے، اور تمہارا کھانا اہل کتاب کے لئے جائز ہے۔ پاک دامن مسلمان عورتوں اور پاک دامن کتابیہ (عیسائی اور یہودی) عورتوں سے نکاح جائز ہے۔

مسلمان کی غیر مسلم بیوی کے وہی حقوق ہیں، جو مسلمان بیوی کے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مجادلہ کی اجازت دی ہے۔ جو بہ طریق احسن ہو۔ علمائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلمان ذمیوں کی دعوت کر سکتے ہیں اور خود ان کے وہاں مدعو ہو سکتے ہیں، نیز آپس میں تحفوں اور ہدیوں کا سلسلہ بھی جاری رکھ سکتے ہیں،

اعتقادات وعبادات کی حریت

عبادات واعتقادات میں ذمیوں کو پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ ان کے ایمان واعتقاد سے تعرض کیا جائے۔ انہیں حق ہے کہ اپنے شعائر دینی پر عمل کریں، اپنی عبادت گاہوں میں جائیں۔ ان کی عبادت گاہیں اگر ٹوٹ پھوٹ جائیں یا گر جائیں، تو وہ ان کی مرمت، تجدید، اور تعمیر کرا سکتے ہیں، یہ عام اجازت تو چھوٹے شہروں کے لئے ہے، لیکن بڑے اسلامی شہروں میں بھی انہیں اپنے گرے ہوئے گرجوں کو از سر نو بنوانے کی اجازت ہے بس وہ اپنے کنائس میں ناقوس بھی بجا سکتے ہیں، غرض ان معاملات میں پوری آزادی حاصل ہے۔ اور وہ ان تمام باتوں کو کھلے بندوں بھی کر سکتے ہیں، جو شعائر اسلام کے منافی نہ ہوں۔

یہ تھے اسلام کے وہ احکام جو عدل ومساوات کے آئینہ دار تھے۔ اور جن کے زیر سایہ سالہا سال تک غیر مسلم بلاد اسلام میں رہے اور انہیں کبھی کوئی شکائت اسلام یا مسلمانوں سے کسی قسم کی نہیں پیدا ہوئی۔

غیر مسلموں سے مسلمانوں کے عہد نامے

اگر کوئی شخص ان عہد ناموں پر غور کرے جو مسلمانوں نے اپنے دور قوت وسطوت میں غیر مسلموں سے کئے تھے تو اس پر اسلام کی رواداری رحم، اور نوازش کی روح روشن ہو جائے گی۔ اس کا تو کوئی شخص گمان بھی نہیں کر سکتا کہ خلفائے راشدین، قوادِ مسلمین، کبار صحابہ، اور عالمان دین کی موجودگی میں، وہ معاہدے کر لئے گئے تھے جو دین اسلام کے اصول و قواعد کے خلاف تھے۔ اگر یہ معاہدے عین روح اسلام کے مطابق

ہوتے تو بھلا صحابہؓ اور عالمانِ دین انہیں گوارا کیسے کرتے ؟

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں، حضرت خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ سے جو عہد نامہ کیا تھا اور حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ نے اہل شام سے جو عہدنامہ کیا تھا، ان معاہدوں کا اثر فارس اور روم کی شہنشاہیت تک پہنچا تھا۔ اور ان میں یہ احساس بج گیا تھا کہ وفاء عہد اور حسن معاملت مسلم عہود کی خصوصیت میں داخل ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ غیر مسلم، مسلمانوں سے جو کچھ پاتے تھے وہ اپنے دین والوں سے نہیں پاتے تھے۔ جو شریفانہ اور روادارانہ طرزِ عمل مسلمانوں کا تھا، وہ ان کے ساتھ ان کے ہم مذہبوں کا نہیں تھا۔

امام ابویوسفؒ کی روائت

امام ابویوسف نے اپنی کتاب "الخراج" میں روائت کی ہے کہ خالد بن ولید نے اہل حیرہ سے جو صلح کی تھی، اس کے شرائط میں یہ داخل تھا کہ ان کی عبادت گاہوں اور کنیسوں کو منہدم نہیں کیا جائے گا۔ نہ ان کے محلوں اور قلعوں کو ڈھایا جائے گا، جن میں وہ اُس وقت پناہ گزین ہوتے تھے، جب ان پر کوئی دشمن چڑھائی کرتا تھا، نہ انہیں ناقوس بجانے کی ممانعت کی جائے گی، نہ عید کے موقعہ پر صلیب نکالنے کے سلسلہ میں ان پر کوئی پابندی عائد ہو گی۔"

حضرت خالد بن ولید کا مکتوب

حضرت خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ کے نام اس سلسلہ میں حسب ذیل مکتوب لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ مکتوب ہے خالد بن ولید کی طرف سے اہل حیرہ کے نام!

خلیفۂ رسولؐ حضرت ابوبکرؓ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اہل یمامہ کی طرف سے لوٹنے کے بعد میں اہل عراق کی طرف جاؤں۔ اور وہاں کے لوگوں کو خواہ وہ عرب ہوں یا عجم خدا کی طرف دعوت دوں، اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دوں، انہیں جنت کی بشارت دوں، اور دوزخ سے ڈراؤں، اگر وہ میری دعوت قبول کرلیں، تو وہ مسلمانوں کی راحت کے شریک اور مسلمانوں کے دکھ کے حصہ دار ہوں گے۔

میں حیرہ گیا، میرے پاس ایاس بن قبیصہ الطائی وہاں کے بعض باشندوں اور ہستیوں کے ساتھ آیا۔ میں نے ان کو اسلام کی دعوت پیش کی۔ انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا۔ پھر میں نے کہا، اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو جزیہ دو ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا ہم آپ سے جنگ کرنا نہیں چاہتے، لیکن آپ ہم سے اس بنیاد پر صلح کر لیجئے۔ جس بنیاد پر آپ نے ہمارے علاوہ دوسرے اہل کتاب سے صلح کی ہے۔ اور جزیہ لے لیجئے۔ میں نے ان کا شمار کیا تو معلوم ہوا وہ سات ہزار نفوس ہیں۔ ان میں ایک ہزار ضعیف تھے۔ انہیں میں نے اس تعداد

سے خارج کر دیا ہے، تو کل چھ ہزار رہ گئے، انہی پر میں نے جزیہ عائد کر دیا اور صلح کر لی "

میں نے ان کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ اس خدائی عہد و میثاق کی پیروی کریں، جو اہل تورات اور انجیل پر عائد ہے۔ اس کی مخالفت نہ کریں، مسلمان (خواہ وہ عرب ہوں یا عجم) کے مقابلہ میں کسی کافر کی مدد نہ کریں؛ اگر انہوں نے ان شرائط کے خلاف کیا، تو نہ وہ ہمارے "ذمہ" میں رہ جائیں گے نہ انہیں امان ہوگی، اور اگر انہوں نے اس کی پابندی کی، تو ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو معاہد کے ساتھ کیا جاتا ہے، اور ہمارے لئے ہرگز جائز نہ ہوگا۔ کہ ان کے خلاف کوئی کاروائی کریں،

میں نے یہ بھی طے کر دیا ہے کہ اگر کوئی بوڑھا اور ضعیف ہو، یا کسی کو کوئی آفت پہونچی ہو، یا کوئی پہلے مالدار ہو، اور اب فقیر ہو گیا ہو اور اس کے ہم مذہب اُسے صدقہ دینے لگے ہوں، تو اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ بلکہ اس کی اور اس کے عیال کی مسلمانوں کے بیت المال سے پرورش کی جائے گی، بشرطیکہ وہ دارالاسلام یا دارالہجرۃ میں ہو، لیکن اگر وہ لوگ دارالاسلام یا دارالہجرۃ سے کہیں دور چلے جائیں تو مسلمانوں پر ان کی کفالت واجب نہیں ہوگی۔ اگر ان کا کوئی غلام مسلمان ہو جائے تو اسے مسلمانوں کے بازار میں لایا جائے گا۔ اور اسے اچھی کی اچھی قیمت پر خرید کر اس کی قیمت اس کے مالک کے

حوالے کر دی جائے گی۔ انہیں اجازت ہو گی کہ وہ جو لباس چاہیں پہنیں۔ لیکن فوجی وضع میں وہ نہیں رہ سکیں گے۔ تاکہ ان کے اور مسلمانوں کے لباس میں مشابہت نہ پیدا ہو۔

امام ابو یوسف کی ایک اور روائت

امام ابو یوسف فرماتے ہیں، کہ:-

مجھ سے بعض اہل علم نے مکحول شامی سے روائت کی ہے کہ ابو عبیدہ بن جراح نے اہل شام سے مصالحت کی، اور جب وہاں داخل ہوئے تو یہ شرط قبول کی کہ ان کی عبادت گاہوں اور کنیسوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے، البتہ اس سلسلہ میں نئی عمارت بنانے کی اجازت نہ ہو گی۔ انہیں اس کا حق حاصل ہو گا، کہ اپنے صرف سے نہروں پر پل بنائیں، اگر کوئی مسلمان آئے تو تین دن تک اس کی مہمانی کریں، اور یہ کہ مسلمانوں سے گالی گلوچ نہ کریں، اور ان سے مارپیٹ نہ کریں، اور اہل اسلام کی آبادی میں صلیب کو بلند نہ کریں، اور مسلمانوں کی آبادی سے اپنے علاقوں میں سور نہ لے جائیں۔ غازیانِ اسلام کے لئے ضرورت ہو تو آگ جلائیں، مسلمانوں کی اذان سے پہلے ناقوس نہ بجائیں۔ نہ ان کی اذان کے وقت ناقوس بجائیں، ان کی عید کے دن اپنے جھنڈے نہ اٹھائیں نہ سلاح جنگ سے آراستہ ہوں، نہ ان کے گھروں میں گھسیں، اگر انہوں نے ان شرائط پر عمل نہ کیا تو انہیں سزا دی جائے گی۔

انہوں نے ابو عبیدہ سے درخواست کی کہ سال میں ایک دن ہمیں اس کی اجازت دیجئے کہ اپنی عید اکبر کے موقع پر ہم بغیر جھنڈوں کے اپنی صلیب نکال لیا کریں. یہ اجازت انہیں دے دی گئی،

جب ذمیوں کو مسلمانوں کے پاس وفا اور حسن سیرت کا خوب اچھی طرح تجربہ ہوگیا، تو یہی کافر مسلمانوں کے دشمن کے گہرے دشمن، اور مسلمانوں کے دوست کے بہترین دوست بن گئے، دشمنوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد کرنے لگے. ان تمام غیر مسلم شہروں کے لوگوں میں سے جن سے مسلمانوں کی صلح تھی کچھ لوگ چھانٹ چھانٹ کر جاسوس بنا کر روم بھیجے گئے، کہ وہ معلوم کرکے بتائیں، وہاں کیا تیاریاں ہو رہی ہیں، وہ لوٹ کر آئے، اور انہوں نے بتایا کہ رومیوں نے اتنا بڑا لشکر جمع کر لیا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں جمع کیا ہوگا.

حیرت انگیز فیصلہ جب یہ خبریں کثرت اور تواتر سے ابو عبیدہ کو پہنچنے لگیں تو وہ اور عام مسلمان بھی چوکنے ہوئے اور ابو عبیدہ نے ان تمام ممالک کے گورنروں کو جنہیں وہ صلح کرکے پیچھے چھوڑ آئے تھے، لکھا کہ انہوں نے غیر مسلموں سے جو جزیہ اور خراج وصول کیا ہے. وہ واپس کر دیں، اور ان سے کہہ دیں کہ ہم تمہارا مال تمہیں واپس کرتے ہیں. کیونکہ ہمیں اطلاع ملی

ہے کہ ہمارے مقابلہ کے لئے بہت بڑا لشکر تیار ہے۔ اور ہماری تمہاری شرط یہ تھی کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ اور حفاظت اس وقت ہم کر نہیں سکتے۔ لہٰذا ہم نے تم سے جو کچھ لیا تھا وہ تمہیں واپس کرتے ہیں۔ البتہ اگر خدا نے ہماری مدد کی اور ہمیں فتح حاصل ہوئی تو جو شرائط تمہارے درمیان طے پائے ہیں، ہم ان پر ضرور عمل کرینگے۔

جب گورنروں نے ذمیوں سے یہ کہا، اور ان کا مال واپس کیا، تو ذمیوں نے کہا، خدا تمہیں ہمارے درمیان واپس لائے۔ اور تمہاری مدد کرے۔ اگر آج تمہارے بجائے ہمارے ہم مذہب ہوتے تو نہ صرف یہ کہ وہ یہ رقم واپس نہ کرتے، بلکہ جو کچھ ہمارے پاس اس کے علاوہ ہوتا اسے بھی وہ چھین لیتے، اور ہمارے لئے کچھ بھی نہ چھوڑتے، اور سب کچھ لیکر چمپت ہو جاتے،

پھر جب روم کو شکست ہوئی اور مسلمانوں کو خدا نے فتح و نصرت عطا فرمائی تو حضرت ابوعبیدہ نے عمر بن خطابؓ کو اس واقعہ کی اطلاع دی حضرت عمرؓ نے انہیں تحریر فرمایا:

حضرت عمرؓ کا مکتوب!

میں مسلمانوں کو تلقین کرتا ہوں کہ وہ ذمیوں پر ظلم نہ کریں۔ انہیں تکلیف نہ پہنچائیں۔ بغیر حق کے ان کا مال نہ کھائیں، تم نے ان سے جو شرطیں کی ہیں انہیں پورا کرو اور جو کچھ ان سے عہد کیا ہے، اسے اچھی طرح نباہو!

امن و صلح کے جو قواعد غیر مسلموں سے متعلق اسلام نے مشروع کئے ہیں، ان سے نیز سلف کے کئے ہوئے عہدناموں اور ان کے طرز عمل سے ثابت ہو گیا کہ اسلام ان لوگوں سے دوستی اور مسالمت کو منع نہیں کرتا جو اسلام کے علاوہ دوسرے دین پر عمل پیرا ہوں، بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں سے برسرِ پرخاش نہ ہوں،

غیر مسلموں سے تجارتی تعلقات

اسی طرح اسلام کسی اسلامی مملکت کو کسی غیر مسلم حکومت سے تجارتی تعلقات کے قائم کرنے سے منع نہیں کرتا۔ نہ وہ اس مقصد کے ماتحت کہ وہ عہدناموں کے نباہ اور کافروں کے طور وطریقوں کی دیکھ بھال کریں، سفیروں کو ناپسند کرتا ہے۔

اس طرح اسلام، مسلمانوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آئیں۔ ان کے ساتھ برابری کا برتاؤ کریں۔ ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کریں، ان کے ساتھ کاروبار کریں۔

رہا حضرت خالد کی ذمیوں پر اس پابندی کا معاملہ کہ وہ مسلمانوں کے لباس سے مشابہت نہ کریں اور حضرت ابوعبیدہ کی یہ پابندی کہ وہ عید کے روز سلاح جنگ سے آراستہ نہ ہوں، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غیر مسلموں پر کوئی لباس ناجائز ہے۔ وہ ہر لباس سوائے لباس جنگ کے پہن سکتے ہیں کیونکہ یہ روح مسالمت و مصالحت کے منافی ہے۔

مسلمانوں کے لباس سے مشابہت کی جو ممانعت ہے وہ بھی کسی تحقیر کے خیال سے نہیں، صرف اس لئے کہ ہر قوم اپنے دین، لباس، زبان اور تمام معاملات میں ایک دوسرے سے ممیز رہے، چنانچہ احادیث میں متعدد

مواقع پر لفظ قومیت پر زور دیا گیا ہے۔ اور کسی امت کے دوسری امت میں فنا ہو جانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا گیا "خالفوا سنۃ المجوس" یعنی مجوسیوں کے طور طریقوں کو اختیار نہ کرو، اسی طرح سے غیر مسلموں کو مسلمانوں کی مشابہت سے منع کیا گیا۔

بات کا بتنگڑ!

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے نظری طور پر اپنی کتاب قرآن پاک میں اور مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ کبھی اور کسی حالت میں غیر انسانی سلوک اور نامنصفانہ برتاؤ کے مرتکب نہیں ہوئے۔ انہوں نے نازک سے نازک وقت پر اپنی ان ذمہ داریوں کو بڑی بلند حوصلگی اور وقار کے ساتھ انجام دیا۔ عین اس وقت جب رومیوں کا لشکر گراں طوفان بلاخیز کی طرح ان پر ٹوٹ پڑنے والا تھا، انہیں روپیہ کی ضرورت تھی۔ ساز و سامان جنگ کی ضرورت تھی۔ لڑنے والے آدمیوں اور سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ ایسے وقت آدمی ادھر، ادھر سے روپیہ جمع کرتا ہے۔ جمع کیا ہوا روپیہ واپس نہیں کر دیتا۔ لیکن مسلمان احکام اسلامی کے پابند تھے۔ اپنی ضروریات اور خواہشات کے پابند نہیں تھے۔ انہوں نے جزیہ اور خراج کی صورت میں غیر مسلموں سے جو رقم وصول کی تھی، اس کی بنیاد صرف یہ تھی کہ ان کی جان و مال کی حفاظت کریں گے۔ اور اب کہ ایک بہت بڑے طاقت ور اور بڑی منظم سی فوج رکھنے والے دشمن سے انہیں نبرد آزما ہونا تھا۔ اور اس موقع پر وہ اپنے ذمیوں کی حفاظت، جان و مال کی ذمہ داری نہیں لے سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بے تامل اور بے وسواس وہ ساری رقم واپس کر دی جو ان سے وصول کی تھی، اور اس کی ذرا پروا نہ کی کہ اس طرح کتنے بڑے

نقصان سے دوچار ہوں گے۔ اور اس طرزِ عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہ غیر مسلم مسلمانوں کے جان نثار، اور خدا کا رہن گئے، ان کی فتح و کامرانی کی دعائیں مانگنے لگے۔" اپنی قوم کے سرداروں اور بادشاہوں پر انہیں ترجیح دینے لگے۔

مملکتِ اسلامی کا مالی نظام

اور

اُس مالی نظام کے وسائل و ذرائع

حکومت کی سیاست مالیہ سے مراد یہ ہے کہ آمد و خرچ کا وہ نظام جو حکومت کی ضروریات کو کافی ہو، مصالح عامہ کے موافق ہو، اس لئے ضروری ہے، کہ وہ افراد ملک پر بار و ابار کا سبب نہ ہو، خصوصی مصلحتوں کی اس سے اضاعت نہ ہوتی ہو، فلاح عامہ کے امور سر انجام پاتے ہوں؛

محاصل اور ٹیکس!

اس نظام کو مبنی بر عدل اس وقت کہہ سکتے ہیں جب اس میں دو چیزیں پائی جاتی ہوں:-

(۱) آمدنی کے حصول میں اس کا سختی سے لحاظ رکھا جائے کہ وہ عدل اور مساوات کے منافی نہ ہو، کسی فرد سے وہ وصول نہ کیا جائے جو خلاف قانون ہو، اور کوئی قانون وہ مطالبہ نہ کرتا ہو جو اس کی قوت برداشت سے باہر ہو، اور مطالبہ وہی کیا جائے، جس کی واقعی ضرورت ہو،

(۲) تقسیم ایراد میں حکومت کے تمام مصالح کا پورا پورا لحاظ ان کی اہمیت کے مطابق رکھا گیا ہو؛

اب ایک نظر اسلام کے ذرائع آمدنی (موارد مالیہ) پر ڈالئے، ذرائع آمدنی یہ ہیں:-

(۱) اموال میں زکوٰۃ ہے اور اس کی ضمنی تقسیمیں،

(۲) قابل کاشت زمین کا ٹیکس ہے؛

(۳) اشخاص کا ٹیکس ہے۔ جو اہل کتاب سے جزیہ کی صورت میں وصول
کیا جاتا ہے۔

(۴) عشور ــــــ یہ وہ ٹیکس ہے، جو آمد و درآمد پر وصول کیا جاتا ہے

(۵) خمس غنائم،

(۶) ترکہ یعنی وہ مال جس کا کوئی وارث نہ ہو، یا گرا پڑا لاوارث مال، ہر
وہ مال جس کا کوئی مالک نہ ہو، ہر وہ مال جس کا لینا مسلمانوں کے لئے
جائز ہو،

دولت اسلامیہ کے مالیات میں یہ ہیں ذرائع آمدنی، جن میں سے بعض کتاب و سنت سے ظاہر ہیں، اور بعض صدر اسلام میں صحابہ کرام کے اجتہاد سے ثابت ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے متعلق تفصیلی احکام موجود ہیں، ان میں سے ہر ایک پر ہم گفتگو کرتے ہیں، اس کے بعد ہم ان کے مصارف اور ان کے احکام پر بحث کریں گے۔

ذرائع آمدنی کی بنیاد!

ٹیکس کے بارے میں ارباب فکر ونظر کے دو گروہ ہیں اور ہر ایک کی جدا جدا رائے ہے۔

جو لوگ نظریۂ عقد اجتماعی کے قائل ہیں ان کی یہ رائے ہے کہ ٹیکس کی بنیاد یہ ہے کہ وہ افراد و ملک کی رضامندی پر مبنی ہو کہ ہر شخص اپنی آمدنی کا ایک معین جزو حکومت کے حوالہ کریگا۔ کیونکہ حکومت ہی اس شخص کی حفاظت اور اس کے باقی مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ وہ اس حکومت کے سایہ میں اپنے مال سے تمتع کرتا ہے، اپنے حقوق سے بہرہ ور ہوتا ہے اور امن اور اطمینان سے رہتا ہے، یا اسے یوں سمجھئے کہ ہر انسان اپنے

وزلت سے باہر نکلتا ہے۔ اور اپنے نبی نوع کے ساتھ ایک معاہدہ (عقد اجتماعی کرتا ہے، جس کے ماتحت وہ امن و سلامتی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس گروہ کی رائے میں ٹیکس وہ معاوضہ ہے جس کی بنیاد باہمی رضامندی ہے۔

لیکن جو لوگ نظریۂ عقد اجتماعی کے قائل نہیں ہیں، ان کے نزدیک حکومت کا یہ کام ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے زیر سایہ رکھنے کے معاوضہ میں ن کے مال کا ایک حصہ اپنے ضروریات، مصالح عوام، سڑکوں کی تعمیر، امن و امان کی بحالی، ملک کو دشمن کے حملہ سے محفوظ رکھنے کی تدابیر اور زمین کی سیرابی، اور ان تمام امور کی بجا آوری کے لئے، جن سے زندگی استوار ہوتی ہوئے لیتی ہے۔

اس گروہ کی رائے میں ٹیکس وہ آمدنی ہے جسے خود حکومت افراد لک پر عائد کرتی ہے۔ اور مصالح عوام کے پیش نظر اس کی تشخیص کرنی اداے وصول کر لیتی ہے۔

ان دونوں گروہوں کی رائے میں اس حد تک کوئی اختلاف نہیں ہے کہ افراد پر ٹیکس عائد ہونا چاہیئے، اختلاف جو کچھ ہے وہ اس کے مقصد و منشا میں ہے۔ پہلی رائے کے مطابق ٹیکس عائد کرنے کا منشا یہ ہے کہ افراد خود حکومت چلانے کے لئے اپنے اوپر ایک رقم کی ادائیگی عائد کر لیتے ہیں، تاکہ وہ ان کی حفاظت کرے۔ ان کے املاک، جائداد اور مال کی رکھوالی کرے۔ ان کے امن و اطمینان کی کفیل رہے، اور دوسری رائے کے مطابق حکومت کو خود اختیار ہوتا ہے کہ تامین افراد اور تدبیر مصالح کے پیش نظر حسب ضرورت لوگوں پہ ٹیکس عائد کرے۔ ہر دو آراء کو پیش نظر رکھئے تو معلوم ہوگا کہ اختلاف جو کچھ ہے وہ نظری ہے، عملی نہیں ہے، اس کا

اثر عمل پر نہیں پڑتا،

مالیات اسلامی کی بنیاد و اساس

موارد اسلامیہ کی بنیاد رکھیا ہے یہ کہ یہ وہ واجبات ہیں جو افراد پر ان کے تمتع حقوق کے معاوضہ اور مقابلہ میں عائد کئے گئے ہیں۔

زکوٰۃ اور صدقات کے تمام انواع مالداروں پر اس لئے فرض ہیں کہ ان کے تمتع مالی کے مقابلہ میں حکومت کے یہ وہ حقوق ہیں، جو ان پر فرض ہوئے ہیں،

ایک تو یہ کہ انہیں اور ان کے مال کو ہر قسم کے غصب، لوٹ مار اور ناجائز استحصال کے مقابلہ میں امان حاصل ہوتی ہے، کیونکہ اگر حکومت ان کی رکھوالی نہ کرے، تو ان کی ذات اور ان کا مال دونوں خطرہ میں پڑ جائیں

دوسرے یہ کہ مال داروں کے مال کا "تزکیہ" بھی مقصود ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ـــــ خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا" ـــــ اسی طرح متقین کا وصف بیان کرتے ہوئے باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ـــــ "وفی اموالھم حق للسائل والمحروم" یعنی ان کے مال میں غریبوں اور فقیروں کا حصہ ہے۔ ـــــ اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا ہے ـــــ "وآتوا حقہ یوم حصادہ!" ـــــ

زکوٰۃ اور جزیہ

جس طرح مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہے اسی طرح غیر مسلموں پر جزیہ واجب ہے ... دونوں یکساں تمتع حقوق کے مقابلہ میں عائد کئے گئے ہیں، یہ معاوضہ ہیں جان و مال کے امان کا! غیر مسلم بھی اسلامی حکومت میں ان حقوق سے بہرہ ور ہوتے ہیں، جن سے مسلمان فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کے اوپر

صدقات اور اسی نوع کے ایسے دوسرے ٹیکس عائد نہیں ہیں جو مسلمانوں پر ہیں، اس لئے کہ وہ فروع شریعت کے مکلف نہیں ہیں، لہٰذا ان کے اوپر جزیہ واجب کر دیا گیا۔ جو اس زکوٰۃ کا بدلہ ہے، جو مسلمانوں پر واجب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی اہلِ کتاب مسلمان ہو جائے، تو اس پر سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے اور ادائے زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے بشرطیکہ وہ صاحب مال ہو، جزیہ بھی دوسرے موارد اسلامیہ کی طرح تمتع حقوق ہی کے صلہ میں واجب ہو جاتا ہے۔ جس کی دلیل ابوعبیدہ کا وہ واقعہ ہے کہ جب انہوں نے اہل شام سے صلح کی، روم کی جنگی تیاریوں کی انہیں اطلاع ملی، تو انہوں نے ذمیوں سے لی ہوئی رقم جزیہ لوٹا دی اور کہہ دیا، ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے۔ اس لئے یہ رقم واپس کرتے ہیں، باقی اگر خدا نے ہمیں فتح و نصرت سے نوازا اور ہم پھر واپس آئے، تو ان شرائط پر عمل کریں گے۔ جو ہمارے اور تمہارے درمیان طے ہو چکے ہیں، پھر جزیہ لیں گے۔ اور تمہیں ذمّی بنا لیں گے۔

خراج کی نوعیت!

خراج اس زمین کا ٹیکس ہے، جس پر غیر مسلم قابض اور متصرف ہوتے ہیں، اسی طرح کا ٹیکس عشر اور نصف عشر کے نام سے ان مسلمانوں پہ واجب ہے، جن کے قبضہ میں کوئی زمین ہو،

قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں فرماتے ہیں :۔

"جب عمر بن خطاب کے پاس سعد بن ابی وقاص کی طرف سے جیش عراق آیا، تو آپ نے اصحابِ رسولؐ سے اس زمین کی تقسیم کے بارے میں مشورہ فرمایا، جو عراق و شام میں

مسلمانوں کے ہاتھ آئی تھی، ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ یہ زمین جن مجاہدوں نے فتح کی ہے، انہی میں تقسیم کر دی جائے یہ سُنکر حضرت عمرؓ نے اس بات سے اختلاف کیا عبدالرحمن بن عوف نے پوچھا آپ کی رائے کیا ہے ؟ حالانکہ زمین تو انہی لوگوں کا حق ہے جنہوں نے اسے فتح کیا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا، اگر میں ارض شام اور ارض عراق کو فتح کرنے والی افواج میں تقسیم کر دوں تو پھر سرحدوں کی حفاظت افواج کی تیاری، امن و امان کی بحالی، اور نظم و انتظام کرنے کے مصارف کہاں سے آئیں گے ؟ حضرت عمرؓ سے اختلاف کرنے والوں کا کہنا تھا کہ جو کچھ ہماری تلواروں نے فتح کیا ہے وہ ہمارا حصہ ہے، اس میں بعد کے آنے والوں کا حصہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ لیکن حضرت عمر اپنی رائے پر قائم رہے، لوگوں نے کہا، اچھا مشورہ کیجئے۔ چنانچہ مہاجرین اولین سے مشورہ کیا گیا۔ یہاں بھی اختلاف رونما ہوا، عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی رائے تھی کہ زمین فوج میں تقسیم کر دی جائے۔ عثمانؓ، علیؓ طلحہؓ، اور ابن عمرؓ کی رائے، حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق تھی۔

اب حضرت عمرؓ نے، دس انصار کو بھی شریک مشورہ کیا پانچ نمائندے قبیلۂ اوس کے تھے، اور پانچ قبیلۂ خزرج کے، یہ حضرات اپنے اپنے قبیلہ کے کبار و اشراف تھے جب یہ سب حضرات جمع ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے حمد و ثنا کے

بعد فرمایا:۔
"آپ کے معاملات کا جو بار میں نے اٹھا رکھا ہے اور جو امانت میں نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے، اس میں شرکت کے لئے میں نے آپ کو تکلیف دی ہے، میں بھی آپ میں سے ہوں، آج آپ حق کا فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں، خواہ کسی کو مجھ سے اختلاف ہو یا اتفاق، میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ صرف میری رائے کی پیروی کریں، آپ کے پاس خدا کی کتاب ہے، جو حق ہی کہتی ہے، پس خدا کی قسم میں جو کچھ کہتا ہوں، میرا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ حق کے مطابق ہو، لوگوں نے کہا "ہم سن رہے ہیں فرمایئے یا امیرالمومنین"!

حضرت عمرؓ نے فرمایا، آپ نے ان حضرات کی رائے سن لی جن کا خیال ہے کہ میں ان کے حقوق پر چھاپہ مار رہا ہوں، اور میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ سے کوئی ظلم سرزد ہو، اگر میں نے ان پر ذرا بھی ظلم کیا ہو، اور ان کا حق کسی اور کو دے دیا ہو، تو یقیناً میں نے شقاوت کی، لیکن میرا خیال ہے کہ ارض کسریٰ کی فتح کے بعد اب کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں انکی زمین، ان کے مال اور ان کی املاک کا مالک بنا دیا۔ اہل لوگوں کے درمیان میں نے مال غنیمت کو تقسیم کر دیا، اور خمس نکال لیا، لیکن زمین کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ فوج میں تقسیم نہ کی جائے اور اسے خراج پر وہیں کے رہنے والوں کو

سونپ دیا جائے، اور جزیہ بھی ان پر عائد کر دیا جائے۔ یہ مقاتلہ کرنے والے مسلمانوں کے لئے ہوگا، اور ان مسلمان نسلوں کے لئے بھی جو بعد میں آئیں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ ان سرحدوں کی حفاظت کے لئے سپاہیوں کی ضرورت ہے، آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان بڑی بڑی متمدن مملکتوں، مثلاً شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصر —— کے لئے، مکمل اور بہت فوج کی ضرورت ہر وقت رہیگی، اب اگر یہ زمین تقسیم کر دی جائے تو ان واجبات (دفاع، حفاظت اور حملہ، ہجوم) کے مصارف کہاں سے آئیں گے۔؟

حاضرین نے بالاتفاق کہا: "آپ کی رائے بہتر اور انسب ہے، جو آپ نے کہا، وہ ٹھیک ہے، جو آپ نے سوچا، وہ درست ہے، اگر ان ممالک کی سرحدوں کی حفاظت کا انتظام نہ کیا گیا، ان کو قابو میں رکھنے کے لئے فوج کا بندوبست نہ کیا گیا۔ تو اہل کفر پھر ان ممالک پر چڑھ دوڑیں گے"۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا، ہاں، اب حقیقت منکشف ہوگئی پھر آپ نے فرمایا، کوئی ایسا عقیل و فہیم آدمی چاہیے، جو اس زمین کا صحیح بند وبست اور پیمائش کر سکے۔ لوگوں نے کہا، عثمان بن حنیف اس کام کے لئے بہت زیادہ موزوں ہیں، انہیں آپ اس سے بھی اہم کام سونپ سکتے ہیں، وہ عقل، بصیرت، تجربہ، ہر چیز رکھتے ہیں،

حضرت عمرؓ نے انہیں ارض سواد کی مساحت کے کام

پر روانہ کر دیا۔

حضرت عمرؓ کے فیصلہ کا نفاذ

غرض اس بنیاد پر حضرت عمرؓ نے زمین مقبوضہ فوج کو نہیں دی، اور اُسے وہیں کے باشندوں کے پاس اس شرط پر رہنے دیا کہ وہ مسلمانوں کو خراج ادا کرتے رہیں۔ آپ نے شام میں بھی وہی کیا۔ جو عراق میں کیا تھا۔

قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں، کہ حضرت عمرؓ کی یہ رائے کہ آپ نے زمین کی تقسیم ممنوع قرار دیدی، یہ دراصل اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک آیت قرآنی ہی کے حوالہ سے سمجھایا تھا، اور اس میں مسلمانوں کے لئے بھلائی تھی، اور یہ خراج کے بارے میں آپ کی رائے جو تھی، وہ بھی مصلحت عمومی و اجتماعی پر مبنی تھی،

درآمد و برآمد کے محاصل

وہ ٹیکس جو بلاد اسلامیہ میں مال تجارت (درآمد و برآمد) پر عائد تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کی تجارت میں توازن اور مساوات قائم رہے۔

جہاد و قتال میں جو مالِ غنیمت ملتا ہے، اس میں خمس مصلحت عامہ کے پیش نظر عائد کیا گیا۔ ارشاد خداوندی ہے ——— "واعلموا انما غنمتم من شئ فان اللہ خمسہ والرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین، وابن السبیل ———" یعنی مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہے اور رسول، ذوی القربیٰ یتامیٰ، مساکین اور مسافر کے لئے ہے ——— "

ـــــــــــــــ

لہ کتاب الخراج ( )

لاوارث مال، گرا پڑا لاوارث مال، ایسے مالک کا مال، جو دولت اسلامیہ کے قبضہ میں آتا ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ جس مال کا کوئی خاص مالک نہ ہو، وہ مصلحت عامہ کے لئے وقف کر دیا جائے۔ جو شخص ذرائع آمدنی سے محروم ہو، جس کے نفقہ کا کوئی انتظام نہ ہو، اس کی کفالت بیت المال ہی سے تو کی جاتی ہے۔!

غرض دولت اسلامیہ کے موارد مالیہ؛ ذرائع و وسائل آمدنی، پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سلسلہ میں جو نصوص وارد ہیں، یا کبار صحابہ نے جو اجتہادات کئے ہیں، یا مشورہ سے جو فیصلے کئے ہیں، وہ سب مصالح عامہ کے پیش نظر کئے گئے ہیں، تاکہ ایک طرف نظام حکومت استوار رہے، دوسری طرف لوگوں کی جان و مال کو امن رہے، اور تیسری طرف فاقہ کش لوگوں کا روزہ ٹوٹے، غرض وحدت اجتماعیہ، تعاون، تضامن، مصالح عامہ اور قواعد عدل کی کہیں بھی خلاف ورزی نہیں کی گئی ہے۔

محاصل کے شرائط۔ محاصل، افراد کے مال کے ایک حصہ پر حکومت کا وہ استیلا ہے جس کے سبب وہ اس کے تمتع سے محروم ہو جاتے ہیں، لیکن اس حرمان کے صلہ میں، انہیں جان و مال کی امان ملتی ہے، اگر یہ حرمان نہ ہو تو مصالح عامہ پورے نہیں ہو سکتے، نظام حکومت چل نہیں سکتا، امور اجتماعی انجام نہیں پا سکتے،

لیکن محاصل کی تشخیص و تحصیل کے سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ تحفیف تصدلیہ ملحوظ رہے۔ علمائے اقتصاد نے ہر محصول کیلئے چار شرطیں ضروری اور لازمی قرار دی ہیں:-

(۱) عدل و مساوات — یعنی محصول اسطرح عائد کیا جائے کہ

وہ ہر شخص کی مالی مقدرت کے موافق ہو، اور اس کا اصول ایک ہو، اور اس میں عدل و مساوات ملحوظ خاطر رہے۔

(۲) اعتدال بھی اس کا ایک جزو ہے یعنی محصول "ضرورت" سے زیادہ نہ ہو۔

(۳) وہ ایک نظام کے ماتحت ہو کہ ہر شخص جان لے کہ اس پر کیا واجب ہے۔ کس طرح ادا کیا جائے گا۔ کب اس کی ادائیگی ہو گی۔

(۴) محصول کی تعیین و تحصیل میں افراد کے مصالح کی مراعات ضروری ہے۔

ٹیکس اور ڈاکہ! علمائے اقتصادیات کا یہ خیال بھی ہے کہ ٹیکس اس مال پر ہونا چاہیئے جو نامی ہو یعنی بڑھتا رہتا ہو، اور ٹیکس کی رقم اس مال کے نفع کا ایک جزو ہونی چاہیئے، ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ ٹیکس اصل مال کو کم کرنے یا اس میں نقص پیدا کرنے کا موجب ہو، چنانچہ بعض کا خیال ہے کہ :-

جو کچھ مال کے نفع میں سے لیا جائے وہ تو ٹیکس ہے، جو کچھ راس المال میں سے لیا جائے وہ ڈاکہ اور قزاقی ہے!

ایک اہم اصول تشخیص محاصل کے وقت یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے، کہ ٹیکس اتنا نہ ہو کہ وہ سارے نفع پر مشتمل ہو، اور آدمی یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ اپنے لئے نہیں، غیر کے لئے کماتا ہے۔ اس طرح نشاط کار کا جذبہ سرد ہو جائے گا۔"

اسلامی محاصل پر اگر کوئی شخص غور کرے، تو اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان میں شرائط اقتصاد پورے طور پر ملحوظ رکھے گئے ہیں، عدل،

مساوات اور مصالح عامہ و مصالح افراد کا سررشتہ کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے، تمام موارد اسلامیہ میں ان اصولوں کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

محاصل اسلامی کی نوعیت

زکوٰۃ اسی مال پر واجب ہے، جو نامی ہو، یعنی بڑھتا رہتا ہو، اور جس پر ایک پورا سال گذر چکا ہو، یہ اس لئے کہ زکواۃ، راس المال کے نفع میں سے ادا کی جائے گی۔ نہ کہ اصل سرمایہ میں سے،

خراج اسی زمین پر عائد ہوتا ہے جو سرسبز و شاداب ہو، جس کی زراعت ممکن ہو، بلکہ مالک بن انس کا تو قول ہے کہ لگان صرف ارض مزروعہ پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اور زمین کے زرعی ہونے کی شرط، یا اس کے زرعی ہونے کے امکان کی شرط کا مقصد یہی ہے کہ محصول اس کے ثمرہ اور منبے یا آمد سے ادا ہو،

عشر، نصف عشر، بھی نفع ہی میں سے دیا جاتا ہے۔ اور اس کا وجوب اس شرط پر مشروط ہے۔ کہ کھیتی میں بالیاں آ گئی ہوں، ان شرائط کا مقصد یہی ہے کہ محصول ثمرہ، اور نفع میں سے نہ کہ اصل اور سرمایہ میں سے دیا جائے۔

اسلامی محاصل کا ایک اور پہلو بھی ہے یعنی ان کا نصاب مقرر ہے اسی نصاب والے پر یا اس سے زیادہ پر محصول عائد ہو گا۔ اور نصاب سے کم والے کو معافی ہو گی۔ اس سے محصول نہیں لیا جائے گا۔

جزیہ، اسی شخص سے لیا جائے گا، جو غنی ہو، اور جزیہ دینے کی مقدرت رکھتا ہو، اس شخص سے ہرگز نہیں لیا جائے گا، جو غیر مستطیع ہو، اسی طرح خراج اس پیداوار سے لیا جائے گا جو زمین سے ہوئی ہو، اور جس

کے ادا کرنے کی زمین والا طاقت رکھتا ہو،

حضرت عمرؓ کا ایک سوال!

قاضی ابو یوسف عمرو بن میمون روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حذیفہ بن یمان کو دجلہ پار بھیجا، اور عثمان بن حنیف کو دوسری طرف جب دونوں واپس آئے تو ان سے پوچھا "تم نے زمین کے ساتھ کیا کیا؟ کہیں تم نے ایسا تو نہیں کیا کہ طاقت سے زیادہ لوگوں کو مکلف کیا ہو؟"

حذیفہ نے کہا، فاضل حصہ میں نے چھوڑ دیا، عثمان نے کہا، میں نے دوگنا حصہ چھوڑ دیا، البتہ اگر آپ فرمائیں تو اسے لے لوں۔" حضرت عمر نے کہا،" خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا، تو اہل عراق کو ایسا بنا دوں گا، کہ وہ میرے بعد کسی کے محتاج نہیں رہیں گے"!

غرض اسلامی محاصل میں اقتصاد پر خاص زور دیا گیا ہے قاضی ابو یوسف نے اپنے نوشتہ میں خلیفہ ہارون رشید کو لکھا کہ "جنہیں آپ والی بنائیں، ان کے لئے لازم کر دیں۔ کہ وہ جبر و جور نہ کریں، حقارت سے نہ پیش آئیں، ذلیل نہ کریں"!

عدل اور شرائط اقتصاد

اسلام کے محاصل میں عدل اور شرائط اقتصاد بھی پورے طور پر ملحوظ رکھے گئے ہیں، اگر غور کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے فتوحات کے جہاں اور سبب ہیں، وہاں ایک سبب محاصل اور ٹیکس کے سلسلہ میں ان کا عدل، اور مساوات بھی ہے۔ اور جن ممالک کو انہوں نے فتح کر لیا، وہاں ان کے پاؤں جمنے میں بھی اس خصوصیت سے انہیں بہت مدد ملی، کیونکہ فارس اور روم کے لوگ ناقابل برداشت محاصل کے بوجھ سے

تنگ آگئے تھے، اُن پر ایسے ایسے محاصل عائد کر دیئے گئے تھے جن
بوجھ ان سے اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ انصاف اس دور میں تھوڑا
نہ زمیندار کے ساتھ انصاف ہوتا تھا، نہ کسان کے ساتھ،

اس ماحول میں ابوعبیدہ اور اہل شام کے درمیان، جزیہ کی واپسی
جو واقعہ پیش آیا، تو ان کے دلوں میں مسلمانوں کی جگہ پیدا ہو گئی
واقعہ نے رومی شہنشاہیت کی بنیاد ہلا دی!

نمونہ اور اسوہ!

اوپر جو تصریحات پیش کی گئی ہیں، وہ ہر
کے لئے، ہر متمدن اور مہذب معاشرے
لئے، ہر اس مملکت کے لئے جو اسلامی ہونے کی مدعی ہو، نمونہ اور
کا کام دیتے ہیں، ان واقعات و حقائق کی روشنی میں بڑی
کے ساتھ ایسا نظام مالی مرتب کیا جا سکتا ہے، جو ایک طرف
کے مصالح اور ضروریات کا پورے طور پر کفیل ہوگا، دوسری طرف
اور عوام کو زحمت اور پریشانی سے نجات دے گا، اور ان دونوں
کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا، کہ امن و فلاح، اور رفاہ خوش حالی کا دور
شروع ہو جائے گا۔ اور حکومت کی ساکھ اتنی مضبوط ہو جائے گی کہ
زوال اور تزلزل کے خطرہ سے کبھی دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔

دولتِ اسلامیہ

اور

مالی وسائل و ذرائع

اسلام کے ذرائع آمدنی (موارد مالیہ) دو قسم کے ہیں۔

(۱) موارد دوریہ،

(۲) موارد غیر دوریہ،

موارد دوریہ میں :-

زکوٰۃ، خراج، جزیہ، عشور، داخل ہیں،

موارد غیر دوریہ میں،

خمس غنائم، خمس معادن، زکوٰۃ، ترکۂ لاوارث، گرا پڑا مال، اور وہ مال شامل ہو رہا ہے، جس کا مستحق کوئی خاص شخص نہ ہو،

اب ذیل میں ہم ان میں سے ہر ایک پر نسبتہً تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں،

زکوٰۃ زکوٰۃ مسلمانوں پر فرض ہے، اس کی تائید ان متعدد نصوص سے ہوتی ہے جو قرآن شریف میں وارد ہوئی ہیں، مثلاً فرمایا گیا :-

خذ من اموالهم صدقۃ تطهرهم وتزكيهم بها ـــــــ ،

گویا زکوٰۃ کا مقصد تطہیر و تزکیہ قرار پایا۔

نیز فرمایا گیا ـــــــ وآتوا الزكوٰة ـــــــ یعنی زکوٰۃ ادا کرو،

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ــــــــــ "فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین ـــــــــــ" یعنی اگر وہ لوگ توبہ کرلیں، زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں "

اسی طرح سنت رسولؐ کا مطالعہ کیجئے، تو معلوم ہوگا، متعدد احادیث سے اس کی فرضیت ثابت ہے، اس سلسلہ میں متعدد آیات مجمل کی حدیث نے تفسیر بھی کی ہے۔ نیز زکوٰۃ کی حکمت، اور اس کے سرِ تشریعی پر بھی روشنی ڈالی ہے، حدیث میں زکوٰۃ کو ان ستونوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے جن پر اسلام قائم ہے،

انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ قصبۂ تمیم کا ایک شخص رسول اللہ کے پاس آیا، اس نے کہا، یا رسول اللہؐ میں بہت بڑا مالدار ہوں ساتھ ہی ساتھ میرے متعلقین بھی کافی ہیں، آپ فرمایئے، میں کیا کروں اور کس طرح اپنا روپیہ خرچ کروں"؟ رسول اللہؐ نے فرمایا "اپنے مال کی زکوٰۃ نکالو، وہ ایک پاک چیز ہے، تمہیں بھی پاک کردے گی، اپنے اقربا کی مدد کرو، مسکین کا حق پہچانو، پڑوسی اور سائل کی حاجت روائی کرو"

غرض متعدد آیات سے، اور ان نوشتوں سے جو اپنے ولاۃ عمال کو تحریر فرمائے، زکوٰۃ کی افادیت، اس کی مقدار اور اس کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے، ان میں وہ آپ کا نوشتہ بہت اہم ہے جو عمرو بن حزم کے نام تھا؛

زکوٰۃ کس مال پر واجب ہے؟

اسلام میں مسلمان کے مال میں کوئی حق مفروض سوا زکوٰۃ کے کوئی نہیں ہے۔ جن اموال پر زکوٰۃ فرض ہے وہ چار ہیں؛

(۱) نقد،
(۲) سونا چاندی،
(۳) مال تجارت،
(۴) اونٹ، گائے، بکری کے سوائم، ارض عشریہ (پھل دار درخت)

ان اموال میں سے کسی پر بھی اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، جب تک وہ نصاب مقررہ کی حد تک نہ پہنچ جائے، کوئی مال اگر شارع کے مقرر کردہ نصاب سے کم ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

نقد میں سونے پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے، جب وہ ۲۰ دینار کے بقدر ہو، چاندی پر جب کہ وہ ۲۰۰ درہم کے بقدر ہو، اسی اعتبار سے مال تجارت کا نصاب مقرر کیا جائے گا، ۵ اونٹ ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی، ۳۰ گائے ہوں، تو ان کی زکوٰۃ نکلے گی، ۴۰ بکریاں ہوں تو ان کی زکوٰۃ نکلے گی، اناج اور پھلوں کی زکوٰۃ کے لئے ضروری ہے، کہ وہ ۵ وسق ہوں،

ان اموال کی زکوٰۃ کے جو نصاب مقرر ہیں، ان میں متعدد شرائط ایسے رکھے گئے ہیں کہ نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ زکوٰۃ نفع میں سے دینی پڑتی ہے، اصل مال سے نہیں،

زکوٰۃ کے ضروری شرائط

مثلاً زکوٰۃ کے لئے جو مقدار نصاب کو پہنچ چکا ہو، ایک شرط یہ ہے کہ وہ نامی ہو، شرط نمو صرف فعلاً ہی نہیں ہے، یہ بھی ہے کہ وہ نمو کے قابل ہو، خواہ روپیہ

خود بڑھ رہا ہو، یا مال تجارت کی صورت میں بڑھ رہا ہو،

دوسری شرط یہ ہے کہ مال زکوٰۃ پر کامل ایک سال گزر چکا ہو، یہ مدت اس لئے رکھی گئی ہے کہ مال کے بڑھنے کا صحیح اندازہ ہو سکے، حدیث میں آیا ہے ——— "لا زکوٰۃ فی مال حتی یحول علیہ الحول" یعنی اس مال پر زکوٰۃ نہیں ہے، جس پر پورا ایک سال نہ گزر چکا ہو،

تیسری شرط یہ ہے کہ مالک کی حاجات اصلیہ سے فاضل ہو، اس لئے کہ جو مال حاجت اصلیہ کے لئے ہو، اس میں زیادتی نہیں ہو سکتی، اس میں سے اگر زکوٰۃ لی جائے، صاحب مال کو غیر ضروری تکلیف پہنچے گی، اور اس پر دینا گراں گزریگا، حالانکہ حدیث میں وارد ہوا ہے ——— "وادوا زکوٰۃ اموالکم طیبۃ بھا انفسکم" یعنی اپنے مال کی زکوٰۃ ہنسی خوشی دو۔

جن جانوروں پر زکوٰۃ ہے، ان کے لئے شرط ہے کہ وہ سال کے زیادہ حصہ میں خوب اچھی طرح چرائے گئے ہوں، تاکہ ان کا دودھ خوب اُتر آیا ہو اور نسل بھی بڑھ گئی ہو، اس طرح ان جانوروں کی جو زکوٰۃ ادا کی جائے گی، وہ نفع پر ہوگی، نہ کہ اصل مال پر،

اناج کی زکوٰۃ کی شرط یہ ہے کہ کھیتی خوب زوروں پر آگئی ہو، اور پھلوں کے لئے یہ شرط ہے کہ ان کا بُور اچھی طرح آ گیا ہو،

زکوٰۃ مفروضہ کی قسمیں،

اموال کی زکوٰۃ مفروضہ کی دو قسمیں ہیں،

(۱) مقرر،

(۲) نسبی،

مقرر میں جانوروں کی زکوٰۃ ہے:

پانچ سے ۹ اونٹوں تک ایک بکری زکوٰۃ میں دی جائے گی،

دس سے ۱۱۴ اونٹوں تک دو بکریاں زکوٰۃ دی جائیں گی، ۱۵ سے آخری منصوص علیہ ترتیب تک ۳ بکریاں زکوٰۃ میں دی جائیں گی۔

۳۰ گائیوں پر چھ مہینہ کا بچھڑا (تبیع)، اور ۴۰ سے لے کر آخر منصوص تک سال بھر کی گائے،

۴۰ بکریوں سے لے کر ۱۲۰ بکریوں تک ایک بکری اور ۱۲۱ سے ۲۰۰ بکریوں تک دو بکریاں، ۲۰۰ سے لے کر آخر منصوص تک ۳ بکریاں زکوٰۃ میں دی جائیں گی،

یہی وہ زکوٰۃ ہے، جو اس تمام مال پر ادا کی جاتی ہے، جو زکوٰۃ کا مستحق ہو۔

سونے اور چاندی کا نصاب زکوٰۃ ربع عشر ہے، کھیتی باڑی اور پھل پھلواری کا نصاب نصف عشر ہے جب کہ مالک سینچائی آلات سے کرکے تکلیف اٹھاتا ہو، اور جب وہ کوئی تکلیف نہ اٹھاتا ہو، اور سینچائی بارش سے ہوتی ہو تو عشر ہے۔

ان تصریحات سے اندازہ ہو گیا ہوگا، کہ شارع نے زکوٰۃ میں کن کن چیزوں کا لحاظ رکھا ہے، اور اقتصادی اصولوں کو کہاں تک ملحوظ رکھا ہے۔

(۲) خراج زرعی زمین کے ٹیکس کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) وہ زمین جس کی پیداوار کا دسواں حصہ یا اس کا نصف دینا پڑتا ہے، یہ زمین عشری کہلاتی ہے۔

(۲) وہ زمین جس کا محصول اس کی مساحت کے اعتبار سے مقرر کر دیا جائے اسے خراجی زمین کہتے ہیں۔

زمین کی لگان عائد کرتے وقت یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ زمین مسلمان کی ملک ہے یا غیر مسلم کی۔

اگر مسلمان کی ہے تو وہ زمین عشری قرار دی جائے گی، اور اگر غیر مسلم کی ہے تو اسے خراجی قرار دینگے،

ہر وہ زمین جو مسلمان کے قبضہ میں ہو، یا جس کے مالک برضا و رغبت مسلمان ہو گئے ہوں، یا جسے مال غنیمت کے طور پر مسلمانوں نے حاصل کیا ہو، اور وہ فوج پر تقسیم ہو گئی ہو ——— تو یہ زمین عشری ہوگی۔

ہر وہ زمین جسے مسلمانوں نے فتح کیا ہو، اور پھر اسے وہیں رہنے والوں کو سونپ دیا ہو، یا ان سے صلح کر لی ہو یہ زمین خراجی کہلائے گی۔

خراج، عشر، نصف عشر، یہ وہ ٹیکس ہیں، جو زرعی زمین پر عائد ہوتے ہیں، زرعی زمین جب مسلمان کے قبضہ میں ہوگی، تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مخاطب ہوگا ——— أتوحقه يوم حصاده، یعنی فصل کاٹنے کے وقت اس کا حق (زکوٰۃ) ادا کر دو۔"

اس حق مجمل کی تفصیل حدیث میں یوں بیان کی گئی ہے:۔

ماسقته السماء ففيه العشر، وما سقى بغرب، او دالية ففيه السماء ففيه نصف العشر ——— یعنی جس زمین کو بارش نے سیراب کیا ہو، اس پر عشر ہے، اور جسے ڈول یا جھال سے سینچا گیا ہو اس پر نصف عشر ہے۔

خراج اور عشر کی نوعیت

جو زمین غیر مسلم کے قبضہ میں ہو وہ تو آیت بالا کا مخاطب ہے

نہیں سکتا۔ کیونکہ غیر مسلم فروع شریعت کے مخاطب نہیں ہیں، نہ ان کے اوپر نصوص واردہ فرض ہیں، لیکن بایں ہمہ یہ زمین چھوڑی بھی نہیں جا سکتی، لہٰذا امام کے لئے ضروری ہوا کہ اپنی صوابدید کے مطابق اس پر خراج مقرر کرے۔ پس خراج گویا عشرہ کا مقابل ہے، عشر زکوٰۃ ہے، و خراج فئ۔

کوئی زمین اگر ابتدا میں مسلمان کے ہاتھ میں ہو تو اس پر خراج نہیں مقرر ہوگا۔ غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو تو اس پر عشر نہیں مقرر ہوگا، لیکن بعد میں اگر زمین خراجی مسلمان کے پاس آجائے تو وہ .... خراجی رہیگی، اسطرح زمین عشری اگر غیر مسلم کے پاس آ جائے تو وہ بھی عشری رہے گی۔

جو خراج تعین پر مبنی ہو، وہ "خراج وظیفہ" کہلاتا ہے، جو زمین کی پیداوار میں ہو اسے "خراج مقاسمہ" کہتے ہیں اس کی کمی زیادتی کی کوئی حد نہیں مقرر کی جا سکتی، اس کا تعلق امام کی صوابدید پر ہے۔

حضرت عمرؓ کا ایک اہم اجتہاد

سب سے پہلے اپنے اجتہاد سے جس امام نے خراج ایجاد کیا، وہ حضرت عمر فاروقؓ ہیں، انہوں نے کبار صحابہ کے مشورہ سے یہ قدم اٹھایا تھا، اور ارض سواد پر خراج عائد کیا تھا۔ پھر یہ سنت جاریہ بن گئی آپ کے بعد بھی جب مسلمانوں کا قبضہ ہوا، اور انہوں نے مفتوحہ زمین وہاں کے مالکوں کے سپرد کی، تو برابر خراج عائد کرتے رہے۔

خراجی زمین کی قسمیں

خراج کی تعین و تشخیص میں بھی سیاست عادلہ کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، فقہاء کا خیال ہے کہ زمین کی تین مختلف صورتیں ہوتی ہیں، اور ان میں

سے ہر ایک پر خراج کی کمی یا زیادتی اثر انداز ہوتی ہے۔

(۱) زمین زرخیز ہے یا بنجر؟ اس سے رائے قائم کی جائے گی، کہ
کھیتی اچھی ہوگی یا بُری۔

(۲) پھر دیکھا جائے گا کہ کھیتی کیسی ہے، اس سے اندازہ لگایا
جائے گا، کہ اس کے دام کم آئیں گے یا زیادہ؟

(۳) پھر دیکھا جائے گا، کہ سینچائی آلات کے ذریعہ ہوتی ہے، یا
بارش سے۔

خراج مقرر کرتے وقت ان وجوہ سہ گانہ پر نظر رکھنی بے حد ضروری ہے تاکہ جن پر خراج عائد کیا جا رہا ہے، انہیں غیر ضروری تکلیف نہ پہنچے، جس طرح خراج کے تعین کے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ زمین کس قسم کی ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ غائت متحمل سے کم نہ اختیار کیا جائے۔ اور زمین کے مالکوں کے لئے نوائب و حوادث کا حصہ بھی چھوڑ دیا جائے۔ علمائے اصول فقہ کا قول ہے کہ عشر میں جو تکلیف ہے، وہ عبادت کا ثواب مسلمان کو پہنچاتی ہے۔ اور خراج میں جو تکلیف ہے، اس کا مطلب عقوبت ہے۔

یہ بات ظاہر ہو گئی کہ خراج شروع شروع میں اس زرعی زمین پر لگایا گیا تھا، جو غیر مسلموں کے قبضہ میں تھی۔ اور اس کی بنیاد حضرت عمر اور کبار صحابہ کا اجتہاد ہے۔ پھر یہ لفظ اس آمدنی کے لئے بھی استعمال ہونے لگا جو بر سبیل تغلیب ایک قوت والی حکومت دوسری کمزور حکومت سے وصول کرتی ہے۔

اس سلسلہ میں امام ابو یوسف کی کتاب الخراج جو انہوں نے خلیفہ

ہارون الرشید کے لئے لکھی تھی، بڑی معرکہ کی چیز ہے، اور اس میں اس مسئلہ اور اس کے متعلقات پر بڑی سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں،
امام یحییٰ بن آدم المتوفی ۲۰۳ ہجری کی کتاب الخراج بھی بہت عمدہ ہے مگر، امام ابویوسف کی کتاب کی ٹکر نہیں لے سکتی،

(۳) جزیہ | یہ وہ ٹیکس ہے جو ان مالدار اہل کتاب پر عائد ہوتا ہے، جو مسلمانوں کے ذمہ آ جاتے ہیں جس طرح مسلمانوں سے زکوٰۃ لی جاتی ہے، اسی طرح غیر مسلموں سے جزیہ لیا جاتا ہے، اسلئے کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص جو مصالح عامہ کے امور میں حصہ لینے کی قدرت رکھتا ہے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمتع حقوق کے مقابلہ میں کچھ ادا کرے۔
—— یہ شخص اگر مسلمان ہے تو اسے اپنے مال میں سے ایک مقررہ رقم دینا پڑے گی، جسے زکوٰۃ کہتے ہیں، اور اگر غیر مسلم ہے تو اسے ایک معین رقم اپنے مسلمانوں کے "ذمہ" میں آنے کے بدلے میں دینا پڑے گی، ذمی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، نہ اموال پر نہ سوائم پر لیکن اگر مسلمان ہو جائے تو اس پر سے جزیہ ساقط ہو جائے گا۔ اور زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔

جزیہ کی اصل کیا ہے | جزیہ کی اصل یہ ارشاد خداوندی ہے —— قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون —— "یعنی ان لوگوں سے مقاتلہ کرو، جنہوں نے اللہ کا دین قبول نہیں کیا، نہ وہ یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہ اللہ اور

رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں، نہ دین حق کی پیروی کرتے ہیں، یہاں تک کہ فروتنی کے ساتھ جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں ـــــ"

جزیہ کے جملہ احکام و شرائط میں عدل و رحمت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ جزیہ کس پر واجب ہے، اس شخص پر جو آزاد ہو، عاقل ہو، اس کے ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے ـــــ حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن ید" یعنی جزیہ ادا کرنے کی قدرت و استطاعت رکھتا ہو۔ جزیہ سال بھر میں ایک ہی دفعہ دینا پڑتا ہے۔

جزیہ کی تعیین اور فقہا اسلام کی تصریح

جزیہ کی تعیین میں فقہا کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جزیہ تین شخصوں پر واجب ہے۔

(۱) اغنیا ـــــ ان سے ۴۸ درہم سالانہ لئے جائیں گے۔

(۲) متوسط طبقہ ـــــ اس سے ۲۴ درہم سالانہ لئے جائیں گے۔

(۳) باقی لوگ ـــــ ان سے ۱۲ درہم سالانہ لئے جائیں گے۔

اس طرح امام صاحب نے جزیہ کی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم رقم متعین فرما دی۔

امام شافعی کے نزدیک جزیہ کی کم سے کم مقدار ایک دینار ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اسے والی کی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہیئے، کہ وہ جو شرح مناسب سمجھے مقرر کر دے، البتہ کسی شخص پر ایسی رقم نہ عائد کرے، جس کا ادا کرنا اس کی طاقت سے باہر ہو۔ متعدد احادیث میں جزیہ کی تقدیر پر زیادتی اور تحصیل پر سنگدلی

کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔

بعض مفسرین "وہم صاغرون" کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ وہ لوگ اپنے اوپر احکام اسلامی کے اجرا، پر راضی ہوں،

جزیہ کے بارے میں فرمانِ رسالتؐ

نافع ابن عمرؓ کی روائت ہے کہ رسول اللہؐ نے جو آخری بات ارشاد فرمائی وہ یہ تھی "الفظونی فی ذمتی" ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے۔ "ومن ظلم معاهدا اوکلفه فوق طاقته فانا حجيجه ـــــــ" ابن عباسؓ سے روائت ہے کہ "ليس فی اموال اهل الذمة الا العفو ـــــــ"

(۴) عشور

قاضی ابو یوسفؒ اپنی کتاب الخراج میں تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"عاصم بن سلیمان، حسنؓ سے روائت کرتے ہیں کہ ابو موسیٰ اشعری نے عمر بن خطابؓ کو نوشتہ بھیجا کہ ہم سے پہلے سے جو مسلمان تاجر اہل حرب میں جاتے ہیں، ان سے عشر لیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے لکھا جس طرح وہ مسلمان تاجروں سے عشر وصول کرتے ہیں تم ان کے تاجروں سے وصول کرو، ذمیوں سے نصف عشر لو، اور مسلمانوں سے ہر چالیس درہم پر ایک درہم، دو سو سے کم پر کچھ نہ لو، اور اگر ۲۰۰ ہوں تو پانچ درہم، زیادہ ہوں تو اسی حساب سے۔"

حضرت عمرؓ کے وقت سے اسلامی حکومتوں میں یہی دستور نافذ ہو گیا، اور درآمد و برآمد پر ٹیکس لگ گیا۔ تاجر اگر مسلمان ہے تو اس سے عشر کا چوتھائی لیا جائے گا۔ جو گویا زکوٰۃ کے معیار کے مطابق ہے اور اگر تاجر ذمی ہے، تو

اس سے نصف عشر لیا جائے گا۔ اور اگر حربی ہے، تو اس سے وہی سلوک کیا جائے گا۔ جو اس کی قوم مسلمان تاجروں کے ساتھ کرتی ہے۔ اور اگر مسلمان سے عشر لیتے ہیں، تو یہاں بھی عشر لیا جائے گا؛ اگر وہ نصف عشر لیتے ہیں تو مسلمان بھی نصف عشر لیں گے۔ اگر وہ عشر کا چوتھائی لیتے ہیں تو اسلامی حکومت بھی یہی لے گی۔ اور اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ لوگ مسلمانوں سے کیا ٹیکس لیتے ہیں، تو اسلامی حکومت عشر لے گی۔

خمس غنائم کی اصلیت

غیر دوری ذرائع آمدنی میں خمس غنائم بھی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مال غنیمت جو مسلمان اپنے دشمنوں سے قتال کے بعد حاصل کریں، اس کا پانچواں حصہ مسلمانوں کے بیت المال کے لئے لے لیا جائے گا، اور اس کے مصارف وہی ہوں گے۔ جو خدائے تعالیٰ نے سورۂ انفال میں متعین فرما دیئے ہیں۔

واعلموا انما غنمتم
من شئ فان للہ خمسہ وللرسول
ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمساکین
وابن السبیل ان کنتم امنتم باللہ
وما انزلنا علی عبدنا یوم
الفرقان یوم التقی الجمعٰن
واللہ علی کل شئ قدیر

دوسرا خمس، معادن اور کاز کا ہے۔

وہ چیز جو زمین کے اندر مدفون ہو، خواہ وہ اسی کا باطنی جزو ہو، جسے ...نے اسی دن پیدا کیا ہو، جیسے معدن، یا وہ کسی انسان کا مدفون کیا ہوا ہو جسے کنز کہتے ہیں،

...ن میں سے جب کوئی چیز پائی جائے گی، اور وہ کسی کی ملکیت نہ ...ہو گی، تو اس کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور اس کے مصارف وہی ہوں گے، جو خمس غنائم کے مصارف ہیں، اور ۴/۵ خمس پانے ...والے کو دیدیئے جائیں گے۔

قاضی ابو یوسف کی رائے،

قاضی ابو یوسف اپنی کتاب "الخراج" میں فرماتے ہیں:۔

معادن میں سے جو چیز بھی برآمد ہو، خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر اس ...کا پانچواں حصہ لے لیا جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی معدن میں ۲۰۰ ...درہم کے وزن سے کم کی کوئی چاندی پائے، یا ۲۰ مثقال سے کم وزن ...سونا پائے تو بھی خمس واجب ہے، یہ محل زکوٰۃ کا نہیں بلکہ غنائم کا ...ہے۔

...خاک اور مٹی پر خمس نہیں ہے، خالص سونے اور خالص چاندی، ...تانبے، سیسے وغیرہ پر خمس ہے، لیکن کب؟ جب انہیں تپا لیا گیا ہو، ...صاف کر لیا گیا ہو، اور یہ ذاتی استعمال کے لئے نہ ہوں،

...ان چیزوں کے علاوہ پتھروں وغیرہ کی صورت میں جو چیزیں معادن ...میں، مثلاً یاقوت، فیروزہ، سرمہ (کحل) ابرک اور گندھک وغیرہ تو ...ان پر خمس نہیں ہے، کیونکہ اس کا شمار خاک اور مٹی میں ہے۔

...آگے چل کر امام ابو یوسف فرماتے ہیں ——— رکاز، اس سونے چاندی

کر کتے ہیں، جسے خدا نے زمین کی پیدائش کے وقت ہی پیدا کر دیا تھا، ان
میں خمس واجب ہے۔

اگر کوئی شخص ایسا کنز پائے، جس کا کوئی مالک نہ ہو، اور اس میں سونا
چاندی، جوہر یا کپڑے ہوں، تو اس میں خمس واجب ہے، باقی چار خمس
پانے والے کا حصہ ہیں، یہ کنز بمنزلہ مال غنیمت کے ہے۔ جس کا پانچواں
حصہ بیت المال کا، اور باقی پانے والوں کا۔

اس ترکہ پر بھی خمس ہے، جس کا کوئی وارث اصحاب فروض، عصبہ
ذوی الارحام میں سے نہ ہو، یا جس کا کوئی وارث زن وشوہر میں سے کسی ایک
کے سوا کوئی نہ ہو۔

پہلی صورت میں سارا ترکہ بیت المال کا حصہ ہے اور یہ مصارف
عامہ میں صرف ہوگا۔ اور دوسری صورت میں میاں بیوی سے جو باقی ہو
اس کا حصہ نکال لینے کے بعد، سارا مال مسلمانوں کے بیت المال میں چلا
جائے گا۔

اسی طرح گرا پڑا مال، اور وہ مال بھی جس کا کوئی مالک نہ ہو
بیت المال میں چلا جائے گا۔

دولتِ اسلامیہ اور اِسکے مصارف

نوعیت، تعین، تشریح

قواعد مقررہ کی رو سے یہ ثابت ہے کہ حکومت کے تمام مالی ذرائع امت کا حق ہیں، جو آمدنی بھی حکومت کی ہوگی وہ مصالح عامہ پر صرف ہوگی۔

اسی بنیاد پر حکومت اسلامیہ کے مصارف بھی مرتب کئے گئے ہیں، یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، کہ اسلام کے ذرائع آمدنی زکوٰۃ ...... مع اپنی تمام قسموں کے —— خراج، جزیہ، عشور، خمس غنائم، خمس معاون، ترکۂ لاوارث، گرا پڑا مال، اور ہر وہ مال، جس کا کوئی مستحق نہ ثابت ہو سکے، —— پر مشتمل ہے۔

حکومت کے مصارف اور ان کی نوعیت

قرآن کریم میں زکوٰۃ اور خمس غنائم، کے مصارف وضاحت کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں، دوسری مدات کے مصارف کے بارے میں سکوت سے کام لیا ہے تاکہ ولاۃ امور کو ان کے دائرۂ کار میں کافی وسعت دی جائے اور وہ مصالح عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے، خود بھی حسب حال ان کے مصارف متعین کریں، نیز خدائے بزرگ و برتر نے جو مصارف زکوٰۃ اور خمس غنائم کے متعین فرمائے ہیں، وہ بھی امت کے مصالح عمومی پر مبنی ہیں بلکہ وہ عمومی مصالح ہیں،

جن کی تخصیص کر کے از روئے نص ان کی حکمت بھی بیان کر دی گئی ہے تاکہ لوگ ان کی رعائت کریں، اور افراط و تفریط میں مبتلا نہ ہو جائیں،

زکوٰۃ اور اس کے تمام انواع کے مصارف خدائے تعالیٰ نے سورہ توبہ کی، ان آیات میں بیان فرمائے ہیں۔ انما الصدقات للفقراء و المسٰکین و العاملین علیہا و المولفۃ قلوبہم و فی الرقاب والغارمین و فی سبیل اللہ و ابن السبیل فریضۃ من اللہ و اللہ علیم حکیم ـــــــ "یعنی صدقات فقراء مساکین عاملین زکوٰۃ مؤلفۃ القلوب غلاموں کے آزاد کرانے، اور قرضداروں کا قرض ادا کرنے کے لئے ہیں، یہ فرض ہیں اللہ کی طرف سے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ـــ

حدیث نبوی کے تصریحات

رسول اللہؐ سے روائت ہے کہ ایک شخص نے آپ سے صدقہ میں سے کچھ طلب کیا، آپؐ نے جواب دیا، اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے آٹھ اجزا مقرر کئے ہیں، اگر تم ان اجزا میں سے کسی ایک جزو کے حامل ہو تو میں تمہیں دے دونگا۔

ـــــ(۱)ـــــ

ان صدقات کا ایک حصہ فقراء اور ایک مساکین کیلئے ہے ـــ خواہ فقیر مسکین سے بدتر حالت میں ہو یا مسکین فقیر سے بدتر حالت میں ہو ـــ اس حصہ سے ان لوگوں کی حاجات پوری کی جائے گی تاکہ یہ رفق کے دامن میں پناہ لے سکیں، اور امت ان کے ابتلا سے محفوظ رہ سکے۔

—۲—

صدقات کا ایک حصّہ عاملین کے لئے ہے۔ جو تحصیل وصول اور بندوبست کا کام کرتے ہیں۔ یہ حصّہ ان کی کارگزاری کا صلہ ہے۔ یہ حصّہ بقدرِ ضرورت ہوتا ہے یعنی اس کے دینے میں نہ غیر معمولی سخاوت برتی جاتی ہے، نہ کفائت شعاری، تاکہ یہ لوگ مستعدی سے اپنے فرائض انجام دیں، اور طمع سے محفوظ رہیں،

—۳—

صدقات کا ایک حصّہ مؤلفۃ القلوب کے لئے ہے، تاکہ نومسلموں کی دلجوئی ہو، اور کید اغیار سے حفاظت ہو، یہ حصّہ اسلام کی ترغیب کیلئے اور اس کے مخالفانہ پروپگنڈے کو روکنے کے لئے صرف کیا جاتا ہے۔

—۴، ۵—

ایک حصّہ صدقات کا غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے ہے، اسی سے اسیروں کا فدیہ ادا کیا جاتا ہے، نیز مکاتبین کا بدل کتابت دیا جاتا ہے۔ اور غلام خریدے جاتے ہیں۔ تاکہ خرید کر آزاد کئے جائیں، مقصد یہ ہے کہ غلامی کا جوا اتارنے میں غلاموں کی مدد کی جائے، اور نعمت حریت سے انہیں بہرہ یاب کیا جائے۔

—۶—

صدقات کا ایک حصّہ ان لوگوں کے لئے ہے، جو قرض کے چکر میں گرفتار ہیں، بشرطیکہ یہ قرض معاملات مشروعہ کے اندر ہوا ہو اور وہ اس کی ادائی سے قاصر ہوں، اس حصّہ سے ان کا قرضہ اتارا جائے گا، تاکہ متدائنین کے درمیان اعتماد شکنی نہ ہو، اور افراد امت میں تعاون کا سلسلہ جاری رہے،

— ۷ —

ایک حصہ ان صدقات کا خدا کی راہ میں صرف کیا جائے گا۔ جس سے مجاہدین کی بقدر ضرورت مدد کی جائے گی۔ اور مستحق محتاج کی مدد کی جائے گی۔ اور اتمام فریضہ میں جو مالی دشواری حاصل ہوگی اسے دُور کیا جائے گا۔

— ۸ —

صدقات کا ایک حصہ ان مسافروں کے لئے ہے، جو اپنے راستہ سے کٹ گئے ہوں۔ ان سے ان کی مدد کی جائے گی۔ اور انہیں منزل مقصود تک پہنچایا جائے گا۔

اموال زکوٰۃ کے مصارف

اموال زکوٰۃ کے جو مصارف ہیں خدا تعالیٰ نے مقرر فرما دیئے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مصالح عامہ پر مبنی ہیں، اس لئے کہ ان کا مرجع حسب ذیل امور ثلثہ ہیں:-

(۱) حاجت مندوں کی ضرورت کی فراہمی، غلاموں کو آزاد کرانا، قرضداروں کا قرض ادا کرنا، مسافروں کی مدد کرنا،

(۲) دین کی تائید و نصرت، مجاہدوں کی مدد، نومسلموں کی تالیف قلوب۔

(۳) عاملوں کو روپیہ دینا تاکہ وہ اس روپیہ میں خرد برد نہ کریں جو ان کے ہاتھ میں رہتا ہے۔

یہ امور سہ گانہ تمامتر مصالح عامہ کی رعایت پر مبنی ہیں، کیونکہ حاجت مندوں کی حالت نہ ہمدردی کی جائے۔ اور انہیں ان کے حال

چھوڑ دیا جائے۔ تو اس سے اُمّت کو زیاں پہنچے گا اور امن و امان کے برباد ہونے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بعض حکومتیں اپنے بجٹ میں ایک "مد" ان مزدوروں کی ضروریات کے لئے رکھتی ہیں، جو بیکار ہیں، تاکہ وہ ملک و قوم کے لئے خطرہ نہ بن سکیں، اسی طرح تائید دین اور اعزاز مجاہدین پر صرف کرنا بھی مصالح عامہ ہی سے تعلق رکھتا ہے، عاملین زکوٰۃ کا جو حصّہ رکھا گیا ہے۔ اس میں بھی مصالح اعمال و عمال ملحوظ ہیں؛

اموال زکوٰۃ ہی میں ارض عشریہ کے عشور اور وہ محاصل شامل ہیں جو مسلمانوں کے مال تجارت کی درآمد و برآمد پر لئے جاتے ہیں، ان کا مصرف بھی وہی مصارف ہیں، جن پر مال زکوٰۃ فرض کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ سارے اموال مسلمانوں ہی سے وصول کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کا مصرف صدقہ ہی ہو سکتا ہے۔

کتاب الخراج کا اقتباس

قاضی ابو یوسف اپنی کتاب الخراج میں بیان فرماتے ہیں کہ:-

"صدقات اور عشور اموال کا مصرف وہی ہے جو خدا نے اپنے نبی پر نازل کیا ہے، یعنی —— انما الصدقات للفقراء و المساکین، والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم و فی الرقاب والغارمین، و فی سبیل اللہ و ابن السبیل ——

ہے خمس غنائم، سو ان کا مصرف بھی خدائے تعالیٰ نے سورۂ انفال میں متعین کر دیا ہے۔ فرمایا ہے —— واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتامیٰ والمساکین

و ابن السبیل ان کنتم امنتم باللہ وما انزلنا علی عبدنا یوم
الفرقان ویوم التقی الجمعان واللہ علی کل شئی قدیر ــــــ
یعنی تم جان لو کہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہے اور
اللہ کے لئے ذوی القربیٰ، اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لئے
اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اس پر ایمان رکھتے ہو، جو کچھ کہ اتارا ہم نے
اپنے بندہ پر فیصلہ کے دن جس دن کہ ملی تھیں دو جماعتیں اور اللہ ہر
پر قادر ہے۔

خمس غنائم میں اللہ تعالےٰ کا جو حصہ ہے وہ تو انہی مدات پر صرف
ہوگا۔ جو اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں، رسول اللہ کا حصہ، آنحضرت کی
کے بعد ساقط ہو گیا، اب جو کچھ ہے وہ یتامیٰ، مساکین اور مسافروں
خرچ ہوگا، خمس غنائم کے مصارف میں صدقات کے بعض مصارف
بھی شامل کئے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ مصالح ملّی کا تقاضا ہو۔

قاضی ابو یوسف کا قول

قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں
"مالِ غنیمت کے خمس کے بارے
میں، محمد بن سائب الکلبی ابو صالح سے، اور وہ عبداللہ بن عباس رضی سے روایت
کرتے ہیں کہ رسول اللہ کے زمانہ میں خمس کے پانچ حصے ہوتے تھے

(۱) اللہ اور رسول کا ایک حصہ،
(۲) ذوی القربیٰ کا ایک حصہ،
(۳) یتیموں کا ایک حصہ،
(۴) مساکین کا ایک حصہ،
(۵) غریبوں کا ایک حصہ،

وفات رسولؐ کے بعد، حضرت ابو بکرؓ، اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے اسے تین ہی حصّوں تک محدود کر دیا، کیونکہ رسول اور ذوی القربیٰ کا حصہ ساقط ہو گیا، باقی تین رہ گئے، انہی پر تقسیم کر دیا گیا۔ پھر حضرت علیؓ ابن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے دورِ خلافت میں وہی تقسیم برقرار رکھی جو حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے وقت سے چلی آ رہی تھی۔

خمس غنائم میں معادن اور رکاز کا خمس بھی شامل ہے، اور ان دونوں کا مصرف بھی وہی ہے۔ جو خدائے بزرگ و برتر نے سورۂ انفال میں بیان فرمایا ہے،

قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں:۔

معادن سے جو کچھ بھی حاصل ہو، خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر، اس پر خمس واجب ہے۔ یہ زکوٰۃ کے ذیل میں نہیں آتا، یہ غنائم کے ذیل میں آتا ہے، اسی طرح رکاز، یعنی وہ سونا چاندی جسے خدا نے زمین میں پیدا کیا ہے، اس پر خمس واجب ہے۔ کوئی شخص ایسا خزانہ پائے جس کا کوئی مالک نہ ہو، اور جو سونے، چاندی، جوہر یا کپڑوں پر مشتمل ہو، اس پر بھی خمس ہے، اور چار اخماس اس کے ہیں، جس نے اسے پایا ہو، اس کی حیثیت مال غنیمت کی ہے۔ لہٰذا اس پر بھی خمس عائد ہو گا۔

فئے کی اصلیت وحقیقت

آمدنی کی وہ تمام مدات، جو خراج جزیہ اور غیر مسلموں کے مال تجارت کی درآمد و برآمد پر ٹیکس کی صورت میں وصول ہوئی۔

یہ فئے کہلاتی ہیں، اس کے مصارف ہیں حکومت کے ضروریات عام
داخل ہیں، اسی فئے میں اس کا ترکہ جس کا کوئی وارث نہ ہو گرا پڑا
مال، اور ہر وہ مال جس کا مستحق لا معلوم ہو، داخل ہے اور اس کے
مصارف بھی مصالح عامہ پر مبنی ہیں:

حضرت عمرؓ کا مسلک

حضرت عمرؓ نے جب خراج
کا اصول ارض سواد پر منع
کیا، تو اس کا مصرف اس طرح معین کیا۔

"میری رائے یہ ہے کہ زمین مفتوحہ فوج کو نہ دی جائے،
بلکہ وہیں کے رہنے والوں کو سونپ دی جائے۔ اور
جزیہ بھی عاید کر دیا جائے۔ اس آمدنی کی حیثیت
فئے کی ہو گی۔ ان مسلمانوں کے لئے جنہوں نے مقاتلہ کیا
اور ان نسلوں کے لئے جو بعد میں آئیں گی۔ کیا تم نہیں دیکھتے
ان سرحدوں کی حفاظت کے لئے سپاہیوں کا چوکی پہرا
ضروری ہے۔؟ کیا تم ان متمدن اور بڑے شہروں کو
نہیں دیکھتے ——— مثلاً شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ او
مصر، ——————— ضروری ہے کہ نظم وامن
برقرار رکھنے کے لئے یہاں فوج تیار رکھی جائے۔ —

آگے چل کر آپ نے فرمایا:۔
میں اپنے اس خیال کی تائید، کلام پاک سے بھی دیکھ رہا
پھر آپ نے سورۂ حشر کی وہ آیات تلاوت فرمائی، جو فئے سے
تعلق رکھتی ہوں:"

آپ نے خراج اور جزیہ میں وہ تمام آمدنیاں شامل کر دیں، جن کے مصارف متعین نہیں کئے ہیں، ان کا مصرف حکومت کے عام مصالح ہیں۔

قاضی ابو یوسف کی رائے

قاضی ابو یوسف "جزیہ" کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:۔

"ولاۃ خراج اسے بھی خراج کے ساتھ وصول کرینگے اور بیت المال میں داخل کرینگے۔ اس لئے کہ یہ مسلمانوں کے لئے فئے ہے، اور ہر وہ رقم، جو ذمیوں سے وصول کیجائے اس کی حیثیت رقم خراج کی سی ہوگی، خواہ یہ رقم مال تجارت سے وصول کی گئی ہو، یا ان لوگوں سے جو ہماری امان میں ہیں، یا ان ذمیوں سے جن کے ہاتھ میں ارض عشر آگئی ہو، بہرحال یہ رقومات خراج میں شمار ہوں گی، ان کا شمار صدقات اور خمس میں نہیں ہوگا۔ خمس اور صدقہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو تقسیم و تعیین کر دی ہے وہ آخری چیز ہے۔ اب نہ اس کے خلاف کیا جا سکتا ہے نہ اس کے حدود سے تجاوز کیا جا سکتا ہے۔"

دولت اسلامیہ کی آمدنی اور مصارف

ہماری پیش کردہ تفصیل کے مطابق دولت اسلامیہ کی جملہ آمدنی اور اس کے مدات مصارف کی تین قسمیں ہیں، ایک قسم تو وہ ہے جس میں آمدنی کا خرچ صدقات ثمانیہ کے مصارف تک محدود رہیگا، جن کا ذکر سورۂ توبہ میں موجود ہے:۔

(۲) دوسری قسم وہ ہے جس میں حکومت کے مصالح عامہ پر صرف ہوتا ہے

(۳) عوام کے مصالح پر صرف ہوتا ہے۔

(۴) اس تقسیم و تخصیص کی بناء پر آمدنی اور خرچ کے مدات معین ہیں اور

ایک دوسرے میں خلط ملط نہیں کئے جا سکتے۔

" قاضی ابو یوسف اپنی کتاب الخراج میں فرماتے ہیں۔

" یا امیر المومنین، ایک امین، ثقہ، عفیف ناصح آدمی کو جو آپ کا معتمد اور آپ کی رعیت کا ہمدرد ہو، حکم دیجئے کہ وہ جمع صدقات یاران کا والی بنے۔ اور جب وہ جمع ہو جائیں تو انہیں حکم خداوندی کے ماتحت خرچ کرے اور وہ یہ کام عمال خراج کو نہ سونپنے کیونکہ صدقہ کے مال کو مال خراج میں نہیں شامل ہونا چاہیئے، مجھے اطلاع ملی ہے کہ عمال خراج اپنے آدمیوں کو صدقات کی وصولی کیلئے بھیجتے ہیں، وہ ظلم کرتے ہیں، جور و جبر سے کام لیتے ہیں، جس کا لینا روا اور جائز نہیں ہے۔ وہ مہلت نہیں دیتے، لہذا ضروری ہے کہ تحصیل صدقہ کے لئے پاکباز اور پاک نہاد آدمی مقرر ہو، جب ایسا آدمی مقرر ہو، جو دین و امانت کے اصول پر پورا اترتا ہو، تو اس کی ضرورت کے مطابق اسے اجرت کار ملنی چاہیئے۔ لیکن نہ اتنی کہ سارا صدقہ ہی خرد برد ہو جائے۔ نیز ضروری ہے کہ خراج کا مال صدقات اور عشور کے ساتھ جمع کیا جائے۔ اس لئے خراج مسلمانوں کے لئے فئے ہے، اور صدقات ان کے لئے جن کی تخصیص

خدا نے اپنی کتاب مبین میں کر دی ہے،

بیت المال کی آمدنی کی قسمیں

اس بنیاد پر صاحب "بدائع" کا قول ہے۔

بیت المال میں، جو مال داخل کیا جائے گا۔ اس کی چار قسمیں ہیں،

(۱) سوائم کی زکوٰۃ اور عشور اور مال تجارت کی درآمد برآمد کا عشار،

(۲) غنائم، معادن اور رکاز کا خمس،

(۳) زمین کا خراج، جزیہ اور وہ رقم جس پر بنو نجران نے صلح کی تھی، اور وہ صدقہ مضاعفہ جسے بنو تغلب نے مان لیا تھا۔ اور وہ عشار جو ذمی تاجروں سے اور مستامنین اہل حرب سے وصول ہو،

(۴) اس میت کا ترکہ جس کا کوئی وارث نہ ہو، جس کے وارثوں میں صرف بیوی یا شوہر ہو،

پہلی مد کے مصارف کا ہم ذکر کر چکے ہیں، یہ وہی مصارف ہیں، جن کا خدا نے خود ذکر کیا ہے ـــــــ "انما الصدقات للفقراء والمساکین ـــــــــــ"

دوسری مد ـــــــــ یعنی خمس غنائم و معادن ـــــــــ کے مصارف بھی خدا نے متعین کر دیئے ہیں ـــــــــ "اعلموا انما غنمتم فی شیئ، الآیۃ ـــــــــ"

تیسری مد ـــــــ یعنی خراج اور اس کے اخوت ـــــــــ کے مصارف میں تعمیر دین، اصلاح مصالح مسلمین، ولاۃ اور قضاۃ کی حاجت روائی، اہل فنون و علماء کی امداد، مجاہدوں کی اعانت، ساجد کی تعمیر، پلوں کی تعمیر، سرحدوں کی رکھوالی، نہروں کی درستی

وغیرہ شامل ہیں،

چوتھی مدفقیروں کی سرپرستی، بیماروں کی تیمارداری، علاج
غریب اور نادار یتیموں کا دفن کفن، لاوارث بچوں کا کھانا پینا
اور معذوروں کی مالی امداد وغیرہ، یہ ہیں مصارف،

اب یہ امام کی صوابدید پر ہے کہ وہ جس طرح چاہے ان رقم
کو، مناسب طریقہ سے، صرف کرے، غرض آمدنی کے یہ مصارف ہیں
جو علماء نے احکام قرآنی اور سنت نبوی کو پیش نظر رکھ کر مقرر
کئے ہیں،

اللہ کا حق؛ یہ کہ اللہ تعالٰے نے جب صدقات کے مصا
بیان فرمائے، تو سورۂ توبہ میں "وفی سبیل
کا ذکر بھی ہے، اور سورۂ انفال میں جب خمس غنائم کے مصارف کا ذکر
فرمایا تو "فان للہ" سے شروع کیا، اور جب فئے کے مصارف بیان فر
سورۂ حشر میں، تو کہا ——— "ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل القری —

غرض تین مواقع پر قرآن میں بہ سلسلۂ مصارف تین باتیں فی سبیل
"فان اللہ" فللہ" فرمائی گئیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات
خمس غنائم اور فئے اس لحاظ سے مشترک ہیں کہ ان میں سے فی سبیل
اور "فللہ" (اللہ کی راہ میں، اور اللہ کے لئے) مصارف متعین کئے گئے
خدا کے لئے، اور خدا کی راہ میں جو صرف ہوگا، وہ مصالح عمومی کے
خرچ ہوگا۔ اس صرف میں چونکہ کسی خاص فرد کی طرف تخصیص نہیں
لہٰذا اسے اللہ سے نسبت دی گئی۔

ہر وہ چیز، جو منافع عامہ اور حاجات امت پر صرف ہو، وہ

ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے۔ کہ علماء اصول نے جب حدود شرعیہ کی تقسیم کی، کہ خدا کا حق کیا ہے۔؟ اور خدا اور بندہ کا کیا حق ہے۔ تو کہا کہ حق اللہ سے مراد وہ حق ہے۔ جو مصلحت عامہ اور نفع اجتماعی پر مبنی ہو، مثلاً حد زنا، حد سرقہ، یہ وہ جرائم ہیں، جن میں نہ عفو سے کام لیا جا سکتا ہے۔ نہ شفاعت کام دے سکتی ہے۔ اس لئے کہ یہ حدود خدا وندی ہیں اور ان حدود کا قائم کرنا، امام یا اس کے نائب کا فرض ہے۔ تو گویا حق اللہ اور حق اجتماعی مترادف ہیں، اسی طرح "راہ خدا وندی" (فی سبیل اللہ) سے مراد، اجتماعی راہ، اور مصلحت عامہ کا راستہ ہے؛

حقیقت بالغہ؛ اس کتاب میں جو تصریحات کتاب و سنت کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہیں، وہ اس حقیقت بالغہ کی مظہر ہیں کہ اسلام نے جو نظام حکومت مرتب کیا ہے، وہ مفاد عامہ اور مصالح عمومی کا کس درجہ نگہبان ہے۔ اس ترقی اور ارتقاء کے دور میں بھی کوئی حکومت، عام اس سے کہ وہ اشتراکی ہو، یا جمہوری، یا عوامیت، ری پبلکن کی علمبردار، یا سویت طرز کی، قدم قدم پر اس درجہ پاسبان عوام نہیں ثابت ہوتی، اور یہی بات اس امر کا ثبوت ہے کہ اسلام ایک خدائی اور الٰہی مذہب ہے!، اس کے اصول اور احکام انسانی ذہن و دماغ کا تجویز کردہ نہیں ہیں بلکہ خالق ارض و سما کی تدبیر کا نتیجہ ہیں، لہٰذا انسانی فلاح و بہبود کا ضامن صرف یہی نظام ہے کوئی اور نہیں۔!"

حکومتِ اسلامیہ کا مالیہ

آمدنی اور مصارف کی نوعیّت

محاصل کا وصول کرنا، اوران کے مصارف کی تعیین کرنا، دولت اسلامیہ کے ادارہ مرکز کا کام ہے، کیونکہ یہ محاصل مصالح عامہ کو پیش نظر رکھ کر فرض کئے گئے ہیں، اسی طرح ان کے مصارف میں بھی مصالح عامہ ہی کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اب ان کی نوعیت اور کیفیت پر نظر رکھنا اسی کا کام ہے جو شئون عامہ کا نگران اور والی ہو،

اسی لئے خدائے تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ صدقات کی وصولی کا اہتمام کیا جائے، چنانچہ فرمایا "— خذ من اموالھم صدقۃ —" صدقات کے مصارف میں عاملین کا حصہ بھی رکھا۔

صدقہ وزکوٰۃ کے محصل

رسول اللہ صدقہ وصول کرنے والوں کو، عرب کے قبیلوں، نیز شہروں اور ملکوں میں روانہ فرماتے تھے کہ وہ صدقات وصول کرکے لائیں، آپ کے بعد خلفاء راشدین کا بھی یہی طرز عمل رہا، حضرت ابوبکر کے زمانہ میں جب بعض قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا، تو حضرت ابوبکر نے اس پر ان سے جنگ کی، اور فرمایا خدا کی قسم اگر رسول اللہ کے زمانہ میں وہ رسی کا ایک ٹکڑا بھی از کوٰۃ دیتے تھے، اور اب اس کے دینے سے انکار کرتے ہیں تو میں ان سے

جنگ کروں گا، اور اسے لے کے رہوں گا۔

زکوٰۃ کی فراہمی اور وصولی

یہ بھی بات ثابت ہے کہ رسول اللہ نے مال نقد اور عروض تجارت پر بھی زکوٰۃ لی، اسی طرح حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے بھی کیا حضرت عثمان کے زمانہ میں مال کی زیادتی ہوگئی، اور نقود کے جانچنے اور مال تجارت کے پرکھنے کی دشواریاں پیش آنے لگیں، اور ان کے اظہار و اعلان سے ارباب اموال کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہونے لگا تو طے کیا گیا کہ صاحبان مال خود ہی اپنے نقود اور مال تجارت کی زکوٰۃ نکال لیا کریں، اور اس کے جو مصارف ہیں، ان پر خرچ کر دیا کریں،

اس اصول پر گویا دو صورتیں ہیں:۔

(۱) ایک صورت تو یہ ہے، کہ ارباب مال کو اجازت ہے کہ وہ اس مال کی زکوٰۃ جو ظاہر نہیں ہے، خود نکال لیں، اور زکوٰۃ کے جو مصارف ہیں ان میں صرف کر دیں، تاکہ ایک طرف تو کارکنان حکومت کو دشواریوں کا سامنا نہ ہو اور دوسری طرف ارباب مال کے راز آشکارا نہ ہوں،

یہ زکوٰۃ خود اختیاری صرف نقود و مال تجارت تک محدود ہے لیکن اگر کوئی شخص چاہے کہ اپنی نکالی ہوئی زکوٰۃ عاملین زکوٰۃ کے حوالہ کر دے، اور انہیں اس کے صرف کی اجازت دے دے تو ایسا کر سکتا ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ کی تعیین و تحصیل اور اس کا صرف، صرف ولاۃ امر پر منحصر ہے، اور ارباب مال کا فرض ہے کہ زکوٰۃ ان کو دیں، اس صورت مسئلہ میں مرجح قول یہی ہے کہ انفرادی طور پر کوئی شخص نہ زکوٰۃ نکال سکتا ہے، نہ اسے بطور خود صرف کر سکتا ہے، اور اگر ایسا کرے

کا تو اس کا یہ فعل مستند نہیں ہوگا۔

مثلاً، سوائم کی زکوٰۃ، خراج، جزیہ، عشور اور تمام ایسے دوسرے واجبات صرف ولاۃ امر وصول کریں گے، اور وہی خرچ کریں گے۔ بر عکس اس کے نقود اور عروض تجارت میں بطور خود زکوٰۃ نکالی اور صرف کی جاسکتی ہے۔

اموال خفی و جلی

ان اصولوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عدل، انصاف، مصلحت عامہ اور مصلحت مالک پر مبنی ہیں، مال خفی کے سلسلے میں مالک اگر اپنے مال کا اظہار و اعلان نہیں چاہتا، اور اس کی مقدار بتانا چاہتا، تو اسے حق دے دیا گیا۔ کہ وہ خود اپنے مال کی زکوٰۃ نکال لے، اور زکوٰۃ کے جو مصارف معین ہیں، ان پر صرف کر دے، اس طرز عمل سے مصلحت عامہ کو کوئی گزند نہیں پہنچتا، اس لئے کہ ان صدقات کے مصارف حاجت مند ہیں، اور وہ ہر مالدار کے سامنے آتے ہی رہتے ہیں اور صدقہ ان تک پہنچانے میں مالک کو کوئی دشواری نہیں پیش آسکتی، کیونکہ زکوٰۃ کے مصارف مجہول نہیں ہیں، اور نہ ان کو عمل میں لانا متعذر ہے، اس لئے کہ حاجت مند ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ اس زکوٰۃ کی ادائی ایک معنیٰ کر کے عبادت بھی ہے، کیونکہ مالک اپنے ضمیر اور دین کے حسب ہدایت کام کرے گا، وہ اس کی دلیل اور نتیجہ ہوگا۔

نقود اور عروض تجارۃ کے علاوہ دوسرے محاصل تشخیصی طور پر نکالے جاتے ہیں، ان کی وصول یابی صرف حکومت کا حق ہے، اور افراد کو یہ حق نہیں مل سکتا، اس لئے محاصل کی تحصیل وصولی کے لئے مستقل عملہ رکھا گیا۔ مذکورہ محاصل کے ہر ہر عنوان کے ماتحت الگ الگ تحصیل وصول کے لئے عامل مقرر کرتا تھا۔

حکمت و مصلحت

خلاصۂ کلام یہ کہ سیاست شرعیہ مالیہ میں اسلام کے موارد و مالیہ و ذرائع، آمدنی، عدل و رحمت کو پیش نہاد خاطر رکھتے ہوئے، مقرر فرما دیئے، نیز مصلحت عامہ اور ارباب اموال کے مصالح کو بھی پیش نظر رکھا، پھر جس مال سے عقبیٰ زکوٰۃ واجب ہوتی ہو اور جن اشخاص پر واجب ہوتی ہو، اس کے لئے مناسب اور موزوں شرائط بھی مقرر کر دیئے جو عدل اور اقتضا دونوں سے مطابقت رکھتے ہیں نیز مصارف اس طرح مرتب کر دیئے، کہ نہ حکومت کے مصالح کو گزند پہنچے نہ مصالح عامہ میں خلل آئے۔ اور ولاۃ امور کو ضروری وسعت عمل بھی دی تاکہ وہ مصالح عامہ و خاصہ کا اندازہ لگا سکیں، اور ——— حاجت مندوں کی حاجت روائی کر سکیں، کہ وہ نظام اجتماعی کے لئے خطرہ نہ بن سکیں۔

محاصل کی تعیین اور مصارف کی تخصیص میں ارباب اموال اور مصلحت عامہ کو حد اعتدال پر رکھکر ——— افراط و تفریط سے بچایا، علاوہ ازیں ارباب اموال کی معاملت اور ولاۃ امر کی نگرانی کے لئے ایسے شرائط وضع کر دیئے کہ کسی عامل کے لئے بھی یہ ممکن نہ ہو سکے کہ وہ کوئی غیر واجب رقم وصول کر سکے۔ اسی طرح مالک بھی، کسی واجب محصول کو روک نہ سکے۔

یہ تھا وہ قانون مالیات کا نظم جو سراسر عدل و رحمت پر مبنی تھا اور ان مالی قواعد پر مبنی تھا، جو علمائے اقتصاد نے وضع کئے ہیں، اور جو ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے یکساں مفید اور کار آمد ہے۔

دول اسلامیہ کی تاریخ!

اگر بعض دول اسلامیہ کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ان کی سیاست مالیہ ناقص

تھی، محاصل اور ٹیکس غلط بنیادوں پر قائم تھے، مصالح عامہ پورے طور پر ملحوظ نہیں تھے، تو اس کا تعلق اسلام کے بنائے ہوئے قانون سے نہیں ہے، بلکہ یہ صورت حال اغراض و شہوات کی پیداوار ہے۔

دول اسلامیہ کا محقق تاریخ کے آئینہ میں دیکھ سکتا ہے کہ جب کسی اسلامی حکومت نے اسلام کے نظام مالی پر سچائی کے ساتھ عمل کیا، اور نہج دین پر صحیح طرح سے گام فرسا ہوئی، تو اس کا نظام مالی بہت کامیاب رہا، اور اس کے باشندوں کو کبھی بھی مجبور اور مقہور زندگی نہیں بسر کرنی پڑی، اور جب کبھی دین کے راستہ اور اسلام کے نظام مالی کو نظر انداز کر دیا گیا، تو توازن مالی میں اختلال پیدا ہو گیا۔ افراد میں بے چینی پھیل گئی، مصالح عامہ ضائع ہو گئے۔

کسی حکومت کا میزانیہ اس کے عدل وجود اور اس کے نظام و اسلوب کار کا آئینہ ہے۔

اسلامی حکومت کا قیام اس امر کی ضمانت ہے کہ کسی طرح کی زیادتی لوگوں پر نہیں ہو سکتی۔ ان پر کوئی ایسا ٹیکس یا محصول عائد نہیں کیا جا سکتا۔ جو اسلام کی اصل و اساس یعنی عدل و انصاف کیخلاف ہو۔ انسانوں کی بنائی ہوئی دنیادی حکومتیں ہر سال جب بجٹ بناتی ہیں تو وہ اپنے اقتدار و اختیار سے فائدہ اٹھا کر جتنے اور جیسے محصول چاہتی ہیں عائد کر دیتی ہیں۔

"مفاد عامہ" کی اصطلاح ہر نازک موقع پر ان کی پشت پناہی کرتی ہے۔ لیکن جو حکومت اسلام کی بنیاد و اساس پر قائم

ہو، وہ اپنے اقتدار واختیار سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اُٹھا سکتی، وہ اس امر پر مجبور ہے کہ اپنے اقدام وعمل کو، اسلام کے قائم کردہ حدود سے متجاوز نہ ہونے دے۔

بیت المال

موارد اسلامیہ کی تاریخ کا ایک مختصر جائزہ

یہ بحث نامکمل رہے گی، اگر ہم اسلامی بیت المال کی تاریخ پر ایک سرسری نظر نہ ڈالیں۔

رسول اللہ کے زمانۂ گرامی میں دولت اسلامیہ کے محاصل، غنائم، صدقات، اور جزیہ تک محدود تھے، یہ جیسے ہی وصول ہوتے تھے اپنے مصرف میں صرف کر دیئے جاتے تھے۔ غنائم میں چار اخماس غانمین میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے، اور ان کا خمس ان مصارف میں صرف کر دیا جاتا تھا، جن کی تشریح قرآن میں خدا نے کر دی ہے، اسی طرح صدقات کی رقم بھی انہی مصارف پر صرف کی جاتی ہے، جن کا تعین قرآن میں خدا نے کر دیا ہے، اور جزیہ کی آمدنی حاجات، جہاد و غزوہ اور مصالح عامہ پر خرچ کی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں آمدنی خرچ سے زیادہ نہیں تھی۔ لہٰذا اس کی ضرورت ہی نہیں تھی، کہ حفظ مال کے لیے بیت المال قائم کیا جائے، یہی حال حضرت ابوبکر کے زمانے میں تھا، ان کے عہد حکومت میں بھی مال جمع نہیں ہوتا تھا۔ جو آمدنی ہوتی تھی فوراً خرچ کر دی جاتی تھی، یہاں تک کہ جب آپ کی وفات ہوئی، تو آپ کے پاس حکومت کا مال کیا برآمد ہوا؟ صرف ایک دینار!

حضرت عمرؓ کا عہد فرمانروائی

پھر حضرت عمر کے زمانہ میں دولت اسلامیہ نے وسعت حاصل کی اور اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کے مقبوضات میں ارض شام و مصر و فارس داخل ہو گئی، لہٰذا حکومت کے محاصل میں بھی اضافہ ہو گیا اور خراج، عشور اور جملہ موارد شرعیہ میں بہتات شروع ہو گئی۔ اب مسلمان ان کے ضبط و نظم کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے درجے مقرر کئے، انہیں خاص ترتیب اور اصول پر رکھنا شروع کیا۔ اور مصالح عامہ کے تمام ابواب و فصول مدون کئے حضرت عمر نے باقاعدہ ایک دفتر قائم کیا جس میں آمد و خرچ کا پورا پورا حساب رہتا تھا، نیز ان لوگوں کی فہرست مرتب کی جو امداد کے مستحق تھے، ان کے وظائف کی تعیین کی، بیت المال قائم کیا جس میں وہ رقم رکھی جاتی تھی، جو خرچ سے فاضل ہوتی تھی، اور جسے دوسرے ہنگامی اور ضروری مصارف میں صرف کیا جاتا تھا، نیز ان مصارف میں صرف کیا جاتا تھا، جو مصالح عامہ کے ذیل میں آتے تھے، حضرت عمر سے پہلے بیت المال نہیں تھا، اس لئے کہ اس سے پہلے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح کوئی باقاعدہ دفتر بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس سے پہلے اس کی ضرورت نہیں تھی۔

علامہ ابن خلدون کا قول

ابن خلدون کا قول ہے:- دولت اسلامیہ میں سب سے پہلے جس نے باقاعدہ دفتر مرتب کیا، وہ حضرت عمرؓ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جب حضرت ابو ہریرہؓ بحرین سے مال کثیر لے کر آئے۔ وہ اتنا زیادہ تھا کہ اس کی تقسیم محال ہو گئی، لہٰذا ضرورت ہوئی کہ اس کا احصا کیا جائے، اور عطایا اور حقوق کو باقاعدہ منضبط اور مدون

کیا جائے۔ حضرت خالد بن ولید نے ایک دفتر قائم کرنے کی رائے دی۔ اور کہا میں نے دیکھا ہے، کہ ملوک شام اسی طرح سے دفتر مرتب کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ رائے قبول فرمالی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کی رائے، ہرمزان[1] نے دی تھی، اور حضرت عمرؓ نے اسی کی رائے کے مطابق اس کا نام بھی رکھا،

جب یہ کام ہو گیا، تو حضرت عمرؓ نے عقیل بن ابی طالب، مخرمہ ابن نوفل اور جبیر بن معطم کو جو کتّاب قریش میں تھے، حکم دیا کہ ترتیب انساب پر عساکر اسلامیہ کا رجسٹر مرتب کریں، جو قرابت رسول کے لحاظ سے شروع ہو۔ اور اسی طرح درجہ بدرجہ اس کی ترتیب ملحوظ رہے۔ زہری نے ابن مسیب سے جو روائت کی ہے۔ اس کے مطابق محرم سنہ ۲۰ھ میں سپاہیوں کا رجسٹر ترتیب دیا گیا۔

حد بندی خراج اور جبایات کا رجسٹر، فوج کے رجسٹر کی طرح عربی زبان میں رکھا گیا، اور ولایات میں فتح اسلامی کے بعد رجسٹر اسی زبان میں رکھے گئے، جو وہاں کی زبان تھی، عراق کے رجسٹر فارسی میں، شام کے رومی میں، اور مصر کے قبطی میں تھے۔

پھر جب عبدالملک بن مروان کا دور حکومت شروع ہوا، اور عربوں میں حساب کتاب کے ماہر بھی پیدا ہونے لگے۔ تو اردن کے حاکم کو حکم دیا گیا۔ کہ شام کے رجسٹر عربی زبان میں منتقل کر دیے جائیں، یہ کام ایک سال میں تکمیل کو پہنچا، اس موقع پر عبدالملک کے کاتب سرجون

---

[1] ہرمزان خوزستان کا بادشاہ تھا، مسلمان ہو گیا تھا، مدینہ میں مقیم تھا، "مؤلف"

نے رومی کاتبوں سے کہا: "اب اس کام کے علاوہ زندگی بسر کرنے کے لئے کوئی اور کام ڈھونڈو، تمہارا یہ سلسلہ تو اللہ نے منقطع کر دیا۔

پھر حجاج نے اپنے کاتب صالح بن عبدالرحمٰن کو حکم دیا ـــــ جو عربی و فارسی کے ماہر تھے ـــــ کہ عراق کے رجسٹر فارسی سے عربی میں منتقل کریں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

ولید بن عبدالملک کے عہد سلطنت میں مصر کے رجسٹر قبطی زبان سے عربی زبان میں منتقل کر دیئے گئے۔ یہ کام یربوع فزاری نے کیا۔"

ہمارے لئے یہ آسان نہیں ہے، کہ ہم بالکل مکمل طور پر یہ بتا سکیں، کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں محاصل کی آمدنی کیا تھی، اور ان کے بعد کیا تھی؟ اس لئے کہ مورخین نے کبھی ایسا کیا ہے۔ کہ خراج کا ذکر کیا ہے تو اس سے صرف خراجی زمین کا خراج مراد لیا ہے، اور کبھی وہ اصطلاح مراد لی ہے، جو خراج اور جزیہ اور عشور پر مشتمل ہوتی تھی، اس وجہ سے محاصل کی تفصیل، نوعیت اور مقدار کا صحیح اندازہ لگانا آسان نہیں ہے اور وہ رجسٹر جن میں آمدنی اور خرچ کی تفاصیل مندرج تھیں، دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ لیکن اتنا تو ثابت ہے کہ خلفاء راشدین کے زمانہ حکومت میں، مالیہ کی حالت بہت اطمینان بخش تھا۔ اس لئے کہ محاصل کی آمدنی بہت بڑھ گئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف سواد کوفہ کا خراج حضرت عمرؓ کے آخر عہد خلافت میں ایک کروڑ درہم تھا، آمدنی خرچ سے یوں بڑھی ہوئی تھی، کہ خرچ میں کفائت اور احتیاط برتی جاتی تھی، عمال اور

والاۃ کے روزینے ان کی ضرورت کے مطابق ایک حساب سے مقرر
تھے، افواج کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی سادہ زندگی پر قائم تھیں، اس لئے ان
کا خرچ بھی بہت زیادہ نہیں تھا، اور قلیل رقم بھی انہیں کفائت کرتی
تھی، خلفاء خود مال مسلمین سے بہت کم فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان کے والی
بھی ان کے مسلک پر قائم تھے۔ اور حکومت کے مال میں اسراف کرتے
ہوئے ڈرتے تھے، اور انہیں خلیفہ کی طرف سے عتاب کا دھڑکا
لگا رہتا تھا۔ کہ کہیں ان پر یہ الزام نہ لگ جائے۔ کہ وہ مال محاصل مصلحت
عمومی کے علاوہ دوسرے مدات پر خرچ کر دیتے ہیں، اور حضرت عمرؓ تو
یہ کرتے تھے کہ اگر ان کے عمال میں سے کوئی شخص مال کماتا تھا، تو
وہ اسے تقسیم کر دیتے تھے۔ خواہ اس میں غبن کا احتمال نہ ہو جیسا کہ
انہوں نے سعد بن وقاص، عامل کوفہ، عمرو بن عاص عامل مصر اور
ابوہریرہ عامل بحرین وغیرہ کے ساتھ کیا۔

حسن کارکردگی

اس حسن انتظام اور کارکردگی، امانت اور صرف
میں احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی مالی حالت
بہت مستحکم ہو گئی، اور اس کی ضرورت ہی نہیں رہی، کہ لوگوں پر خواہ
مخواہ کے ٹیکس عائد کئے جائیں یا جو موارد شرعیہ ہیں، ان کے اصول و
حدود سے آگے بڑھا جائے، اس معاملہ میں ممالک کی فتوحات
اور لوگوں کے قبول اسلام سے بھی بہت مدد ملی،

لیکن خلفاء راشدین کے دور حکومت کے بعد حالات میں تغیر ہو
بداوۃ حضارت سے بدل گئی، سادگی کی جگہ مدنیت آگئی، خلافت بادشاہت
میں آگئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "خلفاء (یا ملوک!) کے مصروفات میں"

معولی اضافہ ہوگیا، ان کی دیکھا دیکھی والیوں کے مصارف میں بھی خاصا
اضافہ ہوگیا ہے اور ان کی ریس میں تمام عمال کے مصارف بڑھ
گئے۔ اب مجاہدات و غزوات کے بجائے، خانہ جنگی شروع ہوگئی
اموبوں، ہاشمیوں اور خارجیوں کی لڑائی، ہمارے اس دعوے کا
بیّن ثبوت ہے۔

بداوت اور حضارت! اس حضارت، اور مدنیت اور خانہ جنگی کے سبب خرچ آمدنی سے زیادہ ہونے لگا
اور تحصیل کی آمدنی ناکافی ہونے لگی، لہٰذا ضرورت ہوئی، کہ اسلام کے
بنائے ہوئے ضوابط و آئین پر (جو موارد مالیہ کے متعلق تھے) قناعت
کرنے کے بجائے ان کے حدود سے آگے بڑھا جائے۔

اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا اور یہی ہوا کہ دست تظلم دراز ہو،
اور غیر مشروع محاصل اور ٹیکس کی وصولی میں زیادتی سے کام لیا جائے
چنانچہ لوگوں کو تنگ کیا گیا، اور طرح طرح کے ٹیکس عائد کئے گئے۔
خراج اور جزیہ کی رقوم میں اضافہ کیا گیا، آخر نوبت یہاں تک پہنچی
کہ معاملہ تناقض عہد تک پہنچ گیا اور خراب زمین پر بھی ٹیکس عائد کیا
جانے لگا۔ عید نوروز کے دن ذمیوں پر فرض قرار دیا گیا، کہ وہ ہدایا
پیش کریں، علاوہ ازیں کشتیوں کی آمد و رفت پر بھی ٹیکس لگا دیا گیا۔
... بن محمد نے اپنے دور حکومت میں اہل آرمینیہ پر مچھلیوں کا
ٹیکس بھی عائد کر دیا تھا، اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ تحصیل وصول پر
ایسے عمال مامور کئے گئے، جو سفاک اور شقی تھے، پھر بھی مالی توازن
قائم نہ ہو سکا، لوگوں میں اس نظام حکومت سے بیزاری پیدا ہوگئی

ایسے لوگ نمودار ہو گئے کہ جو حکومت کے سقوط اور زوال کی تدبیریں سوچنے لگے ، نہ عوام خوش تھے ، نہ خواص ، عوام اس لئے ناخوش تھے کہ ان کا مفاد مجروح ہو رہا تھا ، اور خواص اس لئے بگڑے ہوئے تھے ، کہ وہ نت نئے ٹیکسوں کی وجہ سے دبے ہوئے تھے ۔

بنو عباس کا دورِ اقتدار

پھر جب بنی عباس کا دَور دَورہ ہوا ، اور انہوں نے لوگوں کے دل اپنے گرد جمع کرنا چاہے ، امویوں کے مظالم کی تلافی کرنی چاہی ، ان کی سیاست سے جو شکائتیں پیدا ہو گئی تھیں ان کا ازالہ چاہا ، تو سب سے پہلے انہوں نے مالیات کی طرف توجہ کی ، اور اس امر پر خاص توجہ مبذول کی ، ٹیکس اور محصول کے وصول کرنے میں کسی قسم کا جور و جبر نہ ہونے پائے اور مالی حالت سدھر جائے ،

یہاں تک کہ خلیفہ ہارون رشید کا دورِ حکومت آیا ، رشید نے اپنے قاضی ، امام ابویوسف سے درخواست کی کہ وہ ایک نظام شرعی اس لئے مرتب کر دیں ، جو عدل پر مبنی ہو ، اور جس میں خراج عشور ، اور صدقات کی وصولی ، مصالح عامہ مجروح نہ ہوں ، نہ کسی پر جور و جبر ہو ، نہ کسی کو کسی قسم کا گزند پہونچے ، چنانچہ اسی فرمائش کے پیش نظر امام ابویوسف رحمۃ اللہ نے اپنی وہ مشہور تصنیف مرتب کی ، جو کتاب الخراج کے نام سے معروف و مشہور ہے ۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ، قاضی صاحب کا یہ نظام اسلامی اتنا مکمل اور جامع تھا ، کہ اس پر عمل پیرا ہونے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس عہد میں ثروت بہت زیادہ بڑھ گئی ، حکومت کے مالیات میں بھی جائز حدود کے اندر

بہت زیادہ اضافہ ہوگیا، اور عوام کی حالت بھی بہت زیادہ سدھر گئی اس زمانہ کی ثروت بعض داستانیں ایسی ہیں کہ ان کا یقین کرتے ہوئے طبیعت ہچکچاتی ہے۔

بنو عباس کا زوال و انحطاط

پھر جب عباسیوں پر ضعف طاری ہوا، اور وہ خانہ جنگیوں میں مبتلا ہوئے تو ان کا نظام مالی بھی اسی طرح مختل اور ناکارہ ہو گیا، — جس طرح امویوں کا ہوگیا تھا اور وہ بھی اپنے پیشرووں کی طرح نظام، مصلحت، اور ضرورت سے بے نیاز ہو گئے، آخر دولت اسلامیہ متعدد حکومتوں میں بٹ گئی۔ اور ان متعدد حکومتوں سے کسی کا نظام مالی بھی اصول شرعی اور آئین اسلامی پر مبنی نہیں تھا۔ "وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ"

ماوردی کی

الاحکام السلطانیہ

اسلامی نظم و آئین کا خاکہ
کتاب و سنت اور روایات کی روشنی میں

فہرست عنوانات

(۱)	فوجی نظم و نسق	۳۱۶
(۲)	باغی اور مرتد	۳۲۰
(۳)	قاضی اور منصف	۳۲۷
(۴)	فوجداری	۳۶۲
(۵)	نماز کی امامت	۳۹۹
(۶)	امیر حج	۴۱۴
(۷)	حکم صدقات	۴۲۴
(۸)	فے اور غنیمت	۴۴۹
(۹)	احکام مختلفہ	۴۷۵
(۱۰)	افتادہ اراضی و آبپاشی	۴۹۲
(۱۱)	چراگاہ اور پڑاؤ	۵۰۸
(۱۲)	جاگیر	۵۱۷
(۱۳)	جرائم کے قوانین	۵۳۲
(۱۴)	احتساب	۵۴۶

الامان پرنٹنگ پریس لاہور

فوجی نظم و نسق (۱)

سپہ سالاروں کا تقرر صرف مشرکین سے پیکار کرنے کے لئے عمل میں لایا جاتا ہے۔ اسکی
دو قسمیں ہیں، پہلی یہ کہ سپہ سالاروں کو فقط ترتیب لشکر اور تدابیر جنگ کے اختیارات ہوں اس قسم
میں امارتِ خاصہ کی شرائط ہونی چاہئیں، دوسری یہ کہ امیر مذکورہ بالا اختیارات کے علاوہ مالِ غنیمت
کی تقسیم اور دشمنوں سے مصالحت کرنے کا مجاز ہو اس قسم میں امارتِ عامہ کی شرائط ہونی چاہئیں۔
لشکر اور اسکے متعلقین میں سے جو شخص مسلمانوں کی بزدلی یا اضطراب کا سبب ہو یا کفار کا
جاسوس ہو نکال دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی سلول کو بعض غزوات سے اسی
جرم میں نکالا تھا۔

قتل کفار لڑائی کے دوران میں مسلمان کو ہر کافر کا قتل کرنا جائز ہے، خواہ وہ لڑ رہا ہو یا
نہ لڑ رہا ہو۔ اور بوڑھوں اور عبادت گاہوں میں بیٹھے ہوئے راہبوں کو قتل نہ کیا جائے،
اس لئے کہ بچوں کی طرح وہ بھی امن پسند ہوتے ہیں

عورتوں بچوں کا قتل عورتوں اور بچوں کو اگر قتال نہ کرتے ہوں تو کسی حالت میں قتل
کرنا جائز نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی ممانعت فرمائی ہے، نیز خدمتگار اور غلاموں کے قتل سے بھی
منع کیا ہے، اگر عورتیں اور لڑکے قتال میں حصہ لے رہے ہیں تو ان کو بھی قتل کیا جائے
بشرطیکہ سامنا کر رہے ہوں، اور اگر پشت دے کر بھاگ رہے ہوں تو قتل کرنا جائز نہیں ہے، اگر

---

(۱) علامہ ابوالحسن الماوردی کی مشہور کتاب الاحکام السلطانیہ (طبع حیدرآباد) پیش نظر ہے علاوہ
موصوف فوجی منصب قضا پر فائز رہ چکے تھے، اور بڑے پایہ کے عالم تھے، اس اہم اور گراں پایہ
کتاب کے چند ضروری ابواب و فصول کی تلخیص معمولی ترمیم کے ساتھ اگلے صفحات میں پیش کی گئی ہے۔
سرخیاں اور ذیلی عنوانات میرے قائم کئے ہوئے ہیں۔ (رئیس احمد جعفری)

دشمنوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنے بچاؤ کے لئے سامنے کھڑا کر لیا ہو، اور ان پر حملہ کئے بدوں دشمن تک پہنچنا ممکن نہ ہو تو عورتوں اور بچوں کا قتل بھی جائز ہے، اور مسلمان قیدیوں کو سامنے کر کے بچاؤ کر رہے ہیں اور قیدیوں پر حملہ کئے بدوں دشمن تک نہیں پہنچ سکتے تو مسلمان قیدیوں کا قتل کرنا جائز نہیں ایسی حالت میں اگر مسلمان محصور ہو جائیں تو نکلنے کی کوشش کی جائے، مگر مسلمان قیدیوں پر ہرگز حملہ کا قصد نہ کیا جائے، اگر قتل کیا گیا تو قاتل پر دیت اور کفارہ دونوں واجب ہو گئے، بشرطیکہ قتل کرتے ہوئے اس کو سمجھ رہا تھا - اور اگر مسلمان نہیں سمجھ رہا تھا تو صرف کفارہ واجب ہوگا - اگر دشمن گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑ رہے ہیں تو اُن کے گھوڑوں کا قتل کرنا جائز ہے اور بعض فقہا اسکے خلاف ہیں -

آئینِ عسکری | سپہ سالاری کے احکام کی تیسری قسم فوجی انتظام سے متعلق ہے جسمیں سپہ سالار پر دس امور کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے (۱) فوج کو دشمن کے اچانک حملے سے محفوظ رکھے اسکی صورت یہ ہے کہ پوشیدہ مقامات کی خبر گیری اور ناکوں پر قابلِ اطمینان محافظ دستوں کا تعین کرے تاکہ سکون کے وقت فوج آرام کرے اور جنگ کے وقت دوسرے لوگ امن سے رہیں - (۲) مقابلہ کے لئے ایسا مقام منتخب کرے، جس کی زمین نرم ہو، پانی بکثرت ہو، ہر طرف سے محفوظ ہو تاکہ وہاں اترنے اور قیام کرنے سے تقویت ہو (۳) سامان رسد مہیا رکھے اور حسبِ ضرورت تقسیم کرے (۴) دشمن کے حالات کا تجسس کرتا رہے، تاکہ اسکے فریب سے مامون رہے (۵) صفوں میں گڑبڑ نہ ہونے دے دشمن جس طرف متوجہ ہو، اسطرف امدادی فوج روانہ کرتا رہے (۶) فتح و نصرت کی امیدوں سے فوج کے حوصلے بڑھائے (۷) ثوابِ آخرت اور جنت کے طلبگاروں سے جزائے خداوندی کا وعدہ کرے اور دنیاداروں کو مالِ غنیمت کی امید دلائے، حق تعالےٰ فرماتا ہے - ومن یرد ثواب الدنیا نؤتہ منہا ومن یرد ثواب الاخرۃ نؤتہ منہا ترجمہ - طالبِ دُنیا کو ہم دُنیا دیتے ہیں اور طالبِ آخرۃ کو آخرت ثوابِ دُنیا سے مراد مالِ غنیمت ہے اور ثوابِ آخرت سے مراد جنت، دیکھو اللہ تعالےٰ نے دونوں قسم کی مرغوبات ذکر فرمائی ہیں - (۸) مشکل معاملات میں اربابِ عقل اور سیاستدانوں سے مشورہ کرتے تاکہ لغزش سے محفوظ رہے -

ثبات واستقلال | (امیر لشکر اسلام کو چاہیئے کہ) جب تک ممکن ہو دشمن کے مقابلے پر جما رہے، خواہ زیادہ عرصہ گزر جائے، لیکن پسپا نہ ہو، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے: یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُونَ

ترجمہ۔ اے ایمان والو، صبر کرو، دشمن کے مقابلہ پر جمے رہو، سرحدوں کی حفاظت کرو، اللہ تعالےٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح یاب ہو۔

چونکہ دشمن کے سامنے جمے رہنا جہاد کا ایک حق ہے، اس لئے جب تک حسب ذیل چار صورتوں میں سے کسی صورت سے کامیابی نہ ہو مقابلے پر جمے رہنا لازمی ہے، پہلی صورت یہ ہے کہ سب مسلمان ہو جائیں اپنی ملکیات ومقبوضات پر برقرار رکھے جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مجھے حکم ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہنے لگیں اور جب اس کے قائل ہو جائیں تو میری طرف سے ان کی جان ومال محفوظ ہو جائیں گے اور صرف حقوق کی وجہ سے سزائیں دی جائیں گی" اسلام لانے سے ان کے علاقے دارالاسلام سمجھے جائیں گے اور دارالاسلام ہی کے احکام ان پر نافذ کئے جائیں گے اور اگر میدان جنگ میں ان کی قلیل یا کثیر جماعت اسلام قبول کرے اور اس جماعت کا مال اور جائیدادیں محفوظ ہو جائیں گی، اگر امام کو ان کے علاقوں پر غلبہ حاصل ہو جائے، تو اس جماعت کا مال نہ لوٹا جائے، اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ غیر منقولہ اشیاء مثل زمین ومکان کے غنیمت میں لے لی جائیں اور سامان منقولہ کو لوٹا جائے مگر یہ خلاف سنت ہے اس لئے کہ بنو قریظہ کے محاصرے میں دو یہودی اسید اور ثعلبہ شعبہ کے بیٹے اسلام لائے تو اُن کا تمام مال واسباب محفوظ ہو گیا، بڑوں کے اسلام لانے سے چھوٹے بچے اور جنین بھی مسلمان سمجھے جائیں گے اور ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر دارالسلام میں مسلمان ہوا ہے تو اسکے بچے (جو دارالحرب میں ہیں) مسلمان نہ ہوں گے اور اگر دارالحرب میں مسلمان ہوا ہے تو اس کے چھوٹے بچے بھی مسلمان قرار دیئے جائیں گے، مگر جنین کا مسلمان ہونا نہیں مانا جائیگا

(۹) جملہ حقوق و امرونواہی پر فوج کو کاربند رکھے، کسی کو احکام دینیہ اور حقوق سے انحراف کرنے کی جرأت نہ ہونے دے، مجاہدین کا جو مذہب کے لئے سربکف ہیں، حلال و حرام میں فرق کرنا عام لوگوں سے بھی زیادہ ضروری ہے (۱۰) کسی فوجی کو تجارت اور زراعت میں مصروف نہ ہونے دے ورنہ اس کی تمام تر توجہ اُن چیزوں کی طرف مائل ہوجائے گی، اور دشمن سے لڑنے اور جہاد کرنے کی جرأت باقی نہ رہے گی۔

جہاد جہاد سے مقصود دین الٰہی کی نصرت ہے، اس اعتقاد کے اثر سے جزائے خلاف کا حصول دین کی امداد اور احکام الٰہیہ کی اطاعت میسر ہوگی مصائب و تکالیف کا تحمل اور ثبات قدمی پیدا ہوگی، اپنی نیت کو حصول غنیمت کے خیال سے فاسد نہ کرے یہ صفت حریص مال کی ہے نہ کہ مجاہد کی،

اطاعت امیر سپہ سالار کے حقوق جو فوج پر عائد ہوتے ہیں، چار ہیں، پہلا یہ کہ سپہ سالار کی حکومت کو تسلیم کریں اور اس کے احکام کو مانیں، اس لئے کہ وہ ان کا حاکم بنایا گیا ہے، اور حاکم کی اطاعت واجب ہے۔

دوسرا یہ ہے کہ تمام انتظام اس کے سپرد کرکے اس کی تدابیر پر اعتماد کریں اور کسی امر میں مختلف الرائے نہ ہوں، ورنہ اختلاف و تشتت پیدا ہوجائے گا۔

تیسرا امر یہ ہے کہ افسر کوئی حکم دے تو فوراً تعمیل کی جائے اور مخالفت کرے تو فوراً باز آ جائیں یہی اطاعت کے لوازم ہیں اور اگر حکم کی تعمیل نہ کریں یا روکنے پر باز نہ آئیں تو حاکم اس کا مجاز ہے کہ خلاف ورزی پر جرائم کی حیثیت سے ان کو سزا دے لیکن حاکم کا رویہ سخت نہ ہونا چاہیئے۔

چوتھا امر یہ ہے کہ جب حاکم مال غنیمت تقسیم کرے تو بخوشی اس کی تقسیم کو قبول کریں اور تقسیم کا نزاع نہ کریں، اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے اس میں شریف ادنیٰ، شریف، قوی، ضعیف سب کا مساوی حصہ مقرر کیا ہے۔

اور اگر کسی مسلمان نے دارالحرب میں جا کر جائیداد اور سامان خرید لیا ہو تو فتح کے وقت
اس کے مال پر قبضہ نہ کیا جائے۔ چونکہ اُسے خریدا ہے، لہٰذا وہی اس کا مستحق ہے۔
ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اس کی زمین مالِ غنیمت ہوگی، دوسری صورت یہ ہے کہ بفضلِ خداوندی
ان پر فتح نصیب ہو اور وہ حسبِ سابق مشرک ہیں تو ان کی اولاد مقید کر لی جائے، مال لُوٹ
لیا جائے اور جو گرفتار نہ ہو سکیں قتل کر دیے جائیں۔

صلح دشمن امن و صلح کے خواستگار ہوں اور ان پر غالب آنا یا اُن سے روپیہ لینا دشوار ہو
تو امیر مدتِ معینہ کے لیے مصالحت کر سکتا ہے، بشرطیکہ امام کی طرف سے اس کی اجازت دی گئی ہو
یا مفاداتِ عامہ حاصل ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعۂ حدیبیہ میں قریش کے ساتھ دس سال کے
لئے معاہدہ صلح کیا تھا، لہٰذا جہاں تک ممکن ہو صلح کی مدت کم مقرر کرے اور دس سال سے زیادہ کا
معاہدہ نہ کرے، ورنہ اس سے زیادہ کا معاہدہ زائد کے حق میں باطل ہوگا۔ اس مدت کے گزرنے تک
اگر وہ اپنے عہد پر ثابت ہیں تو ان کو امان ہوگا اور جہاد نہ کیا جائیگا اور اگر عہد توڑ بیٹھے تو
حربی سمجھے جائیں گے، بلا اطلاع ان پر چڑھائی جائز ہوگی۔ قریش نے صلح حدیبیہ کو توڑا تو
آپ لڑائی کیلئے بلا اعلانِ جنگ روانہ ہو گئے اور مکہ کو فتح کر لیا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہ فتح
مصالحت ہوئی تھی اور امام ابوحنیفہ رح فرماتے ہیں کہ غلبہ سے ہوئی تھی۔

جب وہ لوگ نقضِ عہد کریں تو اُن کے رہن کئے ہوئے غلام اور باندیوں کو جو مسلمانوں
کے قبضہ میں ہیں قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ حضرت معاویہ کے عہد میں رُومیوں نے عہد شکنی کی
حضرت معاویہ کے قبضہ میں رہن کردہ غلام باندیاں موجود تھیں، اگر مسلمانوں نے کسی کو قتل
نہ کیا اور یہ کہہ کر یونہی چھوڑ دیا کہ عہد شکنی کا جواب ہے۔ عہد سے وفا اس سے بہتر ہے
کہ عہد توڑ دیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، امانت والے کو امانت ادا کر دو، جو
شخص تمہارے ساتھ خیانت کرے تم اس کے ساتھ نہ کرو۔

باغی اور مُرتد

۷ جہاد مشرکین کے علاوہ تین قسم کی لڑائی اور ہے (۱) مرتدوں سے لڑائی
(۲) باغیوں سے لڑائی (۳) ڈاکوؤں سے لڑائی - پہلی قسم مرتدوں سے لڑائی کی
صورت یہ ہے کہ کوئی قوم جو حکماً مسلمان سمجھی جاتی تھی دائرۂ اسلام سے خارج ہو
ہو جائے - خواہ اصل پیدائش سے مسلمان تھی یا خود مسلمان ہو گئی تھی دونوں کا ایک ہی حکم
جبکہ دین چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب میں داخل ہونے سے ان کا قتل
ہو گیا تو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی ایک حالت تو یہ ہے کہ وہ دارالاسلام
میں ادھر اُدھر منتشر بلا کسی جتھے کے ہوں تب تو قتال کرنے کی ضرورت
نہیں ہے - کیونکہ اپنے قبضہ میں داخل ہیں صرف ان کا شبہ دور کر دیا جائے
اگر مذہبی شبہ پیش کریں تو دلائل و براہین سے ازالہ کیا جائے تاکہ
کو حق بات معلوم ہو تائب ہو جائیں اگر توبہ کر لیں تو قبول کی جائے
اور حسبِ سابق مسلمانوں میں داخل مانے جائیں

چند ضروری احکام

جب مرتد دارالحرب میں چلا جائے اور اس
مال دارالاسلام میں موجود ہو تو بالفعل اس
کوئی تصرف نہ کیا جائے اگر اسلام کی طرف عود کر آیا تو واپس
جائے - اگر حالتِ ارتدادی میں ہلاک ہو گیا تو مال فے میں داخل
اور ابو حنیفہ رح فرماتے ہیں کہ میں اس کے دارالحرب جانے

اس پر موت کا حکم لگاتا ہوں اور اس کا مال اس کے وارثوں کو تقسیم کر دیتا
ہوں اب اگر دارالاسلام میں واپس آگیا تو جو کچھ مال وارثوں کے پاس موجود ہے
تو وہ واپس لے لیا جائے اور جو ہلاک کر چکے ہیں اس کے تاوان دہ نہیں ہیں۔
یہ حکم تو اس صورت میں ہوگا جبکہ تمام مرتد علیحدہ جتھا بنا کر نہ رہیں بلکہ ادھر
ادھر مسلمانوں کے اندر رہتے ہوں دوسری حالت یہ ہے کہ مسلمانوں سے علیحدہ
محفوظ طریقے سے رہتے ہیں تو بحث مباحثہ اور دلائل اسلام کو واضح کرنے کے
بعد ان سے قتال کرنا واجب ہے ڈرانے اور موقع عذر دینے کے بعد ان
کے قتال کا حکم وہی ہوگا جو اہل عرب کے قتال کا ہے۔ اور غلام بنانا امام
شافعیؒ کے نزدیک جائز نہیں۔ اور جب ان پر غلبہ حاصل ہو جائے تو ان کی
اولاد کو خواہ زمانۂ اسلام کی پیدا شدہ ہو یا حالتِ ارتداد کی، قید نہ کیا جائے
ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ان کی عورتیں جو دارالحرب میں پہنچ گئی ہوں قید کر لی
جائیں اور جو مال لوٹا جائے اس کو غانمین میں تقسیم کیا جائے۔ مقتولوں
کا مال تو فئے میں شامل کر دیا جائے اور زندوں کا مال باقی رکھا جائے اور
اگر اسلام کی طرف عود کر آئیں تو واپس دیدیا جائے اور اگر بحالت ارتداد ہی
مر جائیں تو بھی فئے میں داخل کر لیا جائے اور جس مال کے مالک مجہول الحال
ہو گئے ہوں تو جب ان کے پتہ چلنے سے مایوسی ہو جائے اس کو بھی فئے میں
داخل کیا جائے حالتِ جنگ میں اگر مسلمانوں نے مرتدوں کو نقصان پہنچایا
ہو اور وہ مسلمان ہو جائیں تو کوئی تاوان واجب نہ ہوگا۔ اور مرتدوں
نے جس قدر مسلمانوں کا غیر حالت جنگ میں نقصان کیا ہوگا اس کا ضمان
ان کو دینا ہوگا اور حالت جنگ کے نقصان میں اختلاف ہے ایک قول
یہ ہے کہ ضامن ہوں گے اس لئے کہ مرتد ہونے کی معصیت ان

سے قابل ضمان اموال کا تاوان ساقط نہیں کر سکتی۔ اور دوسرا یہ ہے کہ وہ کسی جانی و مالی نقصان کے ضامن نہ ہوں گے اس لئے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مرتدوں نے جانی و مالی نقصان پہنچایا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہ ہم تمہارے مقتولوں کا تاوان دیتے ہیں اور نہ تم ہمارے مقتولوں کا تاوان دو اس کے بعد آپ کا اور آپ کے بعد والوں کا اسی پر عملدرآمد رہا طلیحہ قتل اور قید کے جرم کے ارتکاب کے بعد جب مقید ہو کر مسلمان ہوا تو حضرت عمرؓ نے مسلمان ہونے کے بعد اس کو کچھ نہ فرمایا نہ دم کا بدلہ لیا اور نہ مال کا۔

دارالارتداد بعض احکام میں دارالحرب سے اور بعض میں دارالاسلام سے ممتاز ہے دارالحرب سے حسب ذیل چار وجوہ میں ممتاز ہے۔

(۱) دارالارتداد والوں سے اس پر مصالحت جائز نہیں کہ اپنے علاقہ پر قابض رہیں اور اہل حرب سے جائز ہے۔

(۲) یہ جائز نہیں کہ مال ادا کر کے حالتِ ارتداد پر چھوڑ دیئے جائیں اور اہل حرب سے یہ مصالحت جائز ہے۔

(۳) ان کو غلام اور ان کی عورتوں کو باندیاں بنانا جائز نہیں اور اہل حرب کا غلام یا باندی بنانا جائز ہے۔

(۴) غانمین ان کے مال کے مالک نہ ہوں گے اور اہل حرب کے مال کے مالک ہو جائیں گے۔

اگر کوئی جماعت وجوب زکوٰۃ کا انکار کرتے ہوئے زکوٰۃ نہ دے تو مرتد ہوگی اور اس پر مرتدوں کے احکام جاری ہوں گے اور اگر وجوب کی معترف ہے مگر ادا نہیں کرتی تو مسلمان باغیوں کے حکم میں

ہوگی ادا نہ کرنے کی وجہ سے اس سے قتال کیا جائے۔ ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ان سے قتال نہ کیا جائے حالانکہ ابوبکر صدیقؓ رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ نہ دینے والوں سے باوجودیکہ وہ اپنے اسلام کے مدعی تھے قتال کیا وہ زبان سے کہتے تھے کہ ہم ایمان لانے کے بعد کافر نہیں ہوئے بلکہ اپنے مالوں کی بچت چاہتے ہیں حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تم ان کے ساتھ کیسے لڑ سکتے ہو حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مجھے حکم ہے کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہیں۔ اور جب یہ کہہ لیں تو مجھ سے خود کو اور اپنی اولاد کو محفوظ کر لیتے ہیں مگر جب ان کے ذمہ کوئی حق اسلامی واجب ہو۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ یہ بھی تو اسی کا حق ہے اچھا اگر وہ نماز چھوڑنا چاہیں، روزہ چھوڑنا چاہیں، حج چھوڑنا چاہیں تو کیا کرو گے؟ پھر تو اسلام کی ہر گرہ کھل جائے گی۔ خدا کی قسم ایک اونٹنی یا ایک رسی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کرتے تھے اگر دینا چھوڑ دیں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی وہ بات سمجھا دی جو ابوبکر صدیقؓ کو سمجھائی تھی۔

باغیوں سے جنگ جب کوئی جماعت اپنا جدا مسلک ایجاد کر کے رائے عامتہ کے خلاف اور مسلمانوں سے باغی ہو جائے تو اگر طاعت امام سے سے سرتابی نہیں کی اور نہ مسلمانوں سے الگ یکجائی قوت حاصل ہوئی۔ اِدھر اُدھر متفرق طور پر آباد اور مسلمانوں کے اقتدار و اختیار میں ہے تو اس کے ساتھ لڑائی نہ کی جائے بلکہ عدل و انصاف کے ساتھ ان کے حقوق دلائے جائیں اور جو ان کے ذمہ ہوں وصول کئے جائیں خارجیوں کی ایک قوم اختلاف رائے کی بنا پر

حضرت علیؓ کے خلاف ہو گئی ان میں سے ایک شخص نے منبر پر تقریر کرتے ہوئے کہا "خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے" حضرت علیؓ نے فرمایا بات تو حق ہے مگر اس سے مقصود باطل لیا گیا ہے۔ ہم تمہیں تین رعایتیں دیتے ہیں مساجد میں نماز اور عبادت ربی سے نہ روکا جائے گا، تمہارے ساتھ لڑائی کی ابتدا نہ کی جائے گی، جب تک تم ہمارے معاون ہو تم کو فئے میں سے حصہ لینا بند نہ ہو گا اور اگر یہ لوگ اپنے عقیدے کی اشاعت کرتے پھرتے ہیں اور اہل حق کے ساتھ ملے جلے آباد ہیں تو امام کو چاہیئے کہ ان کو عقیدے کے فساد اور بدعت کے بطلان سے آگاہ کرے تاکہ حق اور موفقت اہل حق کی طرف لوٹ آئیں اگر ان میں سے کوئی شخص زیادہ فتنہ میں حصہ لیتا ہو تو اس کو امام تنبیہاً سزا دے سکتا ہے مگر قتل یا حد کا حکم نہ دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا خون باستثناء تین صورتوں کے حلال نہیں۔

(۱) ایمان لاکر پھر مرتد ہو جائے۔

(۲) شادی شدہ ہو کر زنا کا مرتکب ہو۔

(۳) کسی انسان کو بغیر بدلۂ انسان کے قتل کر دے، اگر باغی اہل حق سے جدا ہو کر مسلمانوں سے الگ مستقل طور پر رہنے لگیں، تو اگر حقوق واجبہ ادا کر رہے ہیں امام کے مطیع ہیں تو ان سے جنگ نہ کی جائے۔ نہروان کی ایک خارجیوں کی جماعت حضرت علیؓ سے جدا ہو گئی تھی آپ نے عامل کو وہاں مقرر کر کے بھیجا جو ایک عرصہ تک مصالحت اور سکون کے ساتھ ان پر حکومت کرتا رہا، اور بعد کو انھوں نے اس کو قتل کر دیا، حضرت علیؓ نے قاتل کا مطالبہ کیا، جس پر انھوں نے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ ہم سب اس کے

قاتل ہیں۔ آپ نے فرمایا تو خود کو میرے حوالے کر دو۔ میں تم میں سے بعض کو قتل کر دوں گا چنانچہ آپ گئے اور اکثر کو قتل کیا اگر باغی جماعت اطاعت امام سے باہر ہو کر حقوق واجبہ کی ادائی سے رک جائے۔ محصولات ملکی کی وصولی اور احکام کا اجرا کرنے لگے تو اگر کسی کو اپنا امام یا سردار بنائے بدون ایسا کیا ہے تو محصولات غصب کے حکم میں ہوں گے یعنی ادا کرنے والا بری الذمہ نہ ہوگا اور جاری شدہ احکام رد ہوں گے جن سے کوئی حق ثابت نہ ہوگا۔ اور اگر انتخاب امام کے بعد اس کے حکم سے محصولات کی وصولی اور نفاذِ احکام ہوا ہے تو نہ محصولات کا مطالبہ کیا جائے اور نہ احکام مردود ٹھہرائے جائیں مگر ہر دو صورت میں جنگ ایک ہی طرح کی جائے تاکہ علیحدگی چھوڑ کر امام برحق کے مطیع ہو جائیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما فان بغت احدٰهما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتیٰ تفئ الیٰ امر اللہ فان فاءت فاصلحوا بینهما بالعدل واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین"

ترجمہ:۔ اگر اہل ایمان کے دو گروہ باہم لڑ پڑیں تم اُن میں صلح کرا دو اگر اُن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہو تو جس کی زیادتی ہو تم اس سے لڑو تاکہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے تب تم ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرا دو۔ بیشک انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

"فان بغت احدٰهما علی الاخریٰ" میں دو توجیہیں ہیں ایک یہ ہے کہ جنگ میں زیادتی کر کے باغی ہو جائے دوسری یہ کہ صلح سے روگردانی کر کے باغی ہو جائے۔ "فقاتلوا التی تبغی" سے مراد یہ ہے کہ تلوار

کے ساتھ تاکہ بغاوت و مخالفت سے باز آجائیں - اور "حتی تفئ الی امر اللہ" کے مطلب دو ہیں - ایک یہ کہ صلح کی طرف (جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے) لوٹ آئیں - یہ سعید بن جبیر کی رائے ہے - دوسرا یہ کہ اپنے اور دوسروں کے حقوق میں قرآن و حدیث کی طرف رجوع کریں یہ قتادہ کی رائے ہے فان فاءت کے معنی یہ ہیں کہ بغاوت چھوڑ دیں "فاصلحوا بینھما بالعدل" اس کے بھی دو مطلب ہیں ایک یہ کہ حق کے ساتھ دوسرا یہ کہ قرآن کے ساتھ جب امام کی طرف سے کسی شخص کو بغاوت فرو کرنے کے لئے امیر بنایا جائے تو امیر کو چاہیئے کہ جنگ سے پہلے ان کو ڈرائے، دھمکائے اور معذرت کرنے کا موقع دے - اگر باز آئیں تو مقابل ہو کر لڑے اچانک حملہ آور نہ ہو اور نہ شبخون مارے - باغیوں کی جنگ اور مشرک اور مرتدوں کی جنگ میں آٹھ چیزیں مابہ الامتیاز ہیں -

(۱) یہ کہ اُن کو سرکشی سے روکنا مقصود ہوتا ہے قتل و ہلاک کرنا مقصود نہیں ہوتا اور مشرک و مرتدوں کا قتل بھی مقصود بالذات قرار دینا جائز ہے -

(۲) یہ کہ سامنا کریں تو قتل کئے جائیں ورنہ نہیں اور مرتد و مشرک ہر طرح قتل کیے جا سکتے ہیں -

(۳) یہ کہ ان کے زخمی قتل نہ کئے جائیں اور مشرک و مرتدوں کے زخمی قتل کرنے جائز ہیں جنگ جمل میں حضرت علیؓ نے اپنے نقیب کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا تھا کہ خبردار بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے، زخمی کو قتل نہ کیا جائے -

(۴) یہ کہ ان کے قیدی بند کئے جائیں۔ مشرک و مرتدوں کے قیدی قتل کئے جا سکتے ہیں۔ باغی قیدیوں کے متعلق یہ ہے کہ جن کے بارے میں یہ اطمینان ہو کہ پھر باغیوں میں شریک نہ ہوگا تو چھوڑ دیا جائے ورنہ جنگ کا مطلع صاف ہونے تک قید رکھا جائے اور اس کے بعد چھوڑ دیا جائے۔ پھر محبوس رکھنا جائز نہیں۔

(۵) یہ کہ ان کا مال لوٹا جائے اور نہ اولاد کو لونڈی غلام بنایا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دارالاسلام اپنی ہر چیز کو مامون کر لیتا ہے اور دارالشرک مباح رکھتا ہے۔

(۶) یہ کہ ان کے ساتھ جنگ کرنے میں مشرک حلیف یا ذمی سے اعانت نہ لی جائے۔ اگرچہ حربی اور مرتدوں کی جنگ میں ان لوگوں سے امداد لی جا سکتی ہے۔

(۷) یہ کہ ان سے ایک مدت معینہ کے لئے یا روپیہ لے کر صلح نہ کی جائے اگر مدت معینہ کے لئے صلح کر لی گئی تو اس کا ایفا ضروری نہیں ہے اگر بالفعل ان سے لڑنے کی قدرت نہیں ہے تو حصول قدرت کا منتظر رہے اسی طرح جو صلح روپیہ لے کر کی گئی ہے وہ بھی باطل ہے اور روپیہ کے متعلق یہ ہے کہ روپیہ فے یا صدقات کا ہے تو واپس نہ دیا جائے۔ فے کو مستحقین فے میں، اور صدقات کو مستحقین صدقات میں تقسیم کر دیا جائے۔

(۸) یہ کہ ان پر منجنیق وغیرہ نصب نہ کی جائیں ان کے مکانات نہ جلائے جائیں اور درخت اور کھجوریں نہ کاٹیں جائیں۔ کیونکہ اگرچہ وہ لوگ باغی ہیں لیکن ملک دارالاسلام ہے جس کی تمام اشیا محفوظ ہوتی ہیں اگر

اہل حق مسلمان محصور ہوجائیں اور اندیشہ ہو کہ باغی تباہ کر دیں گے تو ان کے قتل کا ارادہ کرنا اور ان پر منجنیق نصب کرنا جائز ہے اس لئے کہ مسلمان کو جب اپنی جان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو جائے اور کوئی چارۂ کار نہ رہے تو اپنے حریف کو قتل کرنا، اس پر منجنیق نصب کرنا جائز ہے۔ باغیوں کے ہتھیار اور سواریوں سے نفع نہ اٹھایا جائے بلکہ جنگ کے وقت بھی ان کی چیزوں کو ان کے خلاف استعمال میں نہ لایا جائے۔ ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب تک لڑائی باقی رہے ان کی چیزوں سے منتفع ہو سکتے ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے۔ لڑائی ختم ہو جائے تو ان کا جس قدر مال اہل حق کے پاس موجود ہے واپس کر دیا جائے اور ان کا جو مال جنگ کے علاوہ صورت سے ضائع ہوا ہے اس کا تاوان ضائع کرنے والے سے دلایا جائے۔ اور جو لڑائی کے شعلوں میں ضائع ہوا ہے اس کا کوئی معاوضہ یا تاوان نہیں اہل حق کا وہ جان و مال جو باغیوں نے جنگ کے علاوہ ضائع کیا ہے تاوان لے کر وصول کر لیا جائے۔ اور جو جنگ کے اندر ضائع کیا ہے اس کے متعلق دو قول ہیں پہلا یہ کہ اس کا تاوان ساقط ہے۔ دوسرا یہ کہ تاوان لیا جائے۔ اس لئے کہ معصیت حقوق یا تاوان کو ساقط نہیں کر سکتی۔ لہٰذا قتل عمد میں قصاص لیا جائے۔ اور قتل خطا میں دیت وصول کی جائے۔ مقتول باغیوں کو غسل بھی دیا جائے۔ اور ان کی نماز بھی پڑھی جائے۔ ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں سزاءً نماز نہ پڑھی جائے حالانکہ مردہ کے اوپر کوئی دنیوی عذاب نہیں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

فرماتے ہیں میری امت پر اپنے مردوں کا غسل اور ان کی نماز فرض ہے
اور اہل حق کے متعلق جو میدان جنگ میں قتل ہوں دو قول ہیں ایک یہ
کہ کفار کی جنگ کے شہدا کی طرح بزرگی اور کرامت کی وجہ سے نہ غسل
دیے جائیں اور نہ ان کی نماز پڑھی جائے دوسرا یہ کہ اگرچہ ظلماً
مقتول ہوئے ہیں غسل بھی دیا جائے اور نماز بھی پڑھی جائے چنانچہ
مسلمانوں نے عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کی نماز پڑھی ان کے بعد علی رضہ
کی نماز بھی پڑھی گئی حالانکہ یہ تینوں حضرات ظلماً قتل ہوئے تھے قاتل
باغی مقتول اہل حق کا وارث نہ ہوگا اسی طرح قاتل اہل حق مقتول
باغی کا وارث نہ ہوگا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قاتل
وارث نہیں ہوتا" ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اہل حق
باغی کا وارث ہوگا کہ وہ حق پر ہے اور باغی اہل حق کا وارث نہ ہوگا
کہ ناحق پر ہے۔ ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک دونوں
ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں کیونکہ دونوں ایک دوسرے
کو قتل کرنے میں تاویل کرتے ہیں اور قتل کو جائز سمجھتے ہیں اگر ذمی
تاجر باغیوں کے محصل عشر کے راستے پر گزریں اور وہ ان سے عشر لے
لیں تو وہ عشر لینا جائز نہیں ہے لہٰذا اگر پھر اہل حق کے سامنے سے گزریں
گے تو دوبارہ ان سے عشر لیا جائے گا اس لئے کہ تاجر اپنے اختیار سے
باغیوں کے سامنے ہو کر گزرے تھے بخلاف اس کے اگر باغیوں سے
ایسے جرائم سرزد ہوں کہ جن کی سزائیں حدود ہیں تو ان پر قدرت
پانے کے بعد قائم کرنے میں دو وجہیں ہیں (یعنی جواز اور
عدم جواز)

مفسدوں رہزنوں کی سرکوبی جب کوئی مفسدوں کا گروہ ہتھیاروں کے استعمال اور
سامان کی لوٹ، قتل و غارت، آمد و رفت کو بند کرنے کے جرائم کا
مرتکب ہو تو یہ وہ محارب ہوں گے جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے
قرآن شریف میں کیا ہے" انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ
ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم
من خلاف او ینفوا من الارض۔"

ترجمہ:۔ بے شک ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے
لڑتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ وہ قتل کردئے
جائیں یا ان کو سولی پر لٹکا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں بغیر ترتیب
قطع کر دیئے جائیں یا ان کو خارج البلد کر دیا جائے۔

اس آیت کے حکم میں فقہا کے تین مسلک ہیں۔

(۱) یہ کہ امام یا نائب کو جسے امام نے اس فتنہ کو فرو کرنے کے لئے
مقرر کیا ہے یہ اختیار ہے کہ مجرمین کو قتل کرے سولی نہ دے
یا قتل بھی کرے سولی بھی دے یا یہ کہ مخالف ہاتھ پیر کاٹ دے
یا جلاوطن کر دے یہ مذہب سعید بن المسیب، مجاہد، عطاء اور
ابراہیم نخعی کا ہے۔

(۲) یہ کہ صاحب الرائے اور تدابیر کرنے والے کو قتل کر دے
اس کو معاف نہ کرے اور مضبوط قوی الجثہ کے مخالف ہاتھ پیر
کاٹ دے اور جو ایسے نہ ہوں ان کو تعزیر و قید کی سزا دے
یہ مسلک مالک بن انس اور فقہائے مدینہ کی ایک جماعت کا

ان کے نزدیک سزا اختلاف افعال و صفات کی وجہ سے مختلف ہونی چاہیئے۔

(۲) یہ کہ اختلاف افعال کا اعتبار کیا جائے اور اختلاف صفات کا اعتبار نہ کیا جائے لہٰذا جو شخص قتل اور لوٹ کا مرتکب ہو اس کو قتل اور سولی کی سزا دی جائے جس نے صرف مال لوٹا ہے قتل نہیں کیا اس کے مخالف کے ہاتھ پیر کاٹے جائیں۔ جس نے شامل ہو کر مفسدوں کی مقدار زیادہ کی یا لوگوں کو ڈرایا نہ قتل کیا نہ مال لوٹا اس کو تنبیہی سزا دی جائے نہ قتل کیا جائے نہ ہاتھ پیر کاٹے جائیں۔ یہ قول ابن عباس، حسن، قتادہ، سدی کا ہے اور یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر قتل اور لوٹ دونوں کے مرتکب ہوئے ہیں تو امام کو اختیار ہے کہ پہلے قتل کرے پھر سولی پر چڑھائے یا مخالف ہاتھ پیر کاٹ کر سولی پر چڑھائے۔ اور جو شخص ہیبت اور کثرت تعداد کا سبب ہوا ہے اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اللہ کے قول «او ینفوا من الارض» کے ارباب تاویل چار معنے کرتے ہیں

(۱) معنی یہ ہیں کہ ان کو دارالاسلام سے نکال کر دارالحرب بھیجدیں یہ قول مالک بن انسؒ، حسنؒ، قتادہؒ، زہریؒ کا ہے۔

(۲) معنی یہ ہیں کہ ایک شہر سے دوسرے شہر بھیجدیں یہ قول عمر بن عبدالعزیزؒ اور سعید بن جبیرؒ کا ہے۔

(۳) معنی یہ ہیں کہ قید کر دیئے جائیں یہ قول ابو حنیفہؒ اور مالکؒ کا ہے۔

(۴) یہ ہیں کہ ان کو بلا کر حدود قائم کرنے کے لئے دور لے جائیں یہ ابن عباسؓ اور شافعیؒ کا قول ہے۔

و آیت الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیهم میں ارباب
تاویل کی چھ رائیں ہیں۔

(۱) یہ کہ یہ آیت مفسد، برسرِ جنگ کافروں کے متعلق ہے جو اسلام لا کر تائب ہو جائیں اور مسلمان مراد نہیں کیونکہ توبہ مسلمانوں کے ذمے سے حد یا حقوق کو ساقط نہیں کر سکتی۔ یہ قول ابن عباسؓ، حسنؓ، مجاہدؒ، قتادہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔

(۲) یہ کہ یہ اُن برسرِ پیکار مسلمانوں کے بارے میں ہے جو امام کے قابو میں آنے سے پیشتر طالب امان اور تائب ہوں ورنہ بلا طلب امان محض توبہ کارآمد نہیں ہوتی۔ یہ قول علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور شعبی کا ہے۔

(۳) یہ کہ اس مسلمان کے حق میں ہے جو دارالحرب چلا گیا ہو اور قابو میں آنے سے پہلے تائب ہو کر واپس آ جائے۔ یہ عروہ بن زبیرؓ کا قول ہے۔

(۴) یہ کہ اس شخص کے متعلق ہے جو دارالاسلام میں رہتا ہو اسلام کے برخلاف زور پکڑ رہا ہو اور حکومت کے ہاتھ آنے سے پہلے تائب ہو گیا ہو۔ تو اس سے مواخذہ نہ ہوگا اور اگر زور و قوت نہ رکھتا ہو تو مواخذہ ضرور ہوگا۔ یہ قول ابن عمر، ربیعہ، حکم بن عیینہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔

(۵) یہ کہ اگرچہ زور و قوت نہ رکھتا ہو مگر قابو میں آنے سے پہلے اگر تائب ہو گیا تو حقوق عباد کے سوا تمام خداوندی حدود معاف ہو جائیں گی یہ رائے امام شافعی کی ہے۔

(۹) یہ کہ گرفتار ہونے سے پہلے توبہ کرنے سے جانی نقصان کے علاوہ
تمام حدود خداوندی اور حقوق العباد معاف ہو جاتے ہیں یہ مالک
بن انس رضی کا قول ہے آیت کا حکم اور ارباب تاویل کے اختلاف کے بعد
معلوم ہونا چاہئے کہ محارب (برسرپیکار) جماعت اگر محفوظ مقام پر
سکونت پذیر ہے تو اس سے لڑنے کی وہی صورتیں ہیں جو باغیوں
سے لڑنے کی۔ البتہ پانچ باتوں میں فرق ہے۔

(۱) خواہ مقابلہ کریں یا بھاگیں ہر طرح قتل کرنا جائز ہے اور باغی
بھاگیں تو تعاقب جائز نہیں۔

(۲) یہ کہ ان کے قتل کا ارادہ اور نیت جائز ہے اور باغیوں کی
(صرف تنبیہ کی جائے) عمداً قتل کرنا جائز نہیں۔

(۳) یہ کہ ان لوگوں سے تمام جانی و مالی نقصان کا مواخذہ ہو گا۔
اور باغیوں سے نہ ہو گا۔

(۴) یہ کہ ان میں اسے گرفتار شدہ کو محبوس (قید) کرنا جائز ہے اور باغیوں
کو جائز نہیں۔

(۵) یہ کہ جس قدر خراج و صدقات ان لوگوں نے وصول کیا ہے۔
[illegible]ب ولوٹ کے حکم میں ہو گا ادا کرنے والے بری الذمہ نہ ہوں گے
[illegible]کو دوبارہ ادا کرنا ہو گا۔ اگر امیر کے اختیارات محدود ہوں یعنی
[illegible] فتنہ فرو کرنے کے لئے مامور کیا گیا ہو تو فتنہ پردازوں پر غالب
[illegible]کے بعد سزا و حدود کے اجرا کا اور مطالبہ حقوق کا مجاز نہیں مجرموں
[illegible]کے دربار میں پیش کرے وہ اپنے حکم سے حدود کا اجراء اور
[illegible] مطالبہ کرے۔ اگر امیر کو اختیارات عمومی تفویض کئے گئے ہوں

یعنی لڑنے اور مطالبہ حقوق اور اقامت حدود کا بھی اختیار ہو تو اس
کا اہل علم اور صاحب عدالت ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی طرف
سے حدود و حقوق کے احکام کا نفاذ صحیح ہو سکے۔ پس اگر امیران
صفات سے متصف ہو تو یاد رہے کہ مجرموں کے خلاف ثبوت جرم
کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) یہ کہ مجرم بلا جبر و اکراہ اور مار پیٹ کے اقبال جرم کر لے۔
(۲) یہ کہ اگر جرم سے انکار کرتا ہے تو اس کے خلاف شہادت
صحیحہ بہم پہونچے۔ بہر حال اگر مذکورہ بالا کسی صورت سے جرائم ثابت
ہو جائیں تو جو قتل اور لوٹ دونوں کا مرتکب ہوا ہو اس کو قتل
کرا کر سولی پر لٹکانے کی سزا دے اور امام مالکؒ کی رائے ہے
کہ زندہ کو سولی پر لٹکا کر نیزے مار مار کر قتل کیا جائے یہ قتل واجب
ہے اس کو معاف کرنا جائز نہیں اگر صاحب حق بھی معاف کرے
تو لغو ہے معاف نہ ہوگا۔ سولی پر تین روز سے زیادہ نہ لٹکایا
جائے اس کے بعد اتار دیا جائے۔ اور جس نے قتل کیا، لوٹا نہیں
اس کو قتل کرے۔ سولی نہ دے۔ اور اس کو غسل دے کر نماز
بھی پڑھے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جس نے اس کے قتل کا حکم
دیا ہے وہ نماز نہ پڑھے اور لوگ پڑھیں۔ اور جس نے مال لوٹا
قتل نہیں کیا اس کے مخالف ہاتھ پیر کاٹے جائیں۔ دایاں ہاتھ تو
چوری کی سزا میں اور بایاں پیر علی الاعلان ارتکاب جرم کی سزا میں
اور جس نے صرف زخمی کیا ہے قتل و لوٹ کا مرتکب نہیں ہوا
تو اگر ایسا زخم ہے جس کا قصاص بدلہ ہوتا ہے تو قصاص لیا جائے

زخم بحیثیت وجوب قصاص کے دو طرح پر ہیں ایک وہ زخم جو
ناقابل عضو ہیں اور بدلہ لینا واجب ہے جیسے قتل - دوسرے
وہ زخم جن کا بدلہ صاحب حق طلب بھی کر سکتا ہے معاف بھی
کر سکتا ہے - اگر زخم اس نوعیت کا ہے کہ اس میں قصاص واجب
نہیں ہوتا تو دیتہ (بدلہ مالی) دی جائے گی بشرطیکہ صاحب حق کا
مطالبہ ہوا اور اگر وہ بخشدے معاف ہو جائے گی، اور جس نے
صرف ڈرایا، دھمکایا یا شریک ہو کر مفسدوں کی تعداد بڑھائی قتل و
لوٹ کا مرتکب نہیں ہوا نہ کسی کو زخمی کیا تو بطور تنبیہ و توبیخ
کے پیٹا جائے اور قید کرنا بھی جائز ہے کہ یہ بھی ایک طرح کی
تعزیر ہے مگر ہاتھ پیر کاٹنا یا قتل کرنا جائز نہیں اور امام ابوحنیفہؒ
کے نزدیک جائز ہے کیونکہ حکماً لوٹ مار کرنیوالوں کا شریک ہے
اگر گرفتار ہونے کے بعد توبہ کر لیں تو گناہ تو معاف ہو جائیں گے
مگر حقوق و جرائم کی سزا معاف نہ ہوگی اور گرفتار ہونے سے پہلے توبہ
کر لی تو گناہوں کے ساتھ حقوق اللہ (حدود) بھی معاف ہو جائیں
گے صرف حقوق العباد کا مواخذہ ہوگا - اگر قتل کا مجرم ہے تو ولی
مقتول کو اختیار ہوگا کہ قصاص لے یا معاف کر دے لہٰذا توبہ سے
یہ فائدہ ہوگا کہ قتل واجب و حتمی نہ رہے گا - اگر لوٹیرا ہے تو توبہ سے
قطع کی سزا ساقط ہو جائے گی مگر تاوان مال صرف معاف کرنے سے
ساقط ہوگا - شہر میں لوٹ مار کرنے والوں کا وہی حکم ہے جو جنگل
اور سفر کے لٹیروں کا ہے اگرچہ شہری ڈاکوؤں کا جرم بلحاظ دلیری
کے زیادہ سخت نہیں مگر سزا دونوں کی یکساں ہے - امام ابوحنیفہؒ

فرماتے ہیں کہ یہ حکم صحرائی ڈاکوؤں کے ساتھ خاص ہے کیونکہ جنگل میں مظلوموں کی اعانت نہیں ہو سکتی شہر یا اس کے قریب جہاں اعانت بہت جلد ممکن ہے ڈاکہ زنی کرنے والوں پر یہ حکم جاری نہ کیا جائے۔ اگر ڈاکو یہ کہیں کہ ہم گرفتار ہونے سے قبل توبہ کر چکے ہیں اور علامات سے اس کی تائید نہیں ہوتی تو ان کا دعویٰ باطل سمجھا جائے۔ اور واجب شدہ حدود جاری کی جائیں۔ اور اگر علامات و قرائن سے تائید ہوتی ہے مگر شہادت شرعی نہیں رکھتے تو اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ دعویٰ قبول کر لیا جائے اس لئے کہ شبہ سے حدود ساقط ہو جاتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ قبول نہ کیا جائے اس لئے کہ شہادت صحیحہ کا ہونا جس سے یہ ثابت ہو کہ گرفتاری سے قبل توبہ کر چکے ہیں ضروری ہے اور شبہ وہ معتبر ہے جو فعل کے ساتھ مقترن ہو نہ وہ جو فعل سے موخر ہو۔

قاضی اور منصف

عہدہ قضا پر اسی شخص کا تقرر جائز ہے جس میں اس کی تمام شرائط موجود ہوں تاکہ اس کو قاضی بنانا اور اس کا احکام نافذ کرنا صحیح ہو وہ شرطیں سات ہیں۔

(۱) یہ کہ مرد ہو، اس میں دو صفتیں ملحوظ ہیں بالغ ہونا اور مذکر ہونا اس لئے کہ نابالغ پر کوئی حکم واجب نہیں ہو سکتا اور نہ اپنے قول سے کوئی حکم اپنے اوپر واجب کر سکتا ہے چہ جائیکہ کسی دوسرے پر حکم کا نفاذ کر سکے۔ اور عورتوں کا مرتبہ حکومت کے مراتب سے کم ہے اگرچہ بعض احکام ان کے قول سے بھی متعلق ہیں۔ ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں جن امور میں ان کی شہادت درست ہے قضا بھی درست ہے اور جن میں شہادت درست نہیں۔ قضا بھی درست نہیں۔ ابن جریر اس مسئلہ میں بالکل متفرد ہیں وہ کہتے ہیں کہ تمام احکام میں عورت کی قضا جائز ہے مگر اجماع امت اور آیت قرآن کے ہوتے ہوئے ان کا قول ناقابل اعتبار ہے۔ ارشاد ہے۔

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض - ترجمہ
مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض پر توفیقت دی ہے
یعنی عقل و دانائی میں لہٰذا یہ جائز نہ ہوگا کہ عورتیں مردوں کی حاکم بنیں۔
(۲) شرط بالاجماع معتبر ہے وہ یہ ہے کہ محض اتنی عقل جس پر شرعی
تکلیف کا مدار ہے یعنی معلومات بدیہی سے واقف ہونا کافی نہیں
اس کے ساتھ ہوشیار ذکی الطبع اور سہو و غفلت سے محفوظ ہونا بھی
لابدی ہے تاکہ مشکل اور سخت معاملات کی گتھی سلجھا سکے۔
(۳) یہ کہ غلام نہ ہو اس لیئے کہ غلام خود اپنا بھی مختار نہیں ہے دوسروں
کا تو کس طرح حاکم ہو سکتا ہے۔ اور جب کہ غلامی کی وجہ سے شہادت
دینے کا اہل نہیں تو تنفیذ احکام اور تقرر عہدۂ قضا کا بدرجۂ اولیٰ
اہل نہ ہوگا یہی حکم مکاتب مدبر اور اس شخص کا ہے جس کا کچھ حصہ
غلام ہے کہ یہ سب مکمل آزادی سے محروم ہیں۔ البتہ جس طرح
غلام کا راوی روایت ہونا صحیح ہے اسی طرح مفتی بننا بھی صحیح
ہے اگر آزاد ہو جائے تو قاضی بھی ہو سکتا ہے اگرچہ آزاد
کنندہ کو حق ولایت حاصل ہے مگر یہ حق نسب کی طرح ہے جو حصول
حکومت میں غیر معتبر ہے۔
(۴) شرط اسلام ہے اس لئے کہ شہادت بھی اسی پر موقوف ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین
سبیلاً -
ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر کافروں کو کوئی اختیار نہیں دیا لہٰذا
کافر کا فیصلہ نہ مسلمانوں پر نافذ ہے نہ کافروں پر۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ کا اپنے ہم مذہبوں کا قاضی ہو سکتا ہے یہ صورت اگرچہ اس وجہ سے مروج ہے کہ اکثر سلاطین امام موصوف کے مقلد ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کافروں کو قاضی و حاکم بنادیا گیا بلکہ مہتر اور چودھری مقرر کیا جاتا ہے اس کے فیصلوں کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا اس کی قوم خود ہی اس کے احکام کی تعمیل کرتی ہے وہ خود ان کو اپنے اختیارات سے تعمیل پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر وہ لوگ اپنے مقدمات اس کی عدالت میں نہ لے جائیں تو مجبور نہ کئے جائیں بلکہ اسلامی حکم کا نفاذ رائج ہوگا۔

(۵) شرط عدالت ہے یہ ہر طرح کی حکومت میں اعتبار کی گئی ہے عدالت سے مراد یہ ہے کہ صادق القول، امین، پرہیزگار، شبہات سے محفوظ خوشنودی و خفگی میں (یکساں) قابل اطمینان اور اپنے ہم رتبہ لوگوں کی طرح مروت کو کام میں لانے والا ہو جس شخص میں یہ خوبیاں پائی جائیں گی وہ شہادت دینے کا اہل ہوگا اور یہی وہ صفات ہیں جن پر منصب حکومت پر فائز ہونا موقوف ہے اور جس میں کسی ایک صفت کی کمی ہوگی نہ اس کی شہادت معتبر ہوگی نہ حکم نافذ ہوگا۔

(۶) شرط قوت سامعہ اور باصرہ کی سلامتی تاکہ اثبات حقوق کی صحت، مدعی و مدعا علیہ میں فرق، اور اقرار و انکار کرنیوالوں میں امتیاز ممکن ہو اور حق و باطل پوری طرح کھل جائیں اور حق حقدار کو پہونچے لہٰذا اندھے کی حکومت باطل ہوگی۔ مگر امام مالکؒ شہادت کی طرح اس کی حکومت کو بھی جائز فرماتے ہیں اور بہرے کے متعلق بھی یہی اختلاف ہے۔ اور البتہ اعضاء کی سلامتی کو اگرچہ امامت میں دخل ہے

مگر منصف قضا میں کوئی دخل نہیں لہٰذا اپاہج قاضی ہو سکتا ہے مگر یہ
داب کے لئے یہی مناسب ہے کہ صحیح الاعضا توانا تندرست آدمی ہو۔

(۷) شرط یہ ہے کہ علوم شرعیہ کے اصول سے واقفیت تامہ اور فروع
میں اعلیٰ مہارت رکھتا ہو۔ اصول شرع چار ہیں پہلا کتاب اللہ کا
کا ایسا عالم ہو کہ تمام آیات ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، عام و خاص
مجمل و مفسر سے واقف ہو۔

(دوسرا) سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آپ کے تمام اقوال و افعال
اور ان کے طرق تواتر و احاد، صحت و فساد کا عالم ہو اور جانتا ہو کہ کون
حدیث سبب خاص سے متعلق ہے اور کون مطلق ہے۔

(تیسرا) یہ کہ ان کے مسائل سے واقف ہو جن علماء کے سلف کا اجماع
اور جن ان کا اختلاف ہو تاکہ اجماعی مسائل میں ان کی اتباع کرے
اور مختلف فیہ میں اجتہاد سے کام لے۔

(چوتھا) قیاس سے واقف ہونا۔ تاکہ ایسی جزائیات کے احکام جن سے
شریعت خاموش ہو۔ اصول منصوصہ اور مسائل اجماعیہ سے استنباط
کر سکے، غیر معمولی واقعات کے حکم معلوم ہو سکیں اور حق و باطل میں
امتیاز ممکن ہو پس اگرچہ اصول اربعہ بھی اس کے حیطۂ علم میں داخل
ہوں تو ارباب اجتہاد میں شامل ہو گا اس کو مفتی و قاضی بننا اور بنانا
دونوں جائز ہو گا اور اگر اصول اربعہ سے قطعاً نابلد ہے یا بعض کو نہیں
جانتا تو مرتبۂ اجتہاد سے ساقط ہے نہ اس کا افتا جائز ہے نہ تصنیف
منعقد مات۔ اگر قاضی مقرر کر دیا گیا خواہ صحیح فیصلے نافذ کرے یا غلط
بہر صورت اس کا تقرر باطل ہو گا۔ اور تمام احکام درست ہو لیں

غیر درست مرد ہوں گے اور تمام نقصانات کی ذمہ داری خود اس
پر اور تقرر کرنے والے پر عائد ہو گی۔ امام ابو حنیفہؒ غیر مجتہد کی قضا
کو جائز کہتے ہیں اس لئے کہ معاملات و مقدمات کو فتاویٰ حاصل کر کے
فیصل کر سکتا ہے۔ مگر جمہور فقہا اس کی حکومت باطل اور فیصلے رد
قرار دیتے ہیں (اور یہی صحیح ہے) اس لئے کہ تقلید کو شرعی مسائل میں
ضرورتاً اختیار کیا جاتا ہے لہٰذا التزام حق (خود پر حق لازم کرنے میں)
تو متحقق ہو گی مگر الزام حق (غیر پر لازم کرنے میں) متحقق نہ ہو گی جناب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا والی
(گورنر) بنا کر بھیجتے وقت امتحاناً دریافت فرمایا "کس قانون سے حکومت
کرو گے" عرض "کتاب اللہ سے" فرمایا "اگر اس میں نہ پاؤ" عرض کیا
"سنت رسول اللہ سے" فرمایا اگر اس میں نہ پاؤ عرض کیا "اپنی عقل سے اجتہاد
کروں گا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمام تعریفیں اس
خدا کے لئے ہیں جس نے اپنے رسول کے قاصد کو اس کی مرضیات کی
توفیق دی" اور جو شخص خبر واحد کو معتبر نہیں سمجھتا اس کی حکومت صحیح نہیں
کیونکہ وہ ایک ایسی اصل کا منکر ہے جس پر صحابہؓ کا اجماع ہو چکا ہے۔
اور اس سے اکثر مسائل مستنبط ہیں تو گویا وہی شخص حجیت اجماع کا
منکر ہے اور اس کے منصوص کا منکر ہے، لہٰذا کسی طرح حکومت کا اہل
نہ ہو گا اور منکرین قیاس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اس کا انکار کرتے
ہیں اور ظاہری تصوف پر عمل کرتے ہیں۔ اور جس کے متعلق نص
موجود نہیں اس اقوال سلف کو اختیار کرتے ہیں اجتہاد اور فکر و
اجتہاد کو قطعاً چھوڑ بیٹھے۔ ایسے لوگ چونکہ احکام کے طریقوں سے

قاصر ہیں اس لیئے ان کا عہدہ قضا پر تقرر جائز نہیں دوسری قسم
کے وہ لوگ ہیں جو قیاس کے منکر اور سیاق کلام اور مفہوم خطاب
کو دیکھ کر اہل ظاہر کی طرح اجتہاد کر لیتے ہیں ان لوگوں کے تقرر میں
اصحاب شافعی دو مختلف وجوہ بیان فرماتے ہیں پہلی یہ کہ مذکورہ بالا
سے یہ تقرر نا جائز ہے - دوسری یہ کہ اگرچہ یہ لوگ قیاس خفی سے
کرتے ہیں مگر واضح اور ظاہر معانی کو معتبر جانتے ہیں لہٰذا ان کا تقرر جائز
ہے تقرر قضا کی شرائط کے بعد جو بالتفصیل پڑھ چکے ہو یہ معلوم ہو
چاہیئے کہ یہ تقرر قضا کی شرائط کے بعد جو بالتفصیل پڑھ چکے ہو یہ معلوم
ہونا چاہئے کہ یہ تقرر اسی وقت جائز ہو گا جبکہ تمام و کمال شرائط کا اس
شخص میں ہونا پہلے سے معلوم ہو یا تفتیش و امتحان سے معلوم ہو جائے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو یمن کی قضا پر مامور فرمایا
اور ان کا کوئی امتحان لیا صرف طرز قضا کے متعلق بطور تنبیہ فرمایا۔
"جب مدعی و مدعا علیہ تمہارے سامنے حاضر ہوں تو جب تک دوسرے
کی بات نہ سن لو فیصلہ نہ کرو" حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے
کوئی مقدمہ دشوار معلوم نہ ہوا - اور حضرت معاذؓ کو یمن کے ایک حصہ
پر بھیجتے ہوئے آپ نے جانچ بھی فرمائی -

قاضی اور اس کے حدود کار

شافعی المذہب حنفی کو عہدۂ قضا پر مامور کر سکتا ہے اس لئے کہ
قاضی غیر معمولی واقعات میں اپنے امام کی تقلید نہیں کرتا بلکہ اپنے اجتہاد
سے فیصلے کرتا ہے - اسی طرح اگر شافعی ہو تو یہ ضرور نہیں کہ احکام
میں اپنے امام ہی کے اقوال پر احکام نافذ کرے اپنے اجتہاد

ہوے اگر اجتہاد سے ابوحنیفہؒ کی رائے صائب معلوم ہو تو اسی پر عمل کرے اور بعض فقہا اس کے خلاف ہیں ان کے نزدیک اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے امام کے مذہب پر عمل کرنا جائز نہیں۔ لہٰذا شافعی المذہب ابوحنیفہؒ کے مسلک پر اور حنفی شافعی المذہب کے مسلک پر اگر اجتہاد سے ان کی رائے صحیح معلوم ہو حکم نافذ نہیں کر سکتا اس لئے کہ احکام اور فیصلوں میں تہمت اور کسی ایک فریق کی جانب داری کا شائبہ ہے اور اگر صرف اپنے ہی مسلک پر حکم نافذ کرے گا تو احتمال نہیں ہوگا اور فریقین کے لئے فیصلے کو بخوشی تسلیم کرنا زیادہ ممکن ہوگا اگرچہ سیاست کا مقتضا یہی ہے کہ بعض فقہا کی رائے صحیح ہو مگر احکام شرعی میں تقلید ممنوع اور اجتہاد ضروری ہے۔

ایک مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے بعد کسی ایسے ہی دوسرے مقدمہ میں اگر اجتہاد سے پہلے حکم کے خلاف فیصلہ صادر کرے تو صحیح ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے ایک سال مشترکہ کے متعلق شریک کو قائم رکھ کر فیصلہ کیا اور ایک دوسرے سال تشریک کو چھوڑ دیا عرض کیا گیا "یہ کیا؟" پہلے تو آپ نے یہ فیصلہ کیا تھا" فرمایا" ہاں جب وہ فیصلہ صحیح تھا اور اب یہ فیصلہ صحیح ہے۔

اگر حنفی یا شافعی تقرر کے وقت قاضی پر یہ شرط لگائے کہ صرف مذہب شافعی یا مذہب حنفی پر فیصلے کرے تو اس کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ شرط عام احکام کے لئے ہو تو یہ شرط باطل ہے قاضی اس کا تقرر کرنے والے کا ہم مسلک ہو یا نہ ہو۔ اب اگر تقرر کرتے ہوئے اس کو بعنوان شرط نہ کہنا بلکہ بعنوان حکم یا ممانعت ذکر کرتا ہے کہ "میں نے تم کو قاضی

مقرر کیا، حنفی مذہب پر فیصلے مت کرو" یہ ممانعت کی صورت ہے تو
تقرر صحیح ہو گا اور شرط حکماً ہو ممانعتہً فاسد ہے اپنے اجتہاد کے مطابق
فیصلے کرے شرط کے مطابق ہو یا نہ ہو البتہ اگر تقرر کرنے والا دانستہ
ایسی ناجائز شرط لگاتا ہے تو وہ خود قابل اعتراض ہو گا اور اگر جہالت
سے لگاتا ہے تو یہ اعتراض تو نہ ہو گا مگر جہالت کی وجہ سے اس قابل نہ ہو گا
کہ قاضی کا تقرر کر سکے یا قاضی بنایا جا سکے۔

اور اگر تقرر کرتے ہوئے بعنوان شرط کہتا ہے کہ میں نے تم کو اس
اس شرط پر قاضی بنایا کہ شافعی مسلک پر یا حنفی مسلک پر فیصلہ کرو
تو شرط فاسد پر معلق ہونے کی وجہ سے تقرر ہی باطل ہو گا۔ علمائے
عراق کی رائے ہے کہ تقرر صحیح ہے اور شرط باطل ہے۔

دوسری قسم یہ کہ شرط کسی خاص حکم کے متعلق ہو اس کی بھی دو
صورتیں ہیں ایک بعنوان امر ہو جیسے قاضی سے کہے کہ غلام سے آزاد
کا مسلم سے کافر کا قصاص لو۔ اور جو قتل بغیر لوہے کے ہوا ہو اس کا بھی
قصاص لو" یہ حکم امر باطل ہو گا اور تقرر صحیح ہو گا۔ جیسا کہ مقتضائے
اجتہاد ہو حکم نافذ کرے اور اگر تقرر قضا کو اس پر معلق کر دیا تو تقرر
ہی فاسد ہو گا۔ اور بعنوان نہی ہو تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں ایک
یہ کہ اگر مسلمان نے کافر کو قتل کیا ہو یا آزاد نے غلام کو قتل کیا ہو
تو ان کے متعلق حکم اور فیصلہ صادر کرنے کی بالکل ممانعت کرے کہ
قصاص کے وجوب یا عدم وجوب کا کوئی فیصلہ نہ کرو، یہ جائز ہے اور
تقرر دوسرے مقدمات فیصل کرنے کی غرض سے ہو گا اور مخصوص مقدمات
اس کے اختیارات روکتا قصاص کے مقدمات فیصل کرنے سے روکنے

اس میں ہمارے علماء کا اختلاف ہے آیا اس کو روکنا چاہیے یا نہیں ایک
ول یہ ہے کہ یہ مقدمات اس کے اختیارات سے خارج ہوں گے لہٰذا
ن کے متعلق ہے قصاص یا عدم قصاص کا کوئی فیصلہ نہ کرے۔
دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے اس کے اختیارات محدود نہ ہونگے
اجتہاد کے مطابق ان مقدمات میں بھی فیصلے صادر کر سکتا ہے بشرطیکہ
فس تقرر اس ممانعت پر معلق نہ ہو (ورنہ تقرر ہی فاسد ہوگا)

قاضی کا تقرر تمام عہدوں کی طرح قضا کا تقرر بھی موجودگی میں
زبانی الفاظ سے اور غیبت میں خط و کتابت
سے ہوتا ہے مکاتیب کے ساتھ تقرر کرنے والے اور اس کے
ہلکاروں میں اس تقرر کے قرائن کا ہونا ضروری ہے عہدہ کا تقرر
طرح کے الفاظ سے ہوتا ہے صریح اور کنایۃ صریح چار ہیں میں نے تم کو

(۱) مقرر کیا۔
(۲) ولی کیا۔
(۳) خلیفہ کیا۔
(۴) نائب بنایا۔

تقرر کے لیے ان میں جو الفاظ استعمال کیا جائے قضا اور تمام
سے اس سے انعقاد پذیر ہو سکتے ہیں ان کے ساتھ شرط کے
ور کسی قرینہ کا ہونا ضروری نہیں البتہ بطور تاکید ہو سکتا ہے۔
لفاظ کنایۃ کو ہمارے بعض علماء کہتے ہیں کہ سات ہیں۔ میں نے تم پر

(۱) اعتماد کیا۔
(۲) بھروسہ کیا۔

(۳) تمہاری طرف لوٹا دیا۔
(۴) تمہاری طرف کر دیا۔
(۵) تمہیں تفویض کیا،
(۶) تمہاری وکالت میں دیا۔
(۷) تمہاری طرف منسوب کیا

چونکہ ان الفاظ میں دوسرے معنی کا احتمال ہے اور تقرر عہدہ میں صریح کے حکم سے کمزور ہیں۔

لہٰذا قرینہ کا ہونا ضروری ہے قرینہ کے ساتھ ملکر صریح کے حکم میں ہو جاتے ہیں مثلاً کنایہ کے بعد کہے" لہٰذا جو کام میں نے تمہاری وکالت میں دیا ہے اس کی خبر لو جس کام پر میں نے تم پر اعتماد کیا ہے اس میں احکام نافذ کرو، وغیرہ اور دونوں کے ملنے سے عہدہ کا انعقاد ہو جائے گا۔ لیکن تقرر کی تکمیل اس وقت ہوگی، جبکہ وہ شخص (جس کو قاضی بنایا جائے) یہ عہدہ منظور کر لے۔ اگر بالمشافہ گفتگو سے تقرر عمل میں آیا ہو تو قبول ومنظور فی الفور زبان سے ہونا معتبر ہے۔ اور اگر خط ومراسلت سے تقرر کیا گیا ہو تو دیر سے قبول کرنا بھی جائز ہے اور (بصورت ثانی) اور زبان سے بھی بدیر قبول کرنا جائز ہے آیا کام شروع کر دینے سے بھی قبول صحیح ہو جاتا ہے اس میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک جائز ہے۔ عمل کو گویائی کی مثل قرار دیتے ہیں اور بعض کے نزدیک جائز نہیں۔ زبان سے قبول کرنا ضروری ہے اس لئے کہ کام کا شروع کرنا تقرر کے مکمل ہونے کی فرع ہے لہٰذا کام سے قبول کا انعقاد نہیں ہو گا۔ نیز اس تقرر کی

تکمیل کے لئے مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ ان چار شرائط کا ہونا بھی ضروری ہے۔

(۱) شرط یہ ہے کہ تقرر کرنے والا اس شخص کو جس کا تقرر کرنا چاہتا ہے پہلے سے جانتا ہو کہ اس میں اس عہدے کی تمام شرائط موجود ہیں۔ ورنہ تقرر صحیح نہ ہوگا اگر تقرر عمل میں لانے کے بعد شرائط ہونا معلوم ہوا تو از سر نو تقرر کا انعقاد کیا جائے پہلے تقرر کو کافی نہ سمجھا جائے۔

(۲) شرط یہ ہے کہ تقرر کرنے کو اس عہدیدار کی بابت یہ علم ہو کہ جن صفات کی بدولت اس کو یہ عہدہ تفویض ہوا ہے ان کی وجہ سے وہ مرجع خلائق بھی بنا؟ اور اس نے اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے بھی انجام دیا؟ یا نہیں اس شرط کا تعلق انعقاد تقرر کے ساتھ نہیں جیسا کہ شرط اولی کا تھا بلکہ عہدہ کو قبول کرنے اور اس کے متعلقہ انتظامات کو انجام دینے کے جواز کے ساتھ ہے علم حاصل ہونے کے لئے مشاہدہ ضروری نہیں خبر کا مشہور ہونا ہی کافی ہے۔

(۳) یہ ہے کہ جس عہدہ پر مامور کیا جائے اس کو نام لیکر متعین کر دیا جائے جیسے قضا، امارت، تحصلداری۔ اس لئے کہ اوپر ذکر کی ہوئی شرائط کا تعلق ایسے تمام عہدوں کے ساتھ ہے لہٰذا معلوم ہونے کے لئے تعین ضروری ہے ورنہ تقرر فاسد ہوگا۔

(۴) شرط شہر کا تعین جس پر مامور کیا جائے ضروری ہے غیر متعین ہونے کی صورت میں تقرر صحیح نہ ہوگا۔ انعقاد اور تمام شرائط کے بعد

تقرر بالکل مکمل ہوجائے گا اب تقرر اور نفاذ احکام کے لئے کسی مزید شرط کی ضرورت نہیں البتہ اس کے احکام کو لازم اور تسلیم کرانے کے واسطے یہ شرط زائد ہوگی کہ اس کے اہل عملہ میں اس کے تقرر کا اعلان و اشاعت ہو جائے تاکہ سب اس کے احکام کی اطاعت کریں جب تقرر بحیثیت انعقاد اور بحیثیت لزوم صحیح ہو جائے جیسا کہ ہم نے بالتفصیل ذکر کیا ہے تو عہدہ دار کا عنان انتظام کو ہاتھ میں لینا اور اجرائے احکام کرنا صحیح ہو جائیگا۔

عہدہ دار کا تقرر کرنا وکالت کے مثل ہے۔ یعنی دونوں صورتوں میں اپنا نائب بنانا مقصود ہوتا ہے اس عہدہ پر مستقل تقرر کرنے والے پر واجب ہے نہ خود عہدہ دار پر ضروری ہے تقرر کرنے والا جب چاہے معزول کر سکتا ہے اسی طرح عہدہ دار جب چاہے سبکدوش ہو سکتا ہے مگر بہتر یہ ہے کہ بلا عذر معزول نہ کیا جائے اور نہ خود سبکدوش ہو کیونکہ عہدہ کے ساتھ عام مسلمانوں کے حقوق وابستہ ہوتے ہیں۔ علٰحدگی اور عزل کے بعد یہ ضروری ہے کہ تقرر کی طرح اس کا بھی اعلان کر دیا جائے تاکہ آئندہ کوئی حکم نافذ نہ کرے اور عام لوگ بھی اپنے مقدمات اس کے اجلاس میں پیش کرکے غلطی میں نہ پڑیں۔ اگر عزل سے واقف ہونے کے بعد احکام نافذ کیۓ تو نافذ نہ ہوں گے۔ اور بصورت ناواقفی بھی نافذ ہوں گے یا نہیں اس میں وہی اختلاف ہے جو وکیل کے معاملات میں ہے۔

قاضی کے اختیارات

قاضی کے اختیارات عام ہوں گے یا خاص۔ اگر عام ہیں تو دس احکام کو

مشتمل ہوں گے۔

(۱) تنازعات اور جھگڑوں کو فیصل کرنا اگر ما بہ النزاع امر جائز ہے تو، رضامندی وصلح کے ساتھ، اور اگر امر واجب ہے تو حکم قطعی کے ساتھ۔

(۲) جب کسی کا حق دوسرے کے اوپر اقرار یا شہادت سے ثابت ہو اور وہ دینے میں تاخیر کرتا ہو تو صاحب حق کو اس کا حق دلانا خود اپنے علم کی بنا پر فیصلہ کرنے میں اختلاف ہے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا صحیح قول تو یہ ہے کہ جائز ہے اور ان کا (شافعی) دوسرا قول ہے کہ ناجائز ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ زمانۂ قضا سے پہلے علم کی بنا پر فیصلہ جائز نہیں زمانۂ حکومت میں جس واقعہ کی اصلیت سے واقف ہو اپنے علم کی بنا پر اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

(۳) جنون اور بچپن کی وجہ سے جن کے تصرفات روک دیئے جائیں ان کے مالوں پر نگراں مقرر کرنا دوالیہ اور بے وقوف کے معاملات پر حجر (رکاوٹ) قائم کرنا تاکہ مستحقین کا مال محفوظ رہے اور اس کی عقود سے احکام صحیح ہو سکیں۔

(۴) اوقاف کی نگرانی یعنی اصل جائداد کی حفاظت منافع کی ترقی، ان کی وصولی اور ان کے مصارف میں خرچ کرنا۔ اگر اوقاف کا کوئی جائز متولی موجود ہو تو اس کی نگرانی رکھنا ورنہ خود متولی بنا اس لئے کہ ولایت عام خاص نہیں ہو سکتی۔ مگر ولایت خاص عام ہو سکتی ہے۔

(۵) وصیتوں کا نفاذ ان کی شرائط کے مطابق بشرطیکہ جائز امور کے متعلق ہوں ممنوعات شرعیہ کے لئے نہ ہوں اگر وصیت معین لوگوں کے حق میں ہو تو نفاذ کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کا قبضہ کرائے ۔ اور اگر موصوف بصفات کے حق میں ہو تو اپنے اجتہاد سے ان کو متعین کرکے ان کا قبضہ کرادے ۔ قبضہ کے بعد وہ لوگ مالک ہو جائیں گے ۔ اگر وصیت کنندہ نے وصی مقرر کر دیا ہے تو اس کی نگرانی کرے ورنہ خود ہی انجام دے ۔

(۶) بیوہ عورتوں کے ولی نہ ہوں اور ان کے رشتے آتے ہوں تو ہم کفو لوگوں میں ان کا نکاح کرانا ۔ امام ابوحنیفہؒ یہ حکم قاضی سے متعلق نہیں ۔ فرماتے ہیں ان کے نزدیک بیوہ خود اپنا نکاح کر سکتی ہے ۔

(۷) جو لوگ حدود (سزاؤں) کے مستوجب ہیں ان پر ان کا جاری کرنا اگر حقوق اللہ سے متعلق ہیں تو اقرار یا شہادت سے ثابت ہونے کے بعد ، بلا کسی مطالبہ کرنے والے کے خود ہی قائم کر دے ۔ اگر حقوق العباد سے متعلق ہیں تو مستحق کے طلب کرنے پر قائم کرے اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ دونوں کو کسی مدعی کے مطالبہ کرنے پر قائم کر سکتا ہے ۔

(۸) حلقۂ حکومت کے مصالح کا لحاظ رکھے کسی شخص کو راستوں میں کوئی عمارت وغیرہ نہ بنانے دے بلا استحقاق بنائے ہوئے سائبان اور عمارت منہدم کرا دے یہ انتظام بھی بلا مطالبہ

مدعی خود ہی کر سکتا ہے ۔ ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مستغیث کے دعوے کئے بدوں نہیں کر سکتا ۔ مگر چونکہ یہ انتظام حقوق اللہ میں داخل ہے اس لئے اس میں مستغیث و غیر مستغیث برابر ہیں لہٰذا خود ہی اس کا لحاظ رکھے ۔

(۹) اپنے امین اور شاہدوں کی جانچ پڑتال کرتا رہے نیک چلن خوش انتظام ماتحتوں کو ان کے عہدہ پر برقرار رکھے ۔ بدچلن، خائنوں کے بجائے بہتر لائق آدمیوں کا تقرر کرے یا قابل ہوشیار کو ساتھ لگا دے تاکہ ملکر اچھا انتظام کریں ۔

(۱۰) تصفیہ مقدمات میں زور آور، کمزور اور شریف، غیر شریف میں کوئی فرق نہ رکھے اور نہ اپنے نفس کا تابع ہو کر حق دار کی حق تلفی اور غیر حقدار کی جانبداری کرے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔

یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوی فیضلک عن سبیل اللہ ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب ۔

ترجمہ :۔ اے داؤد ہم نے تمہیں زمین کی خلافت دی ہے لہٰذا حق و انصاف کے ساتھ لوگوں میں فیصلے کرو اور اپنی خواہش نفسانی کا اتباع نہ کرو ورنہ اللہ کے راستے سے بھٹک جاؤ گے ۔ جو اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹکتے ہیں ان کو شدید عذاب ہوگا ۔ کیونکہ انھوں نے محاسبہ کے دن فراموش کر دیا ۔

حضرت عمرؓ اپنے عہد خلافت میں ابوموسیٰ اشعری کو شرائط قضا اس کے آئین لکھتے ہوئے فرماتے ہیں :۔ ما بعد قضا ایک

زبردست فرض اور قابل عمل سنت ہے مقدمات اوران کی
سفارشات سامنے ہوں تو عقل وانصاف سے کام لو جس حق بات
کا نفاذ ر نہ ہو اس کی زبان سے نکلنا بے سود ہے ملاقات،
انصاف اور ہمنشینی میں مساوات کا خیال رکھو کوئی تمہارے
ظلم سے فائدہ نہ اٹھائے اور نہ کمزور آدمی تمہارے عدل سے
مایوس ہو۔ مدعی کے ذمے شہادت شرعی ہے اور مدعا علیہ پر
قسم ہے۔ دو مسلمانوں میں صلح کرانا جائز ہے۔ بشرطیکہ اس صلح
سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام نہ کیا جائے۔ اپنا سابق فیصلہ
آئندہ بطور نظیر کے استعمال کرنا ضروری نہ سمجھو، اگر غور وتدبر
کے بعد حق کی طرف مراجعت کرنا، باطل پر اڑے رہنے سے کہیں
بہتر ہے۔ اگر کسی امر کے متعلق قرآن وحدیث سے فیصلہ معلوم
نہ ہو اور قلب پریشان ہو تو عقل صرف عقل سے کام لے کر
نظائر وامثال پر قیاس کرو۔ اگر مدعی کہتا ہے مدعا علیہ یا شہادت
حاضر نہیں ہے تو اس کے لئے مدت معین کردے اگر شہادت
پیش کردے۔ تو اس کا حق دلا دے ورنہ اس کے خلاف فیصلہ
صادر کردے شک وشبہ سے بچنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے
مسلمان، مسلمان کے خلاف شاہد ہو سکتا ہے باستثناء اس کے
جس پر حد کے کوڑے لگے ہوں یا جھوٹی شہادت کا سزا یافتہ یا جس
کا نسب یا ولایت مجہول ہو فان اللّٰہ عفا عن الایمان ودرءھا
بالبینات مقدمات کے تصفیہ میں گھبراہٹ، پریشانی، ملال کو
پاس نہ آنے دو۔ حق حقدار کو پہنچانے کا اللّٰہ تعالیٰ اجر جزیل عطا فرمائے گا

اگر یہ شبہ ہو کہ اس فرمان میں دو کوتاہیاں ہیں ایک یہ کہ اس میں لفظ تقلید جس عہدہ کا تقرر ہوتا ہے نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ اس میں شاہدوں کی ظاہری صفائی کو کافی قرار دیا ہے حالانکہ تحقیق و تجسّس کے بعد باطنی صفائی کا ثابت ہونا ضروری ہے سو اس کے متعلق عرض ہے کہ لفظ تقلید کے نہ ہونے کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ تقلید و تقرر اس فرمان سے پہلے عمل میں آچکا ہے اور اس میں صرف خاص احکام نہ ہدایات کا تذکرہ کیا ہے۔

دوسرا یہ کہ اس فرمان میں بعض الفاظ ایسے موجود ہیں جن سے تقلید و تقرر ہوتا ہے۔ مثلاً "مقدمات اور ان کی سفارشات سامنے ہوں تو عقل و انصاف سے کام لو" اور اگر مدعی شہادت شرعی پیش کرے اس کا حق دلا دو ورنہ اس کے خلاف فیصلہ کر دو" امر کے یہ صیغے اور قرائن حالیہ الفاظ تقلید و تقرر کے استعمال سے مستغنی کر رہے ہیں اور شاہدوں کی صرف ظاہری صفائی کو کافی قرار دینے کے بھی دو جواب ہیں۔

(۱) یہ کہ حضرت عمرؓ اللہ کے نزدیک یہی کافی ہوگا اس لئے اپنی رائے کے مطابق لکھا ہے۔

(۲) یہ کہ ان کی مراد یہ ہے کہ تحقیق و تفتیش کے بعد اگر عیب ظاہر نہ ہو تو عدول ہوں گے اور ایک دوسرے کے خلاف شہادت دے سکیں گے جن کو حد تازیانہ لگ چکی ہے وہ کسی حالت میں ایسا نہ ہوگا۔

قاضی کو اگرچہ اختیارات عامہ رکھتا مالگزاری وصول کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس کا تعلق صرف افسران فوج سے ہے۔ اور صدقات کا اگر کوئی افسر مقرر ہو تو وہ بھی قاضی کے اختیارات سے خارج ہوں گے

ورنہ بعض کی رائے تو یہ ہے کہ قاضی کو اس کی وصولی اور بامحل خرچ کرنے کا حق ہو گا کیونکہ یہ حقوق اللہ میں سے ہے اور بعض کے نزدیک اب بھی قاضی کو دخل دینے کا حق نہیں ہے اس لئے کہ مالیات امر کی رائے اور اجتہاد سے متعلق ہیں یہی اختلاف جمعہ وعیدین کی امامت میں ہے۔ اور اگر قاضی کے اختیارات محدود ہیں تو صرف اپنے اختیارات محدود ہی کے استعمال کرنے کا مجاز ہو گا۔ مثلاً قضا کے جو احکام ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں ان میں سے کوئی ایک حکم تفویض کیا گیا ہو، یا یہ کہ مدعا علیہ اقرار کرے تو فیصلہ کرے اور شہادت شرعی پر نہ کرے دین کے مقدمات لے اور نکاح کے نہ لے معین شدہ نصاب کے مقدمات لے اور غیر معین کے نہ لے۔ بہرحال محدود اختیار قاضی اپنے اختیارات سے تجاوز نہ کرے۔ گویا قاضی نائب ہوتا ہے۔ وکالت کی طرح عام وخاص دونوں طرح اس کا تقرر بھی صحیح ہے۔

اختیاراتِ عامہ

کسی خاص شہر یا خاص مجمع پر اختیارات عامہ کے ساتھ قاضی کا تقرر کرنا جائز ہے اور وہ اسی خاص مفوضہ علاقے پر اپنے احکام نافذ کرنے کا مجاز ہو گا۔ وہاں کے باشندے اور مسافروں کے انتظامات اور تصفیہ مقدمات انجام دینے ہوں گے۔ اگر اس کے اختیارات صرف باشندگان علاقہ کے مقدمات تک محدود کر دیئے جائیں تو پھر مسافروں سے تعرض کرنے کا اس کو حق نہ ہو گا اگرچہ تقرر تو پورے شہر پر کیا گیا ہے مگر یہ تخصیص کر دی گئی کہ شہر کے ایک حصے یا ایک محلے یا ایک خاص مکان کے مقدمات لے تو یہ تخصیص قابل اعتبار ہو گی۔ اور تمام شہر کے مقدمات فیصل کر سکے گا اس لئے کہ تقرر

کے عام ہوتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ اختیارات اس کے بیٹھنے کی جگہ
یا کسی مکان کے اندر منحصر کر دیئے جائیں اگر تخصیص بعنوان شرط ذکر کی
گئی ہو تو تقرر ہی باطل ہوگا۔ اور کسی جگہ کے مقدمات لینے کا مجاز نہ ہوگا
اگر صرف ان لوگوں کے امور فیصل کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے جو
اس کے مکان یا اس کی مسجد میں وارد ہوں تو یہ تقرر بھی صحیح ہے مکان اور
مسجد کے علاوہ کسی جگہ کے معاملات سے تعرض کرنا جائز نہ ہوگا اور
ان لوگوں کے معین ہونے کی یہی صورت ہوگی کہ وہ اس کے مکان یا
مسجد کے ساتھ مشروط ہوگا۔

ابو عبداللہ زبیری فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں بصرہ میں کچھ عرصہ
تک امیروں نے اس قسم کے قاضی مقرر کئے تھے ایسے قاضی کو قاضی
المسجد کہتے تھے جو دو سو درہم یا بیس دینار کے اندر اپنے احکام نافذ
اور تنخواہیں مقرر کر سکتا تھا اسے مقام معین اور نصاب مقررہ سے
تجاوز کرنے کا حق نہ ہوتا تھا۔

ایک شہر میں دو قاضی ایک شہر میں دو قاضیوں کے تقرر کی تین صورتیں
ہو سکتی ہیں۔

(۱) یہ کہ دونوں کو شہر کا جدا جدا حصّہ تفویض کیا جائے یہ صورت صحیح
ہے ہر ایک اپنے اپنے متعلقہ حصّے میں انتظام کرنے کا مجاز ہوگا۔
(۲) یہ کہ ایک کو مقدمات دیون کے لئے اور دوسرے کو مقدمات
نکاح کے لئے مقرر کیا جائے یہ بھی جائز ہے ہر ایک قاضی پورے
شہر کے اپنے متعلقہ مقدمات لینے کا مجاز ہوگا۔
(۳) یہ ہے کہ دونوں کو پورے شہر کی قضا تمام مقدمات طے کرنے کے

لیے تفویض کی جائے اس کے جواز میں ہمارے علما کا اختلاف ہے ایک جماعت
کے نزدیک یہ صورت ناجائز ہے کیونکہ مقدمات لیجانے میں مدعی اور
مدعا علیہ کا نزاع اور جھگڑا ہوگا۔ ایک کہیں دوسرا کہیں لیجانا چاہے گا
لہٰذا اگر دونوں کا تقرر بیک وقت ہوا ہو تو دونوں کی قضا باطل ہوگی اور
مقدم و موخر ہوا ہو تو موخر کی قضا باطل ہوگی۔ اور دوسری بڑی جماعت
اس کو جائز کہتی ہے کیونکہ قاضی وکیل کی طرح نائب بنایا جاتا ہے فریقین
(مدعی و مدعا علیہ) مختلف الرائے ہوں تو جو قاضی اپنے قریب تر ہو اسی کے
پاس مقدمہ لیجائیں اور دونوں کا فاصلہ برابر ہو تو بعض کے نزدیک
قرعہ اندازی کرلی جائے اور بعض کے نزدیک جبتک متفق الرائے نہ ہوں
کسی کے پاس مقدمہ نہیں لے جاسکتے۔

خاص مقدمہ کے لیے قاضی کا تقرر

فریقین کے معین مقدمے کو فیصل کرنے کے لئے بھی قاضی کا تقرر یہ معین مقدمہ فریقین میں چلتا رہے گا اس وقت تک
اس کی حکومت باقی رہے گی اور فیصلہ کرنے کے بعد حکومت زائل ہوجائیگی
پھر اگر ان فریقین میں کوئی دوسرا مقدمہ چلے تو اس کا تصفیہ جدید علالت
کے بغیر نہیں کرسکتا۔

فریقین کے مقدمہ کے بجائے اگر دن مقرر کردے اور یوں
کہے کہ میں تمہیں شنبہ کے لئے قاضی مقرر کرتا ہوں تو شنبہ کو ہر قسم کے
مقدمات لے سکتا ہے اور غروب شمس کے ساتھ یہ تقرر ختم ہوجائے گا
اگر یوں کہا کہ تمہیں ہر شنبے کے دن کا قاضی مقرر کیا تو شنبہ گذرنے پر حکومت
زائل نہ ہوگی۔ آئندہ ہر شنبہ کو عدالت قائم کرنے کا مجاز ہوگا اور شنبہ کے

سوا دوسرے دنوں میں حکومت کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اگر کسی شخص کو معیّن
کے بغیر یوں کہا جو شخص شنبہ کے دن مقدمات فیصل کرے وہ میرا نائب
ہے تو شخص کے مجہول ہونے کی وجہ سے یہ تقرر باطل ہوگا۔ نیز اس میں
اندیشہ ہے کہ غیر مجتہد حکومت کرنے لگے۔ اگر یہ کہا کہ جو اہل اجتہاد شنبہ کے
دن حکومت کرے وہ میرا خلیفہ ہے تو مجہول ہونے کی وجہ سے یہ بھی صحیح
نہ ہوگا۔ اور لازم آتا ہے کہ مجتہد کا انتخاب امام کے سوا فریقین مقدمہ
کی رائے پر منحصر ہو جائے۔ اگر یہ کہا کہ جو شافعی مدرس یا حنفی مفتی شنبہ کو
حکومت کرے گا وہ میرا خلیفہ ہے یہ بھی جائز نہیں اگر چند کا نام لے کر کہا کہ
فلاں شنبہ کو حکومت کرے تو میرا خلیفہ ہے تو خواہ چند قلیل ہوں یا کثیر تقرر
جائز نہ ہوگا اس میں بھی عدم تعین رہتا ہے البتہ اگر تردید کے طور پر یہ کہا کہ
شنبہ کی حکومت فلاں اور فلاں میں دائر کرتا ہوں تو یہ صورت جائز ہوگی
اور ان میں سے جو شخص کام شروع کردے وہ مقرر ہو جائے گا اور بقیہ
استحقاق باطل ہو جائے گا کیونکہ تقرر ایک شخص کا مقصود ہے سب کو
جمع کرنا مقصود نہیں اگر جمع کرنا ہوتا تو عدد کثیر ہونے کی صورت میں
ناجائز ہوتا اور قلیل ہونے کی صورت میں جواز اور عدم جواز دونوں
قول ہیں جیسا کہ دو قاضیوں کے تقرر میں علماء کا اختلاف سابقاً مذکور
ہو چکا ہے۔

عہدۂ قضا کی خواہش اور طلب

عہدۂ قضا کی خواہش اور اس کی تحریک
غیر مجتہد کی طرف سے ناجائز ہے
طلب نے اس کو غیر معتبر بھی کر دیا۔ اور اہل اجتہاد اور عہدہ کے قابل
کی طرف سے ہونے کی صورت میں تین حالتیں ہیں۔

(۱) کوئی ناقص العلم یا کھلم کھلا ظلم کرنے والا حکومت کر رہا ہے اس کو علیحدہ کرنے کی غرض سے قضا کا طالب ہوتا ہے تو چونکہ اس کی نیت امر منکر کا ازالہ ہے اس لئے یہ طلب جائز ہے۔ پھر اگر نیت کا غلبہ ازالہ منکر ہے تو مستحق اجر ہوگا اور اگر حصول حکومت ہے تو امر مباح ہے۔

(۲) لائق اور قابل شخص عہدہ قضا پر مامور ہے اس کو عداوت یا ذاتی منفعت کی غرض سے معزول کرانا چاہتا ہے تو طلب ممنوع ہوگی اور خود طالب مجروح اور غیر مستحق ہو جائیگا۔

(۳) عہدہ قضا خالی ہے پس اگر اس خیال سے طلب کرتا ہے کہ بیت المال سے تنخواہ ملے گی اور میری ضروریات پوری ہوں گی تو مباح ہے اور اگر حفاظت حقوق کی نیت سے طلب کرتا ہے تاکہ مبادا کوئی نااہل اور نالائق مقرر نہ ہو جائے تو مستحب ہے اور اگر عزت و منزلت کے لئے طلب کرتا ہے تو اس کے جواز میں اتفاق ہے مگر کراہت میں اختلاف ہے بعض علماء مکروہ کہتے ہیں کیونکہ دنیا کی وجاہت و عزت کا طلب کرنا مکروہ ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علواً في الارض ولا فساداً والعاقبة للمتقين ۔

ترجمہ :۔ یہ آخرت کا گھر ہے ہم ان لوگوں کو عطا کریں گے جن کی غرض دنیوی مراتب اور فساد نہ ہو۔ اور بہتر انجام پرہیزگاروں کے لئے ہے۔

اور بعض یہ کہتے ہیں کہ مکروہ نہیں ہے اس لئے کہ طلب وجاہت امر مباح غیر مکروہ ہے پیغمبر خدا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعون سے

حکومت وخلافت کی خواہش کی اور کہا لا اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم)
ترجمہ :۔ مجھے دفینوں پر مقرر کر دو میں محافظ باخبر ہوں ۔

آپ نے استحقاق کی علت بھی ذکر فرمائی کہ میں حفیظ وعلیم ہوں اس میں دو تاویلیں ہیں ایک یہ کہ محافظ ہوں جو کچھ سپرد کر دگے باخبر ہوں طریقہ حکومت سے جو مجھے دو گے یہ قول عبدالرحمٰن بن زید کا ہے دوسری یہ کہ محافظ ہوں حساب کا باخبر ہوں اور واقف ہوں زبانوں سے یہ قول اسحٰق بن سفیان کا ہے چونکہ یہ قول بطور سبب اور علت استحقاق کے ذکر کیا گیا ہے لہٰذا اس کو اپنی صفائی اور خود سرائی پر محمول نہیں کیا جا سکتا ۔

یہاں ایک اختلافی مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ظالم کی طرف سے ولایت کا قبول کرنا جائز ہے یا نہیں بعض کہتے ہیں کہ اگر حق پر عمل ہو سکے تو جائز ہے یوسف علیہ السلام نے اسی لئے قبول فرمایا تھا کہ اپنے عدل سے اس کے ظلم کی مکافات فرما دیں اور بعض کہتے ہیں کہ اس میں ظالم کی اعانت ہے اور اس کے احکام کی پیروی کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ظالم حق پر ہے لہٰذا قبول کرنا جائز نہیں اور یوسف علیہ السلام کا تقرر جو فرعون کی طرف سے عمل میں آیا اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یوسف علیہ السلام کا فرعون صالح تھا اور سرکش حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون تھا۔
دوسرا جواب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام صرف اس کی املاک کے نگران تھے حاکم نہ تھے ۔

عہدۂ قضا کی تحصیل کے لئے روپیہ وغیرہ خرچ کرنا قطعاً ناجائز ہے رشوت ہے جو شرعاً حرام ہے دینے والا اور لینے والا دونوں مجروح

ہو جاتے ہیں ثابت انس سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راشی مرتشی اور رائش پر لعنت بھیجی ہے راشی رشوت دینے والا مرتشی رشوت لینے والا رائش جو دونوں میں واسطہ ہے۔

قاضی ہدیہ نہیں لے سکتا قاضی کو فریق مقدمہ سے یا اپنے عملے والے سے ہدیہ لینا جائز نہیں کیونکہ عملے والا بھی اپنی کسی غرض کے لئے دیتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ حکام کے تحفے ان کی گردن کے بمنزلہ طوق ہیں اگر قبول کرنے کے بعد فوراً ان کی مکافات کر دیں تو الگ ہو جائیں گے اور اگر فوراً مکافات نہ کریں اور دینے والے کو واپس دینا بھی دشوار ہو جائے تو بیت المال میں داخل کر دیئے جائیں کیونکہ قاضی کے مقابلہ میں بیت المال ان تحائف کا زیادہ مستحق ہے تصفیہ مقدمات کو بلا عذر تعویق میں ڈالنا قاضی کے لئے جائز نہیں ایسے ہی اوقات عدالت کے علاوہ اپنے دروازہ پر حاجب (دربان) کا مقرر کرنا جائز نہیں اپنے والدین یا اولاد کے حق میں محل تہمت ہونے کی وجہ سے فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہاں ان کے خلاف فیصلہ کر سکتا ہے کیونکہ بدگمانی کا احتمال نہیں اسی طرح ان کے حق میں شہادت نہیں دے سکتا۔ مگر خلاف شہادت دے سکتا ہے اپنے دشمن کے موافق شہادت دے سکتا ہے خلاف نہیں دے سکتا اور اس کے موافق فیصلہ کر سکتا ہے مگر خلاف نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ حکم کے اسباب اگرچہ ظاہر ہیں مگر شہادت کے اسباب مخفی ہیں لہٰذا شہادت کی بدگمانی حکم کی طرف متوجہ ہو جائیگی۔ اگر کسی امام کے انتقال سے اس کے قاضی معزول نہ ہوں گے۔

شہر میں قاضی نہ ہو اور اہل شہر کسی کو قاضی مقرر کرلیں تو اگر امام وقت موجود ہو تو یہ تقرر باطل ہے اگر موجود نہ ہو تو تقرر صحیح ہے اس کے احکام نافذ ہوں گے اس کے بعد اگر کوئی امام جدید مقرر ہو جائے تو اس کی قضا بلا اذن امام آئندہ کے لئے باقی نہ رہے گی البتہ اس سے پہلے کے فیصلے بحالہ نافذ رہیں گے۔

فوجداری

حکومت فوجداری سے مراد یہ ہے کہ آپس میں تعدی اور ظلم کرنے کرنے والے ہر دو فریق کو جبراً عدالت میں پیش کر کے انصاف کرایا جائے اگر انکار کریں تو ڈرا دھمکا کر کام کیا جائے پس ضروری ہے کہ اس منصب کا حاکم نہایت عالیشان، نافذالحکومت، بارعب، باعفت اور بے طمع آدمی ہو اس کو پولیس کے دبدبے اور قاضیوں کے وقار کی ضرورت ہے لہٰذا ان محکموں کے حکام کی صفات بھی اس میں موجود ہوں تاکہ ہر طرح سے اپنے احکام کو نافذ کرنے پر قادر ہو۔

اگر باب خلافت سے اختیارات عامّہ کا منصب نہیں رکھتا تو بیشک اس کے لئے مستقل تقرر کی ضرورت ہو گی۔ بشرطیکہ مبشتر ذکی ہوئی شرائط اس میں موجود ہوں لہٰذا اس شخص کا تقرر صحیح ہو گا۔ جس کو ولی عہدی یا وزارت تفویض اور عمارت علاقہ کے لئے منتخب کرنا درست ہو یہ اس وقت جبکہ اس کو تمام مقدمات فوجداری کے اختیارات دینے مقصود ہوں

اور اگر اختیارات محدود دیئے جائیں کہ جن مقدمات کو قاضی فیصل نہ کر سکیں اور ان کی قدرت سے خارج ہوں صرف انھیں کی سماعت کرے تو اس کا اوپر ذکر کی ہوئی عظمت و شان والا ہونا ضروری نہیں کسی قدر کم رتبہ والا بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ حق کے مقابلہ میں لومت لائم سے خائف اور حرص و طمع سے مغلوب اور راشی نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فوجداری کے مقدمہ کو طے فرمایا تھا۔ زبیر بن العوام اور ایک انصاری میں زمین کو سیراب کرنے کے متعلق جھگڑا ہوا وہ خود اس کو لے کے آئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زبیر پہلے تم سیراب کر دو پھر انصاری نے کہا "یا رسول اللہ" بیشک وہ آپ کی پھوپی کا بیٹا ہے"۔ آپ کو یہ بات ناگوار گذری غصہ آگیا اور فرمایا یا زبیر اجرہ علیٰ بطنہ حتیٰ یبلغ الماء الی الکعبین یعنی زبیر پانی آنے دینا یہاں تک کہ ٹخنوں تک چڑھ جائے اجرہ علیٰ بطنہ اس کی عبارت کی وجہ سے آپ نے تادیبًا فرمایا۔ اس میں اختلاف ہے کہ آپ نے ٹخنوں تک جاری رکھنے کا کیوں حکم دیا؟ اس میں دو قول ہیں یا تو حضور (صلعم) نے فریقین کے حق کو بطور حکم کے بیان فرمایا، یا زجر و توبیخ کے لئے ایسا حکم دیا خلفاء اربعہ کو اس محکمہ کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ قرن اول میں تدین اور انصاف پسندی کا غلبہ تھا وعظ و نصیحت سن کر لوگ مظالم سے باز رہتے تھے معمولی اور مشتبہ امور میں کبھی کبھی نزاع ہو جاتا جن کا قاضی تصفیہ کر دیتا تھا۔ اکھڑ مزاج اعرابی سے اگر کبھی کوئی زیادتی ہوتی تو وہ وعظ اور سرزنش سے متاثر ہو جاتا تھا ان حضرات کے زمانہ میں صرف حق کے تعین کیلئے حاکم کی ضرورت ہوتی تھی اور اس کے متعین ہونے کے بعد

لوگ خود حق کی طرف جھک جاتے تھے۔

لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہ، کو آخیر عہد حکومت میں جبکہ لوگوں کا اختلا
بڑھ گیا اور بے انصافیاں ہونے لگیں اس قسم کے مقدمات کا تصفیہ
اور اس کی چھان بین کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی سب سے پہلے آپ
ہی نے اس طریقہ کو اختیار فرمایا اگرچہ زیادہ ضرورت نہ ہونے کی وجہ
آپ نے مستقل طور پر ایسے مقدمات کے لئے وقت معین نہیں فرمایا
تھا وقال فی المنبریۃ صار ثمنہا تسعًا اور قارصہ، قامصہ اور واقو
زخمیوں میں آپ نے ثلث ثلث دیت کا فیصلہ فرمایا - ایک بچے کی دو عورتیں
دعویدار ہوئیں آپ نے حکم قضا کے موافق فیصلہ کر دیا۔

آپ کے بعد حالت بدل گئی ظلم و تعدی غضب و تغلب کا بازار
گرم ہو گیا وعظ و نصیحت غیر مؤثر ہو گئے ضرورت ہوئی کہ تغلب سے
روکا جائے مغلوب و مظلوم کی دادرسی سلطنت کے زور و احکام قضا کے
ساتھ کی جائے سب سے پہلے عبدالملک بن مروان نے جور و تعدی کے
واقعات کی تفتیش کرنے کے لئے ایک دن مقرر کیا تھا قابل تصفیہ مقد
اپنے قاضی ابو ادریس اودی کے حوالہ کر دیتا تھا چونکہ خلیفہ واقعات و
اسباب سے باخبر ہوتا اس کے خوف سے قاضی ابو ادریس کے احکام و
فیصلے فوراً نافذ ہو جاتے مگر قاضی بحیثیت کارکن ہوتا اور حکم خلیفہ کا ہوتا تھا

اس کے بعد حکام اور رؤسا بھی ستم شعاری کرنے لگے نہایت
قوی اور بارعب فرماں روا کے بدون کام چلنا دشوار ہو گیا چنانچہ
حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے جور و
تعدی کے فیصلے خود کرنے شروع کئے مقتضائے انصاف کے

مطابق ہر شخص کا حق دلایا بنو امیہ کی ناانصافیوں کی تلافی کی اور ان پر اس قدر سختی اور شدت کی کہ ان میں سے بعض لوگوں نے کہا آپ واپس نہ دلائیں ورنہ آپ کی جان کی خیر نہیں ہے آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن کے سوا اگر میں کسی دن سے بچنا چاہوں یا ڈروں تو خدا کرے نہ بچ سکوں۔

اکثر خلفاء عباسیہ بھی اس کا اہتمام کرتے رہے سب سے پہلے مہدی اور پھر ہارون رشید پھر مامون اور سب کے بعد مہتدی دادرسی کے لئے بیٹھا کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام املاک حقداراور مستحقین کے پاس پہنچ گئیں۔

مجلس عدالت جو شخص فوجداری مقدمات کے لئے تیار ہو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اگر کوئی دن مقرر کرے جس میں دادخواہ حاضر ہوا کریں تاکہ بقیہ دنوں میں اپنے فرض منصبی، انتظام وغیرہ کا کام کر سکے اور اگر مستقل طور پر فوجداری کا حاکم بنا یا گیا ہے تو دن مقرر کرنے کی ضرورت نہیں تمام دنوں میں یہی کام انجام دے لیکن اپنے دروازے پر ایسے پہرے قائم نہ کرے کہ لوگوں کا پہنچنا دشوار ہو اور نہ دوست احباب کی ملاقاتوں میں مصروف رہے فوجداری کی عدالت میں پانچ قسم کے لوگوں کا ہونا اشد ضروری ہے اس کے بدون اس کی مجلس عدالت ہرگز مکمل نہ ہوگی۔

ایک تو پولیس میں موجود ہو تاکہ زور آور، قوی مجرم کو حاضر عدالت کیا جا سکے اور جری و گستاخ کا مزاج درست ہو سکے۔

قاضی اور حکام ہوں تاکہ ان کے نزدیک ثابت شدہ حقوق

اور فریقین مقدمہ کے جو واقعات ان کی عدالتوں میں پیش ہوچکے ہیں معلوم ہوسکیں۔

(۳) فقہار تاکہ مشکل اور مشتبہ مسائل میں ان کی طرف رجوع کیا جائے اور وہ ان کو حل کریں۔

(۴) منشی جو فریقین کے بیانات اور ان کے موافق یا مخالف فیصلے کیا کریں۔

(۵) گواہ جو حقوق واجبہ اور فیصل شدہ احکام کے شاہد بنائے جائیں جب عدالت فوجداری میں پانچویں قسم کے لوگ موجود ہوجائیں تو کارروائی شروع کرے اس عدالت کے ساتھ دس قسم کے مقدمات کا تعلق ہے۔

تفتیش و تحقیق

(۱) رعایا حکام کی تعدی و ظلم و تشدد کا ناجائز ... کہ اس پر بآسانی واقفیت نہیں ہوتی لہذا ان کے حالات کی مکمل تفتیش کرے منصف اور قابل ہوں تو ترقی دے ظالم ناانصاف ہوں تو ظلم سے روکے یا موقوف کرے کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے عہد خلافت میں سب سے پہلا خطبہ دیا تو یہ فرمایا میں تم کو پرہیزگاری اور اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ کے ہاں صرف تقویٰ قبول ہوگا اور متقی ہی پر رحم کیا جائے گا حکام کی ایک جماعت نے بہت زیادہ ظلم و تعدی اور حق تلفی کی ہے لوگوں نے اپنے حقوق ان سے خریدے ہیں اور فدیے دے کر ان کو باطل سے روکا ہے۔ خدا کی قسم اگر مردہ سنت کے زندہ کرنے اور باطل طریقے کو مٹانے کیلئے

لجے دامنگیر نہ ہو تو میں ایک آن بھی زندہ رہنا گوارہ نہ کرتا۔ لوگو! اپنی
ٰخرت کو درست کرو تمہاری دنیا بھی درست ہو جائے گی۔ ان اھرءً
لیس بیلنہ وبین آدم الا الموت المعساق لہ فی الموت۔

ترجمہ:۔ بیشک ہر آدمی اور آدم کے درمیان صرف موت کا فرق ہے اور
موت اس کا یقینی راستہ ہے۔

(۲) قسم تحصیلداروں کا وصولی محاصل میں زیادتی کرنا اس کے متعلق شاہان | **والی محاصل میں زیادتی**

سلف کے منصفانہ قوانین ان کی کتابوں میں دیکھے اور ان کے موافق
روں کو محصولات ادا کرنے اور تحصیلداروں کو وصول کرنے کی تاکید
رے اگر زیادہ وصول کر کے بیت المال میں داخل کر دیا ہے تو
سی کا حکم دے اگر خود رکھ لیا تو ان سے لے کر مالکوں کے حوالے
ئے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز مہدی فصل مقدمات کے لئے بیٹھے
سور کے واقعات پیش کئے گئے انھوں نے پوچھا یہ کیا ہے سلیمان
راہب نے کہا کہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہل سواد اور اطراف
ق و عرب کے باشندوں پر چاندی اور سونے کا خراج مقرر کیا تھا
و دینار قیصر و کسریٰ کے وزن پر مضروب تھے، اور یہی سکے شمار
لوگ خراج ادا کرتے تھے سکوں کے وزن کی کمی و بیشی کا خیال
یا جاتا تھا مگر بعد کو لوگوں نے کیا کہ طبریہ جس کا وزن چار دانق تھا
ے اور دانی جس کا وزن مثقال کے برابر تھا نہ دیتے۔ جب
م عراق ہوئے تو انھوں نے دانی کا مطالبہ کیا اور کسور کی جو
ں اس کے ادا کرنے پر مجبور کیا بنوامیہ کے اعمال اس کی وصولی

میں ظلم و تشدد کرنے لگے۔ عبدالملک بن مروان تخت نشین ہوئے تو انھوں نے وزنوں کا معائنہ کر کے درہم کا وزن ساڑھے پانچ مثقال اور دینار کا وزن بحال رکھا ان کے بعد حجاج نے پھر کسور کا مطالبہ کرنا شروع کیا عمر بن عبدالعزیز نے پھر ساقط کر دیا ان کے بعد والے پھر لینے لگے بالآخر منصور کے عہد میں جب سواد تباہ ہو گیا تو اس نے گیہوں اور جو (جن کی پیداوار وہاں زیادہ ہے) کے خراج میں چاندی وغیرہ لینا موقوف کر کے تقسیم کرنے کا حکم نافذ کیا ان کے علاوہ غلوں اور کھجور اور دوسرے درختوں کا خراج بھی جاری رکھا اور یہ خراج اسی طرح کسور کے ساتھ اب تک جاری ہے مہتدی نے کہا معاذاللہ جو چیز پہلے یا بعد میں لوگوں سے ظلماً وصول کی جاتی ہو میں اس کو کیسے لازم قرار دے سکتا ہوں اس کو ساقط کر دو اور لوگوں سے مت لو حسن ابن مخلد نے کہا اگر اس کو ساقط کیا گیا تو شاہی خزانہ کو بارہ لاکھ درہم سالانہ کا نقصان ہوگا مہتدی نے کہا کہ میرا کام یہ ہے کہ حق کو قائم رکھوں اور ظلم کو دور کر دوں چاہے خزانہ میں کمی واقع ہوا کرے۔

رجسٹروں میں ردّ و بدل (۳۱) قسم رجسٹروں میں داخل یا خارج کرنے والے منشی یہ لوگ عام مسلمانوں کی جائدادوں کے امین ہوتے ہیں ان کی کارروائیوں کی نگرانی رکھے اگر داخل خارج کرنے میں کوئی خلاف حق کمی بیشی ہو تو اس کو درست اور باقاعدہ کرا دے اور ایسا کرنے والوں کو سزا دے کہتے ہیں کہ منصور کو اطلاع ملی کہ چند منشیوں نے رجسٹروں میں تغیر و تبدل کیا ہے ان کو حاضر کرنے کا حکم دیا اور سزا دلوائی۔

مذکورہ بالا تین قسموں میں مستغیث کا حاضر ہونا ضروری نہیں خود حاکم کو نگرانی اور اصلاح کرنی چاہیئے۔

تقسیم تنخواہ میں تعدّی

(۴) قسم تنخواہیں تقسیم کرنے والوں کی تعدی شلاً کم دینا دیر سے دینا اور لوگوں کو دق کرنا لہٰذا تنخواہوں کے رجسٹر کا معائنہ کرکے اس کے مطابق تنخواہیں جاری کرے جس قدر تنخواہیں کم کردی گئی ہوں یا بالکل نہ دی گئی ہوں اگر حکام بالا نے دبالی ہوں تو ان سے لیکر ورنہ بیت المال سے مستحقین کو دے۔ ایک فوجی افسر نے ماموں کی خدمت میں لکھا کہ فوجی سپاہی آپس میں لڑتے اور ادھر اُدھر لوٹ مار کرتے پھرتے ہیں مامون نے جواب لکھا کہ اگر تم انصاف کرتے اور تنخواہیں پوری پوری تقسیم کرتے تو نہ آپس میں لڑتے اور نہ لوٹ مار کرتے۔ افسر کو معزول کردیا اور سپاہیوں کی تنخواہیں باقاعدہ جاری کرادیں۔

اموال منصوبہ

(۵) قسم اموال منصوبہ کی واپسی۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) وہ اموال جن کو ظالم بادشاہوں نے اپنی رغبت سے یا لوگوں پر تعدی کرنے کے لئے چھین لئے ہوں اگر حاکم کو خود ایسے اموال کا حال معلوم ہو تو ان کی واپسی کا حکم دیدے اور اگر معلوم نہ ہو تو مستغیث کے استغاثہ دائر کرنے پر واپسی موقوف ہوگی۔ استغاثہ کے بعد سلطنت کے رجسٹروں کو دیکھنا کافی ہے اگر ان میں مالک سے لینے کا تذکرہ موجود ہو تو واپسی کا حکم دے سکتا ہے۔ بینہ (شہادت) طلب کرنے کی ضرورت نہیں رجسٹروں میں مل جانا کافی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نماز پڑھنے کے لئے باہر تشریف لائے ایک شخص نے جو یمن سے آیا تھا استغاثہ کیا اور یہ شعر پڑھا:

تدعون حیران مظلوماً ببابکم — فقد آتاک بعید الدار مظلوم

ترجمہ:- امیر المومنین آپ پریشان مظلوم کو اپنے دروازہ بلاتے ہیں یہ بیچارہ دور سے آیا ہوا مظلوم آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

آپ نے پوچھا آپ پر کیا زیادتی ہوئی ہے اس نے عرض کیا حضور عبداللہ ولید بن عبدالملک نے میری زمین دبالی تھی۔ آپ نے مزاحم کو حکم دیا صوافی کا رجسٹر حاضر کرو اس کو دیکھا تو یہ لکھا تھا کہ ولید بن عبدالملک نے فلاں شخص کی زمین اپنے لئے منتخب کی ہے آپ نے حکم دیا کہ اس کو کاٹ کر لکھ دو کہ اصل مالک کو واپس دی گئی اور اس کو دو چند خرچہ دیا جائے۔

(۲) وہ اموال جن کو قوت و شوکت والے رئیس لوگوں سے غصب کر کے زبردستی مالک بن بیٹھیں ایسے اموال کی واپسی استغاثہ دائر کرنے پر موقوف ہے اور واپسی کی چار صورتیں ہیں یا تو غاصب خود معترف ہو یا حاکم ذاتی علم رکھتا ہو اس صورت میں اپنے علم کی بنا پر غاصب کے خلاف فیصلہ کر سکتا ہے یا شہادت اس مضمون کی گذرے کہ غاصب نے غصب کیا ہے یا اس مضمون کی کہ مغصوب منہ مالک ہے یا بلا شک و شبہ عام شہرت سے معلوم ہو کہ وہ شخص اس کا مالک ہے کیونکہ گواہوں کی شہادت جبکہ عام شہرت سے ہو سکتی ہے تو عام شہرت کا فیصلہ بدرجۂ اولیٰ درست ہوگا۔

اوقات کی نگرانی

(۶) اوقات کی نگرانی - دو قسم کی ہوتی ہے عام و خاص - عام اوقات کی نگرانی واصلاح حاکم کو خود ہی کرنی چاہیئے کسی مستغیث کا ہونا ضروری نہیں علم ہو جانے کے بعد صحیح مصارف میں واقف کی شرائط کے مطابق خرچ کرے -
علم کی تین صورتیں ہیں یا تو ان حکام کے رجسٹروں سے پتہ چلے جن کو حکام کی نگرانی اور حفاظت کے لئے تعینات کیا گیا ہے یا سرکاری رجسٹروں سے اس کے متعلق کوئی معاملہ یا تذکرہ اور نام و نشان معلوم ہو یا قدیم کتابوں سے جن کی صحت کو قلب تسلیم کرتا ہو معلوم ہو ان ہر سہ صورت پر اعتماد کافی ہے کسی شاہد کا ہونا ضروری نہیں اس لئے کہ ایسے وقف کا خاص شخص مستغیث نہیں ہوتا لہٰذا اس کا حکم اوقاف کی بہ نسبت کسی قدر نرم ہونا چاہیئے -

اور خاص اوقاف کا انتظام اسی وقت کرے جبکہ کوئی خاص نزاع کے بعد دعویدار ہو، کیونکہ اس کا تعلق خاص افراد سے ہوتا ہے جب ان میں اپنے اپنے حقوق کے متعلق جھگڑا ہو اور مقدمہ دائر کریں تو حاکم کو مناسب کارروائی کرنی چاہیئے اس میں شہادت شرعیہ کا ہونا ضروری ہے اگر شہادت نہ ہو تو دوادیں سرکاری یا قدیم کتب پر اعتماد ناجائز نہیں -

تنقید احکام

(۷) قسم محکمہ قضا کے ان حکام و فیصلوں کی تنقید جن کو وہ اپنی کمزوری یا محکوم الیہ کی قوت یا اس جلیل القدر اور عظیم الشان ہونے کی وجہ سے نافذ کرنے سے قاصر ہو محکمہ فوجداری نہایت قوی اور با اثر ہوتا ہے اس لئے اس کا

فرض ہے کہ ان فیصلوں کے مطابق ایسے لوگوں کے ہاتھوں سے چیزیں نکلوانے اور قرض وغیرہ ادا کرنے پر مجبور کرے۔

محکمۂ احتساب (۸) قسم محکمۂ احتساب اگر اپنے متعلقہ فرائض (مثلاً مشروع افعال کے کھلم کھلا ہونے کو روکنا، رستوں میں ظلم و تعدی نہ ہونے دینا، کسی کا حق ضائع نہ ہونے دینا) کی انجام دہی سے عاجز ہو تو اس کی اعانت کرے، لوگوں سے تمام حقوق اللہ کے متعلق مواخذہ کرے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرے۔

عبادات ظاہرہ (۹) قسم جمعہ یا عیدین، حج اور جہاد وغیرہ عبادات ظاہرہ اور ان کی شرائط میں کوتاہی نہ کرنے دے اس لئے کہ فرائض اور حقوق خداوندی کی ادائی اور بجا آوری سب سے مقدم ہے۔

حدود سے تجاوز (۱۰) قسم فریقین مقدمہ اور ان کے فیصلے کے متعلق زیادہ غور اور توجہ سے کام لے مقتضائے حق کے خلاف نہ کرے کیونکہ وہ قاضی اور حکام کے فیصلوں کے موافق فیصلہ کرنے کا مجاز ہے بعض اوقات حاکم فوجداری مقدمہ واضح نہ ہونے کی وجہ سے جائز حدود سے تجاوز کر جاتا ہے ایسا کرنا ہرگز درست نہیں۔ عدالت قضا اور عدالت فوجداری میں دس امور مابہ الامتیاز ہیں۔

(۱) فریقین کے نزاع مٹاتے، تصفیہ پر مجبور کرنے ظالموں کو تکبر کرنے اور دوسروں کا مال چھیننے سے باز رکھنے کے لئے ضرورت

کہ ناظرین مظالم باہیبت قوی اور دبدبہ والا ہو، اور قاضی کا ایسا ضروری نہیں۔

(۲) ناظر مظالم کا تعلق امور واجبہ سے گذر کر جائز امور کو بھی مشتمل ہے لہٰذا وہ قول وعمل دونوں کے اعتبار سے وسیع الاختیارات ہو گا۔

(۳) ڈرا کر اور قرائن وشواہد حالیہ سے کام لے کر تفتیش وتحقیق واقعات اور حق وباطل میں امتیاز کر سکتا ہے برخلاف اس کے دوسرے حکام ایسا نہیں کر سکتے۔

(۴) جس شخص کا ظلم وتعدی کرنا معلوم ہو اس کی تادیب واصلاح کر سکتا ہے۔

(۵) مقدمہ کی بابت زیادہ تحقیق وتنقیح کی ضرورت ہو اور امید ہو کہ غور وفکر سے حالات واسباب اصلیت کے ساتھ آشکارا ہو جائیں گے تو ناظر مظالم تصفیہ میں تاخیر کر سکتا ہے اور دوسرے حکام اگر کوئی فریق مقدمہ بعجلت فیصلہ کا طالب ہو تو تاخیر کرنے کے مجاز نہیں۔

(۶) ناظر مظالم مناسب سمجھے تو فریقین کو مصالحت پر مجبور کر سکتا ہے تاکہ آپس میں رضامندی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں لیکن قاضی دونوں کی رضامندی بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔

(۷) اگر فریقین انصاف واعتراف حقوق پر آمادہ نہ ہوں تو پولیس کی حراست میں دے کر مقدمہ کی نوعیت ضمانت کے قابل ہو تو ضمانت پر رہا کر دے تاکہ رد حقوق اور ایک دوسرے کی تکذیب

سے باز آکر انصاف کو قبول کریں۔

(۸) جو لوگ مجہول الحال اور عدالت قضا کے نزدیک ناقابل شہادت ہوں ناظر مظالم ان کی شہادت سن سکتا ہے۔

(۹) شاہدوں کے بیان مشکوک و مشتبہ معلوم ہوں تو ان سے حلف لے سکتا ہے۔ نیز ازالۂ شک کے لئے شاہدوں کی تعداد بھی بڑھا سکتا ہے مگر دوسرے حکام ایسا نہیں کر سکتے۔

(۱۰) فریقین کی نزاع کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے ابتداءً شاہدوں کے بیانات سن سکتا ہے اور برخلاف اس کے قاضیوں کا طریق یہ ہے کہ مدعی سے گواہ طلب کرتے ہیں اور مدعی کے کہنے پر ان کے بیانات لیتے ہیں غرضیکہ ناظر مظالم اور حاکم قضا میں نزاع اور مخاصمت کے مقدمات میں ان دس وجوہ سے فرق ہوتا ہے اور اس کے علاوہ اور تمام امور میں دونوں مساوی ہیں خدا نے چاہا تو آئندہ تفصیل سے ان دونوں کا امتیاز اور زیادہ منکشف ہو جائے گا۔

مرافعہ اب یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ مرافعہ کے وقت دعویٰ کی تین حالتیں ہو سکتی ہیں یا تو اس کے ساتھ اس کے مؤید امور ہیں یا اس کو ضعیف کرنے والے یا دونوں نہیں۔ مؤید ہونے کی صورت میں چھ حالتیں ہوتی ہیں جن سے دعویٰ کی تقویت تدریجی طور پر مختلف ہوتی ہے۔

(پہلی) دعویٰ کے ساتھ ایک دستاویز ہو جس میں گواہان موجودہ کی شہادت ثبت ہو ایسے دعویٰ ناظر مظالم کو دو امر کا اختیار ہے۔

(۱) گواہوں کو طلب کر کے شہادت لے۔
(۲) منکر کے انکار کو اس کی حالت اور قرائن کے مطابق ناقابل تسلیم قرار دے۔ گواہ حاضر ہو حاضر ہو جائیں تو اگر ناظر مظالم ذی رتبہ خلیفہ یا وزیر تفویض یا صوبہ دار ہے تو فریقین کے حالات کو دیکھ کر بمقتضائے سیاست اگر دونوں عالی رتبہ ہوں تو خود فیصلہ کرے متوسط طبقہ کے ہوں تو قاضی کے سپرد کرے ادنیٰ طبقے کے ہوں نیچے کی عدالت کے حوالے کرے۔

خلیفہ مامون کی لادرسی خلیفہ مامون اتوار کے دن مظالم کا تصفیہ کیا کرتے تھے ایک روز فارغ ہو کر اٹھے تو ایک پریشان حال عورت نے آکر عرض کیا۔ (بحر بسیط)

یا خیر منتصف یہدی له الرشد — ویا اماماً به قد اشرق البلد
تشکو الیک عمید الملک ارملة — عدی علیها فما تقوی به اسد
فابتز منها ضیاعاً بعد منعتها — لما تفرق عنها الاهل والولد

ترجمہ:۔ اے سب سے بہتر انصاف پرور جس کے لئے ہدایت شمع راہ ہے اے امام جس نے دنیا کو منور کر دیا ایک عاجز درماندہ عورت تیرے دربار میں عمید الملک کی شکایت کرنے آئی ہے عمید الملک نے ایسا بڑا ظلم کیا ہے کہ شیر بھی متحمل نہ ہو سکے جو زمینیں میرے شوہر اور بیٹے کی زندگی میں محفوظ تھیں ان کے مرنے کے بعد اس نے مجھ سے چھین لیا۔ مامون نے ذرا سوچ کر کہا (بحر بسیط)

من دون ما قلت عیل الصبر والجلد — واقرح القلب هذا الحزن والکمد
هذا اوان صلوة الظهر فانصرفی — واحضر الخصم فی الیوم الذی اعد
المجلس السبت ان یقض الجلوس لنا — انصفک منه والا المجلس الاحد

ترجمہ :۔ اے مظلوم عورت تیری فریاد سے صبر وتحمل جاتا رہا اور تیرے رنج والم نے میرا دل زخمی کر دیا ممکن ہوا شنبہ کو ورنہ یکشنبہ کو تیرا انصاف کروں گا

عورت چلی گئی اور اتوار کے دن سب سے پہلے حاضر ہوئی مامون نے پوچھا تیرا خصم (مدعالیہ) کون ہے عورت نے کہا کہ امیر المومنین کا بیٹا عباس جو حضور کے قریب کھڑا ہے مامون نے اپنے قاضی یحییٰ ابن اکثم کو اور بعض کہتے ہیں اپنے وزیر احمد بن ابی خالد کو حکم دیا کہ عباس کو عورت کے ساتھ بٹھا کر دونوں کے بیانات لو دونوں کو بٹھا کر بیانات لینے شروع کئے تو عورت زیادہ بلند آواز سے بولنے لگی۔ ایک سپاہی نے اس کو دھمکایا تو مامون نے کہا "کچھ نہ کہو اس کو حق بلوا رہا ہے اور اس کو باطل نے گونگا کر دیا ہے" اور زمینوں کی واپسی کا حکم دیدیا مقدمہ کی کارروائی مامون کی موجودگی میں ہوئی مگر بمقتضائے سیاست دو وجہ سے خود نہیں کی ایک یہ کہ فیصلہ کے فرزند کے موافق اور مخالف ہونے کے دونوں احتمال ہیں مخالف تو کر سکتا ہے موافق کرنا جائز نہیں۔

دوسری یہ کہ مدعی عورت ہے اور مامون کی شان ایسی نہیں کہ اس سے باتیں کرے اور بیٹے کی عظمت بھی ایسی نہ تھی کہ کوئی دوسرا اس کے خلاف فیصلہ کر سکے۔ اس لئے مامون نے کارروائی اپنی موجودگی میں دوسرے کے ذریعے سے کرائی تاکہ وہ شخص عورت کے دعویٰ اور دلیل کو رضامت سے اور تنفیذ حکم اور الزام حق کا کام بجالائے دوسری حالت جس سے دعویٰ کو تقویت پہنچے یہ ہے کہ دستاویز کے معتبر گواہوں میں کوئی موجود نہ ہو لہٰذا ایسے دعوے کی کارروائی میں چار امور کارآمد ہوں گے۔

(۱) مدعا علیہ کو ڈراناتا کہ بعجلت حق کا اعتراف کرے اور گواہی کی ضرورت
نہ رہے۔

(۲) اگر گواہوں کو مضرت اور مشقت کا اندیشہ نہ ہو اور اس کا مقام معلوم
ہو تو حاضر کرائے۔

(۳) مدعی علیہ کو زیرِ حراست رکھے اور علامات و قرائن مقدمہ کی تفتیش
کرے۔

(۴) اگر دعویٰ قرض وغیرہ کے متعلق ہے تو کوئی ضامن طلب کرے
اور اگر زمین و جائداد کے متعلق ہے تو اس کو نگرانی میں لے لے غلہ و
آمدنی کسی امین کے پاس محفوظ کر دے تاکہ جو حقدار ثابت ہو اس کو
دی جائے پس اگر زیادہ عرصہ گزر جائے اور گواہوں کی حاضری سے
مایوسی ہو تو والی مظالم اس کا مجاز ہے کہ مدعا علیہ سے پھر دھمکا کر پوچھے
کہ یہ شئے تمہاری ملکیت میں کیونکر آئی؟ اگرچہ امام ابوحنیفہ اور امام
شافعیؒ سببِ ملکیت کے دریافت کرنے کو جائز نہیں فرماتے مگر امام
مالکؒ جائز فرماتے ہیں۔ نیز پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ والی مظالم کا دائرہ
اختیارات واجبات سے گذر کر امورِ جائزہ کو بھی مشتمل ہے لہٰذا اگر کوئی ایسا
جواب دے جس سے تنازع رفع ہو جائے تو فبہا ورنہ جیسا شرعی مقتضا
ہو فیصلہ صادر کر دے۔ تیسری حالت جس سے دعوے کو تقویت پہنچے
یہ ہے کہ دستاویز کے شاہد موجود ہوں مگر حاکم کے نزدیک غیر معتبر
ہوں۔ اس صورت میں گواہوں کو طلب کر کے ان کی تفتیش کرے جو
حال سے خالی نہ ہوں گے یا تو ذی رتبہ پرہیزگار لوگ ہوں گے تو ان
کی شہادت یقیناً قابل اعتبار ہے یا رذیل ہوں گے تو ان کی شہادت

تو قوی نہ ہوگی مگر مدعا علیہ کو ڈرانے میں کار آمد ہوں گے یا متوسط درجے
کے ہوں گے تو تفتیش کے بعد اگر چاہے ان سے قبل شہادت یا بعد
شہادت حلف بھی لے سکتا ہے ۔ مؤخر الذکر دونوں قسم کے لوگوں
کی شہادت سننے کے تین طریقے ہیں ۔

(آ) شہادت خود ہی سن کر فیصلہ صادر کرے ۔

(۲) شہادت کی سماعت قاضی کے حوالے کردے اور تصفیہ اپنے
اوپر موقوف رکھے کیونکہ قاضی اسی وقت تصفیہ کر سکتا ہے
جبکہ شرعی طور پر اس کے نزدیک شاہدوں کی عدالت (صفائی)
ثابت ہو جائے ۔

(۳) شہادت کی سماعت معتبر گواہوں کے سپرد کردے اگر محض نقل
شہادت سپرد کی تو ان کے ذمے ان گواہوں کے حالات کی تفتیش ضروری
نہیں اور اگر یہ کہا کہ ان میں سے جس کی شہادت تمہارے نزدیک
درست ہو نقل کرو تو حالات کی تفتیش کریں تاکہ درست شہادت
پیش کر سکیں اور اس کے مطابق حکم کا نفاذ ہو ۔

تقویت دعویٰ | چوتھی حالت تقویت دعوے کی یہ ہے کہ دستاویز
کے شاہد معتبر لوگ ہیں مگر زندہ نہیں اور ان
کی تحریر بھی قابل اعتماد ہے تو اس وقت تین صورتیں ہیں ۔

(۱) مدعا علیہ کو ڈرایا اور دھمکایا جائے تاکہ سچ بولے اور حق کا
اعتراف کرے ۔

(۲) پوچھا جائے کہ تو کس طرح اس کا مالک ہوا ہے ممکن ہے اس سے
حق بات معلوم ہو جائے ۔

(۴) مملوکہ شے کے قریب رہنے والے اور فریقین کے پڑوسیوں سے
حالات معلوم کیے جائیں کیا عجب ہے ان سے حق حقدار کا معلوم
ہوجائے اگر یہ تینوں صورتیں ممکن نہ ہوں تو فریقین کا مقدمہ ایک
ایسے شخص کے حوالے کردے جو ذی وجاہت ہو، فریقین اس کی بات
مانتے ہوں اور وہ ان کی حالت اور مقدمہ کی کیفیت سے واقف ہو
تاکہ بار بار تحقیقات کرنے اور طویل مدت گذرنے کی وجہ سے دونوں
مجبور ہوکر سچ سچ بیان دینے اور مصالحت کرنے پر آمادہ ہوجائیں
اگر تصفیہ کرلیں تو بہتر ورنہ قانون قضا کے مطابق فیصلہ سنادے۔
پانچویں صورت تقوت دعویٰ کی یہ ہے کہ مدعی کے پاس مدعاعلیہ
کا رقعہ موجود ہو اور اس سے دعوی کا ثبوت ہو، تو ناظر مظالم کو چاہیئے
کہ مدعاعلیہ سے اس تحریر کی بابت یہ دریافت کرے کہ کیا یہ تمہاری
تحریر ہے؟ اگر اس کا اعتراف کرلے تو پوچھے اس میں جو کچھ لکھا ہے
اس کی صحت تمہیں تسلیم ہے؟ اگر تسلیم کرلے تو یہ اقرار ہے پس اقرار
کے مطابق حکم سنادے اور اگر صحیح تسلیم نہیں کرتا تو اس صورت میں
بعض حکام فوجداری نے خط کے اعتراف کرنے پر اس کے خلاف
فیصلہ صادر کردیا ہے اور رسماً علامات حقوق میں یہ شمار کیا ہے۔
اور محققین نیز تمام فقہا کی رائے ہے کہ محض تحریر کے اعتراف پر
بغیر اعتراف مضمون فیصلہ صادر کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ محکمۂ فوجداری
کے لیے ممنوعات شرعیہ مباح نہیں ہوتے۔ لہٰذا ناظر مظالم کو چاہیئے
مضمون تحریر کے متعلق اس کا بیان سنے اگر وہ یہ کہے کہ میں نے یہ
تحریر اس سے قرض لینے کے واسطے لکھی تھی مگر اس نے مجھے قرض نہیں

دیا یا اس کے ذمے میں ایک شے کی قیمت باقی تھی اس کے طلب کرنے کے لئے میں نے یہ واقعہ لکھا تھا مگر اس نے ادا نہیں کی تو چونکہ لوگ کبھی کبھی ایسا کرتے ہیں لہٰذا اس وقت ناظر مظالم تہدید اور سختی سے کام لے کر صحیح حالات یا علامات معلوم کرنے کی سعی کرے اگر معلوم ہو جائیں تو مناسب ہے ورنہ قاضی دونوں سے قسم لے کر فیصلہ کر دے۔

تحریر کا مقابلہ اگر سرے سے خط ہی کا منکر ہے تو بعض کے نزدیک اس کی بلا تصنع تحریرات سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے اگر خط ملتا ہے تو اس کے خلاف فیصلہ کر دے یہ قول ان لوگوں کا ہے جن کے نزدیک محض اعتراف تحریر پر حکم ہو سکتا ہے۔ اور محققین کے نزدیک مقابلۂ خطوط حکم لگانے کے لئے نہیں بلکہ ملزم کو خوف زدہ کرنے کے لئے کیا جاتا ہے اب اگر تحریر سے منکر تھا تو مقابلہ کرنے سے شبہ کمزور نہ ہوگا اور معترف تھا تو اس کی بہ نسبت شبہ قوی ہوگا۔

اور اگر تحریر میں منافات ہو تو مدعی کو تہدید کی جائے اور دونوں کو ایسے لوگوں کے حوالے کیا جائے جو مصالحت کرا دیں۔ ہو جائے تو خیر ورنہ قاضی قسمیں لے کر فیصلہ کر دے۔

بہی کھاتہ چھٹی حالت جو تقویت دعوے کا سبب ہوتی ہے اور معاملات میں کام آتی ہے یہ ہے کہ دعوے کے متعلق حساب کی بہی پیش کی جائے یا تو مدعی پیش کرے یا مدعا علیہ اگر مدعی پیش کرے تو اس میں شبہ کم ہوگا اس کو غور سے دیکھا جائے

ر ترتیب مختل ہے تو غیر معتبر ہے اور جعلی ہونے کا احتمال ہے دعویٰ
بجائے قوی ہونے کے ضعیف ہو جائے گا۔ اور اگر نقل و ترتیب صحیح و
باضابطہ ہے تو قابل اعتماد ہے مدعا علیہ کو شواہد کے موافق تہدید
کی جائے اور مصالحت پر آمادہ کیا جائے نہ مانیں تو قطعی حکم سنا دیا
جائے اگر مدعا علیہ پیش کرے تو اس دعوے کو تقویت ہو گی۔ مدعا علیہ
سے پوچھا جائے کیا یہ تمہارا خط ہے اگر اعتراف کرے تو پوچھا جائے
نہیں معلوم ہے یہ کیا ہے؟ اگر اقرار کرے تو پوچھا جائے اس کو
صحیح سمجھتے ہو اس کو بھی تسلیم کر لے تو ان تینوں باتوں سے لازم آئے گا
کہ مضمون حساب کا مقر ہے لہٰذا جو کچھ اس میں تحریر ہوا اس پر مجبور
کیا جائے اگر اپنے خط ہونے کا اس کا اعتراف ہے مگر اس کے علم اور
اس کی صحت سے انکار ہے تو جن علماء کے نزدیک تحریر پر حکم درست
ہے بہی کے حساب کے مطابق فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ اگرچہ صحت سے
انکار ہی ہو بلکہ اس کو عام مرسلہ خطوط سے زیادہ معتبر قرار دیتے ہیں
کیونکہ آمدنی کی بہی میں غیر وصول شدہ نہیں لکھا جاتا مگر محققین کی رائے
ہے اور یہی فقہا کا قول ہے کہ جس حساب کی صحت کا معترف نہ ہو اس
پر فیصلہ نہیں چاہئیے لیکن عام خطوط کی بہ نسبت حساب کی بہی کا عرفاً
زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے اس کے بعد مصالحت پر آمادہ کیا جائے اور
فیصلہ صادر کر دیا جائے۔
اگر تحریر اس کے منشی کی ہے تو پہلے مدعا علیہ سے اس کے متعلق
دریافت کیا جائے اگر اعتراف کرے تو اس سے حق لے لیا جائے ورنہ
منشی سے دریافت کیا جائے اگر وہ بھی انکار کرے تو شبہ کمزور ہو جائے گا

اگر مشتبہ شخص ہو تو اس کو تہدید کی جائے اور معتبر ہو تو زنی کی جائے اور اگر تحریر کا اور اس کی صحت کا اعتراف کرے تو مدعا علیہ کے خلاف شاہد ہو جائے گا اگر شاہد عادل ہو تو اس کی شہادت کا اعتبار کر کے ایک شاہد اور ایک یمین (قسم) پر از روئے مذہب یا از روئے سیاست جس کا شواہد حال تقاضا کریں فیصلہ کر دے کیونکہ شواہد حال کو اختلاف احکام میں خاصہ دخل ہے اور ہر حالت کی تحدید محدود ہے جس سے تجاوز نہ کیا جائے تاکہ تمام احوال بحیثیت اپنے شواہد کے ممتاز رہیں۔

مدعی اور مدعا علیہ اگر دعوے کے ساتھ اس کو ضعیف کرنے والے حالات ہوں تو ان کی چھ قسمیں ہیں جو تقویت دعوے کے منافی ہیں اس صورت میں مدعا علیہ کے بجائے مدعی کے ساتھ تہدید آمیز رویہ اختیار کیا جائے۔

عادل و معتبر گواہ پہلی حالت یہ ہے کہ دعوے کے مقابلہ میں ایسی دستاویز پیش کرے جس کے عادل و معتبر گواہ موجود ہو اور وہ دعوے کے خلاف شہادت دیں جس کی چار وجوہ ہیں۔

(۱) جس شئے کا دعویدار ہے اس کے فروخت کر دینے کی شہادت دیں۔

(۲) شہادت دیں کہ جس شئے کا دعویدار ہے اس سے بے حق ہونے کا ہمارے سامنے اقرار کیا ہے۔

(۳) شہادت دیں کہ اس کے باپ نے اس کی انتقال ملک کا اقرار

کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ جس شئے کا دعویٰ کرتا ہے اس سے بے تعلق ہے۔

(۴) شہادت دیں کہ جس شئے کا یہ شخص دعویدار ہے اس کا مالک مدعاعلیہ ہے ان چار صورتوں میں دعویٰ باطل ہوگا اور حاکم اس کی حالت کے مطابق اس کو تنبیہ و تہدید کرے گا۔

اگر یہ کہے کہ یہ شہادت جبراً بیع کرنے کے متعلق ہے جیسا کہ بعض لوگ کبھی کبھی ایسا کر لیتے ہیں تو بیع نامہ کو دیکھا جائے اگر اس میں لکھا جائے کہ بلا جبر و اکراہ بیع کی ہے تو دعویٰ کمزور ہو جائیگا۔ اور اگر یہ نہیں لکھا تو دعوے کی جہت قوی ہو جائے گی اور قرائن و شواہد حال کے موافق فریقین کی تہدید کی جائے اور اس کے ہمسایوں اور ملنے جلنے والوں سے تحقیقات کی جائے پس اگر بیعنامہ کے خلاف تحقیق ہو تو اس پر عمل کیا جائے ورنہ بیعنامہ کے موافق بیع کی شہادت پر فیصلہ کیا جائے اگر مدعی مدعاعلیہ سے حلف لینا چاہے کہ یہ بیع بلا جبر و اکراہ عمل میں آئی ہے تو علما کا اس کے جواز میں اختلاف ہے کیونکہ یہ اس کے دعوے کے خلاف ہے امام ابوحنیفہ اور بعض علماء شافعیہ کے نزدیک جائز ہے کہ اس کا احتمال و امکان ہے اور دوسرے علماء شافعیہ ناجائز قرار دیتے ہیں کیونکہ پہلا دعویٰ دوسرے دعوے کی تکذیب کر رہا ہے ناظر مظالم کو چاہیئے کہ دونوں دعووں پر غور کرنے اور شواہد کو دیکھنے سے جو مناسب معلوم ہو اس پر عمل کرے۔ مدعاعلیہ کو قسم دینے کی صورت اس وقت اختیار کی جائے۔ جبکہ دعویٰ دین کے متعلق ہو اور مدعاعلیہ رسید ادائی پیش کرے اب مدعی کہتا ہے

کہ بیشک یہ رسید میں نے مکمل کر دی تھی۔ مگر قرض وصول ہونے سے پہلے لکھی اور وہ وصول نہیں ہوا تو اس صورت میں حسب سابق مدعا علیہ پر حلف لازم آئے گا۔

۔شاہدان عدل

دوسری یہ کہ اس تحریر کے شاہدان عدل جو دعوے کے مقابلے میں پیش کی گئی ہے۔ غائب ہوں اس کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ انکار کے ساتھ سبب کا اعتراف ہو مثلاً یوں کہے اس زمین میں مدعی کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ میں نے اس سے خرید کر قیمت ادا کر دی ہے اور یہ کاغذ موجود ہے جس میں گواہی ثبت ہے اس صورت میں مدعا علیہ ایسے کاغذ کا بھی مدعی ہو جائے گا جس کے گواہ حاضر نہیں ہیں لہٰذا گذشتہ طریقہ یہاں بھی اختیار کیا جائے مگر اس کے قبضہ اور تصرف کی وجہ سے علامت قوی اور قرینہ زیادہ ظاہر ہوگا۔

اگر اس سے ملکیت ثابت نہ ہو تو دونوں کو قرائن حالیہ کے موافق تہدید و تنبیہ کرے اور ممکن ہو تو گواہوں کو حاضر کرنے کا حکم دے کر ان کے آنے کی مدت مقرر کر دے اور فریقین کو ایسے لوگوں کے حوالے کر دے جو مصالحت کی سعی کریں اگر رضامندی سے صلح ہو جائے تو فبہا گواہ آجائیں تو شہادت لینے کی بھی ضرورت نہیں اور اگر صلح نہ ہو تو زیادہ کوشش کے ساتھ تفتیش شروع کرے متنازعہ فیہ اور فریقین کے قریب رہنے والوں اور دوران تفتیش میں ناظر محابس کو شواہد و علامات اور اس کے اجتہاد کے مطابق تین امور کا اختیار ہے تاوقتیکہ مدعی کے خلاف زمین بیع کرنے پر بینہ قائم نہ ہو زمین

مدعا علیہ سے لیکر مدعی کو دیدے۔ یا کسی امین کے حوالے کردے اور وہ اس کی آمدنی اصل مستحق کے لئے اپنے پاس محفوظ رکھے۔ یا زمین مدعا علیہ کے پاس رہنے دے مگر اس کو تصرفات سے روک دے اور آمدنی کسی کے پاس امانتاً جمع ہوتی رہے۔

ان تینوں صورتوں میں جب تک تحقیق سے حق ظاہر ہو یا گواہ حاضر ہوں ناظر مظالم فریقین کے جو مناسب سمجھے تجویز کر سکتا ہے اگر گواہوں سے مایوسی ہو جائے تو قطعی فیصلہ سنا دے اگر مدعا علیہ کی خواہش ہو کہ مدعی حلف اٹھائے تو اس کو حلف دیا جائے اور اسی پر فیصلہ ہو جائیگا

(دوسری) یہ کہ انکار کے ساتھ سبب کا اعتراف نہ کرے اور یوں کہے یہ زمین میری ہے اس شخص کا اس میں کوئی حق نہیں۔ اور مدعی کے خلاف شہادت کا کاغذ یا تو اس مضمون کا ہو کہ اس نے (مدعی) اقرار کیا ہے کہ میرا اس زمین میں کوئی حق نہیں یا اس مضمون کا ہو۔ کہ اس نے یہ اقرار کیا ہے کہ مدعا علیہ اس زمین کا مالک ہے تو زمین مدعا علیہ کے پاس رہنے دی جائے اور وہ اس کے پاس ہی رہے مگر بمقتضائے شواہد حال تفتیش حقیقت اور تصفیہ تک حکم اس کے اندر تصرفات ممنوع اور اس کی آمدنی محفوظ کر سکتا ہے اور فریقین کے بارے میں بھی جیسا اجتہاد سے مناسب معلوم ہو کرے۔

مدعا علیہ کا انکار

تیسری یہ کہ جو کاغذ دعویٰ کے خلاف پیش ہوا ہو اس کے شاہد موجود ہوں مگر عدل نہ ہوں تو ناظر مظالم کو چاہئیے کہ ان کے متعلق وہی تینوں صورتیں اختیار کرے جو مدعی کے موافق ہونے میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

مدعاعلیہ کے انکار کو بھی دیکھے آیا اعتراف سبب کو متضمن ہے یا
نہیں بہرکیف حسب ہدایت سابق اپنے اجتہاد اور شواہد حال کے موافق
عمل کرے ۔

شاہدان تحریر چوتھی یہ کہ شاہدان تحریر فوت ہوچکے ہو عمل
تھے اس میں بجز اس کے کچھ نہیں ہوسکتا
کہ تہدید سے کام لے ممکن ہے کچھ انکشاف ہوجائے پھر جو صورت
ہو یعنی انکار اعتراف سبب کو متضمن ہو یا نہ ہو ایک قطعی فیصلہ
کر دے ۔

دعوے کے خلاف تحریر پانچویں یہ کہ مدعاعلیہ دعوی کے
خلاف مدعی کی تحریر پیش کرے
جس سے مدعی کا کاذب ہونا معلوم ہو اس کے متعلق وہی تفتیش
کرنی چاہیئے جو خط و تحریر کی بابت پہلے بیان ہوچکی ہے اور شاہد حال
کے موافق تہدید بھی عمل میں لاسکتا ہے۔

حساب کا رجسٹر چھٹی یہ کہ دعوی کے خلاف حساب کی بہی
پیش ہو جس سے دعوی کا بطلان ظاہر ہو
اس صورت میں وہی رویہ اختیار کیا جائے جو حساب کی بابت پہلے
ذکر کرچکے ہیں یعنی تفتیش و تہدید اور تاخیر فیصلے میں شواہد حال کا
اعتبار رکھا جائے اور جب ناامیدی ہوجائے تو نزاع کو ختم کرنے
لئے ایک قطعی فیصلہ سنادے۔

قاضی کی صوابدید جب دعویٰ اسباب قوت دہندہ سے
خالی ہو تو فریقین کے حالات پر غور

کر کے غلبۂ ظن سے کام لے اس کے حالات تین قسم کے ہو سکتے ہیں۔

(۱) یا تو غلبۂ ظن مدعی کی جانب ہے

(۲) یا مدعاعلیہ کی جانب ہے

(۳) یا مساوی کیفیت ہے۔

غلبۂ ظن کا صرف یہ فائدہ ہوگا کہ فریقین کو تہدید و تنبیہ کر کے واقعات کو آشکارا کرنے کی کوشش کی جائے ورنہ تصفیۂ مقدمات میں غالب ظن و گمان نا قابل اعتبار رہیں اگر غلبۂ ظن مدعی کے حق میں ہے اور مدعاعلیہ کے متعلق بدگمانی ہے تو اس کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) مدعی حجت و برہان سے خالی ہونے کے ساتھ کمزور اور نرم طبیعت کا شخص ہے برخلاف اس کے مدعاعلیہ قوت و شوکت والا آدمی ہے لہٰذا امکان یا زمین کے غصب کا دعویٰ کرنے سے یہ خیال ضروری پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کمزور اور نرم خو اتنی قوت و شوکت والے پر ناحق دعویٰ نہیں کر سکتا۔

(۲) مدعی صدق و امانت میں مشہور ہو اور مدعاعلیہ کذب و خیانت میں لہٰذا غلبۂ ظن مدعی کی جانب سے ہوگا۔ کہ دعویٰ میں صادق ہے۔

(۳) دونوں کی حالت برابر ہو مگر مدعی کا سابق قبضہ مشہور و معروف ہو اور مدعاعلیہ کے قبضہ کی بابت کوئی شہرت نہ ہوئی ہو۔

ہر صورت میں عدالتی کارروائی دو طرح ہونی چاہیئے۔

(۱) بر کر بدگمانی کی وجہ سے مدعاعلیہ کو تہدید و تنبیہ کی جائے۔

(۲) کہ مدعاعلیہ سے سوال کیا جائے کہ متنازع فیہ پر تمہارا قبضہ کیسے
ہوا؟ کیونکہ امام مالکؒ کی رائے میں قضا کے اندر یہ دریافت کرنا درست
ہے لہٰذا مظالم بدرجۂ اولیٰ جائز ہوا۔

ذی وجاہت مدعلیہ ۔ بعض اوقات مدعاعلیہ عالیقدر وذی وجاہت
ہونے کی وجہ سے مدعی کے ساتھ مقدمہ
بازی کرنا اور اس کے ساتھ کھڑا ہونا گوارا نہیں کرتا متنازع فیہ اس
کو بخش دیتا ہے کہا جاتا ہے کہ خلیفہ موسیٰ ہادی ایک روز تصفیہ
مظالم کر رہے تھے اور عمارہ بن ہمزہ ایک بڑے ذی رتبہ شخص خلیفہ کے
ہمنشین تھے دادخواہ آرہے تھے کہ ایک شخص نے آکر دعویٰ کیا "عمارہ
نے میری زمین دبالی" ہادی نے عمارہ سے فرمایا جاؤ جوابدہی کے
لئے اس کے ساتھ بیٹھو عمارہ نے عرض کیا کہ امیرالمومنین! اگر زمین
اس کی ہے تو مجھے دینے سے انکار نہیں اور اگر میری ہے تو میں اس
کو ہبہ کرتا ہوں مگر امیرالمومنین کی ہمنشینی کو فروخت کرنا نہیں چاہتا۔
اگر باعزت لوگوں کی آبروریزی مناسب نہ ہو یا ان کی خود یہ کوشش ہو
کہ عزت وجاہت محفوظ رہے اور ظالم و نادہند مشہور نہ ہوں تو
ناظر مظالم کو چاہیئے کہ حسن تدبیر سے ایسی صورت اختیار کرے کہ حق طلب
کو حق مل جائے اور مدعاعلیہ کی عزت محفوظ رہے جیسا کہ ادن بن محمد
نے واقعہ بیان کیا ہے کہ بصرہ کی نہر مرغاب والوں نے مہدی کے
خلاف اس کے قاضی عبیداللہ بن حسن عنبری کے پاس استغاثہ دائر
کیا مگر اس نے ان کے حوالے نہ کی نہ اس کے بعد ہادی نے واپس
کی پھر رشید تخت نشین ہوئے اور ان سے دادخواہی کی جعفر بن یحییٰ نے

ناظر مظالم تھے مگر واپس نہ دی بالآخر جعفر بن یحییٰ نے رشید سے بیس ہزار درہم میں خرید کر ان کو ہبہ کر دی اور یہ کہا میں نے اس لئے کیا ہے کہ نہیں معلوم ہو جائے کہ امیر المومنین اپنا حق دینے پر آمادہ نہیں اور ان کے غلام نے اس کو خرید کر تمہیں بخشدی ۔

ممکن ہے جعفر نے اپنی رائے سے خود ہی ایسا کیا ہو تاکہ رشید پر ظلم وجور کا الزام نہ آئے مگر قرین قیاس یہ ہے کہ رشید کے اشارہ سے ایسا ہوا تاکہ اس کے باپ اور بھائی غاصب نہ کہلائیں بہرحال حق حقدار کو پہنچ گیا اور دامن عزت و عظمت پر دھبہ نہ آیا ۔

غلبۂ ظن

اگر غلبۂ ظن یہ ہو کہ مدعا علیہ حق بجانب ہے تو اس کی تین وجوہ ہیں ۔

(۱) وجہ یہ ہے کہ مدعی ظالم و خائن مشہور ہو اور مدعا علیہ انصاف پسند امانت دار ۔

(۲) وجہ یہ ہے کہ مدعی کمینہ مبتذل عادات والا ہو اور مدعا علیہ پاکباز اور باعزت مدعی اس کو خفیف ذلیل کرنے کے لئے حلف پر مجبور کرے ۔

(۳) وجہ یہ ہے کہ مدعا علیہ کی ملکیت کا سبب مشہور ہو اور مدعی کے وے کا کوئی سبب اور وجہ معلوم نہ ہو ان ہر سہ وجوہ میں غلبۂ ظن دعا علیہ کی جانب ہوگا اور بدگمانی مدعی کی طرف ۔ امام مالکؒ کا اس رت میں یہ مسلک ہے کہ اگر دعویٰ زمین جائداد کے متعلق ہے و تک سبب ملکیت بیان نہ کرے دعوے کی سماعت نہ کی ے اور اگر قرض واجب الادا کے متعلق ہے تو اس کی سماعت

اس وقت کی جائے جبکہ مدعی اس بات پر شہادت شرعیہ پیش کرے کہ مدعی
اور مدعا علیہ کے درمیان معاملہ تھا مگر امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے
نزدیک مقدمات قضا میں ایسا کرنا درست نہیں ۔ لیکن مقدمات مظالم
کے اندر مصالح کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ واجب کو چھوڑ کر جائز
پر بھی عمل کرنا درست ہے لہٰذا اگر بدگمانی ہو کر عناداً ایسا کر رہا ہے
تو امام مالکؒ کی رائے پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے لہٰذا حتی الوسع ان
اسباب کی چھان بین کرے جن سے حق بات تو ظاہر ہو جائے اور فیصلہ
میں مدعا علیہ کی عزت محفوظ رہے اور اگر حلف تک نوبت پہنچے کہ جس پر
فیصلے کی انتہا ہوتی ہے اور بحیثیت قانون قضا اور قانون مظالم کے مدعی
کو اس کے مطالبہ سے روکنا بھی جائز نہیں ۔ دھمکانے یا نصیحت کرنے
کا بھی اس پر اثر نہیں ہوتا تو اگر اپنے دعووں کو جدا جدا کر کے مدعی علیہ کو
دق اور ذلیل کرنے کے لئے چاہئے کہ ہر دعوے کے متعلق علیحدہ علیحدہ
مجلس میں حلف دے اگرچہ قانون قضا کے بموجب اس کو اس علیحدہ
علیحدہ حلف لینے سے نہیں روکا جا سکتا لیکن قانون مظالم کی مقتضا یہ
ہے کہ اگر مدعی کی شرارت معلوم ہو تو اس کو تمام دعووں کے جمع
کرنے کا حکم دیا جائے ۔ اور مدعا علیہ سے تمام دعووں کے متعلق ایک
حلف لیا جائے

تنقیع وتفتیش

اگر فریقین کی حالت ایک جیسی برابر ہو کسی کے متعلق
غلبۂ ظن اور رجحان نہ ہو تو مناسب یہ ہے کہ دونوں
کو یکساں نصیحت کرے اتنی بات میں تو تمام حکام قضا اور حکام
مظالم متفق ہیں اگر نصیحت کے بعد ناظر مظالم دونوں کو برابر ہونے

کی وجہ سے ایک ساتھ تہدید و تنبیہ کرے اور پھر اصل دعویٰ اور انتقال
لک کی تنقیح و تفتیش کرے اگر تحقیقات سے کسی کا حقدار ہونا ثابت ہو جائے
تو اس کے مطابق عمل کرے ورنہ سربرآوردہ ہمسایوں اور خاندان
کے بزرگوں کے حوالے کر دے تاکہ نزع کو ختم کرا دیں اگر اس سے بھی کام
نہ چلے تو انتہائے کار یہی ہے کہ قانون قضا کے بموجب خود کسی کو نائب بنا کر
قطعی فیصلہ سنا دے بعض اوقات ناظر مظالم کے اجلاس میں دقیق اور
مشکل مقدمے پیش ہوتے جن میں ہمنشینوں کی رہنمائی اور علماء کا حل مفید
ہوتا ہے تو اگر وہ خود ہی پہلے اس کا کوئی حل بتا دیں تو اس کے قبول
کرلے میں انکار نہ کرے اور نہ آخر میں فیصلہ کرتے وقت ان کے مشورہ
پر عمل کرنے میں دریغ کرے ۔

حضرت عمرؓ کا واقعہ

محمدؐ بن معن الغفاری بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت حضرت عمرؓ کے دربار میں حاضر ہوئی
اور عرض کیا امیرالمومنین! میرا شوہر دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات
بھر نمازیں پڑھتا ہے اس کی شکایت کرتی ہوئی ڈرتی ہوں کہ وہ اللہ
تعالیٰ کی اطاعت میں مصروف رہتا ہے ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "ہاں تیرا
شوہر تو بہت اچھا شوہر ہے" اس نے پھر اپنی بات دہرائی آپ نے پھر
یہی جواب دیا ۔ کعب بن سور اسدی نے عرض کیا حضور وہ اس کی شاکی
ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہمبستر نہیں ہوتا آپ نے فرمایا "بیشک تم خوب
سمجھے تم ہی اس کا فیصلہ کرو ۔ کعب نے کہا اس کے شوہر کو بلاؤ ۔ شوہر
بلا لیا گیا اس سے کہا کہ تمہاری بیوی تمہاری شکایت کرتی ہے اس نے
کہا کھانے کی شکایت کرتی ہے یا پینے کی کعب نے کہا دونوں کی نہیں

عورت نے یہ شعر پڑھے۔

(بحر رجز)

یا ایها القاضی الحکیم رشده ألهی خلیلی عن فراشی مسجده

زهده فی مضجعی تعبده نهاره ولیله مایرقده

فلست فی امر النساء احمده فاقض القضا یا کعب لاترده

ترجمہ:۔ اے تجربہ کار ہوشیار قاضی مسجد نے میرے دوست کو مجھ سے غافل کر دیا۔ عبادت نے میرے بستر پر آنا چھوڑ دیا نہ دن کو سوتا ہے نہ رات کو۔ عورتوں کے کام میں وہ قابل تعریف نہیں ہے اے کعب! بلاتردد فیصلہ کر دو۔

شوہر نے کہا۔ (بحر رجز)

زهدنی فی فرشها وفی الحجل انی امرؤ اذهلنی ماقد نزل

فی سورة النحل وفی السبع الطول وفی کتاب الله تخویف جلل

ترجمہ:۔ مجھے اس کے بستر اور اس کی مسہری سے ان ہولناک آیات نے جدا کر دیا جو سورۂ نحل اور سبع طوال بلکہ تمام قرآن میں نازل ہوئیں ہیں۔

کعب نے کہا (بحر رجز)

ان لها حقا علیک یا رجل نصیبها فی اربع لمن عقل

فاعطها ذاک ودع عنک العلل

ترجمہ:۔ بھلے آدمی! عقلمند کے نزدیک تیرے ذمے تیری بیوی کا چوتھائی حق ہے، لہٰذا اس کا حق ادا کر اور ادھر اُدھر کی باتیں چھوڑ۔ پھر کعب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دو دو تین تین چار چار عورتیں

تمہارے لئے حلال فرمائی ہیں لہٰذا تم تین دن رات عبادت الٰہی میں معروف رہو اور ایک دن رات اس کے ساتھ رہو۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کعب! واللہ میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہاری ذکاوت پر زیادہ تعجب کروں یا تمہارے فیصلہ پر۔ جاؤ میں نے تمہیں بصرہ کی قضا تفویض کی۔ اس واقعہ میں کعب کا فیصلہ اور عمرؓ کی تنقید میں جواز پر عمل کیا گیا تھا نہ کہ واجب پر اس لئے کہ ایک زوجہ کے ہوتے ہوئے شوہر پر قسم واجب ہے اور نہ یہ کہ چار دن میں ایک مرتبہ ہمبستر ہو جائے اور دوبارہ نہ ہو۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ناظر مظالم واجب کو چھوڑ کر جائز کو اختیار کر سکتا ہے۔

مقدمات کی تحویل مقدمۂ فوجداری جس شخص کے حوالے کیا جائے اس کی دو حالتیں ہیں۔

حالت یہ ہے کہ وہ ایسے مقدمات کی انصرام کے لئے مقرر ہوا ہے جیسے قاضی تو یا اسے اس مقدمے کے متعلق صرف فیصلہ کرنے کی اجازت دینا مقصود ہے یا تفتیش و مصالحت کی بھی۔ اگر فیصلہ کی اجازت دی گئی ہے تو اس کو نفس قاضی ہونے کی بنا پر فیصلہ کرنا جائز ہے اور یہ مخصوص اجازت و حوالگی سابق ولایت کی تاکید ہوگی یہ مطلب نہ ہوگا کہ اس سے پہلے اس کے اختیارات کم تھے اگر صرف تفتیش مقدمہ یا مصالحت کرانے کی اجازت دی گئی ہے اور اس حوالگی سے مقصود فیصلہ کرنے کی ممانعت ہے تو ممانعت کا مطلب یہ ہوگا کہ قاضی اس مقدمے کا فیصلہ کرنے سے معزول کر دیا گیا ہے لیکن باقی مقدمات کے حق میں عام الاختیار رہیگا کیونکہ سابقاً

قاضی کے تقرر کا عام وخاص ہوناجائز معلوم ہوچکا ہے تو عزل بھی عام وخاص جائز ہوگا اور جبکہ تفتیش مقدمہ کی اجازت دی ہو مگر حکم وفیصلہ سنانے کی ممانعت نہ کی ہو تو بعض کی رائے ہے کہ چونکہ قاضی عام الاختیار رہے لہٰذا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے کیونکہ جو امر متعلق کیا گیا ہے اس کے بعض حصے کی بابت اجازت دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے بعض کی ممانعت ہے اور بعض کے نزدیک فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ صرف تفتیش مقدمہ یا مصالحت کرا سکتا ہے کیونکہ توقیع وحوالگی کے سیاق کی دلالت اسی کے متعلق ہے۔

نیز جاننا چاہیئے کہ اگر توقیع مصالحت کے لئے عمل میں آئی ہے اور قاضی نے مصالحت کرا دی تو اس کی کارروائی پیش کرنا ضروری ہے کیونکہ مقصود حالات کا معلوم کرانا ہے جس پر قاضی کو عمل کرنا لازم ہے اوپر بیان کی ہوئی تفصیل اس شخص کی توقیع کے متعلق ہے جو پہلے سے ولایت وحکومت رکھتا ہو۔

قرائن وعلامات دوسری حالت یہ ہے کہ وہ شخص پہلے سے کوئی عہدۂ حکومت نہیں رکھتا مثلاً فقیر یا شاہ کے حوالے کیا جائے اس کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) تفتیش مقدمہ کے لئے۔

(۲) وساطت ومصالحت کے لئے

(۳) حکم وتصفیہ کے لئے

بصورت اول واجب ہے کہ تفتیش کرنے کے بعد جو حالات

شہادت دینے کے قابل ہوں تفویض کنندہ کے سامنے پیش کردے
تاکہ ان کو سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکے ۔ اگر نا قابل شہادت حالات پیش
کرے تو ان پر فیصلہ کرنا جائز نہ ہوگا لیکن مقدمہ کے اندر قرائن وعلامات
اور مزید انکشاف کا کام دیں گے ۔ اور کسی فریق کو تہدید وتنبیہ کرنا
ممکن ہوگا ۔

بصورت دو فریقین میں مصالحت کی سعی کرے اور اس کے
اظہار کی خاص طور پر توقیع میں ضرورت نہیں اس لئے کہ وساطت تقرر
رعایت پر موقوف نہیں توقیع وساطت سے باختیار توقیع کنندہ وسیط
صلح کرانے والے) کا تعین ہوتا ہے اور فریقین برضا ورغبت (صلح کے
لئے) اس کے پاس آتے ہیں پس اگر وساطت سے فریقین میں صلح کرادے
تو تفویض کنندہ کو اس کی اطلاع کرنا ضروری نہیں ۔ صلح پر گواہ ہو جائے گا
بوقت ضرورت گواہی دے سکے اور اگر صلح نہ کرا سکے تو ان بیانات
پر شاہد ہوگا جن کا فریقین نے اس کے سامنے اعتراف کیا ہے اگر فریقین
دوبارہ ناظر مظالم کے پاس مرافع کریں تو اپنی شہادت پیش کرے
نہ ضروری نہیں ۔

قیع کی صورتیں | بصورت سوم جبکہ توقیع فیصلہ کرنے کے
لئے عمل میں لائی گئی ہو تو چونکہ یہ حکومت ہے
اس میں توقیع کے معانی کا لحاظ ضروری ہوگا ۔ لہٰذا جاننا چاہئیے کہ
کی دو حالتیں ہیں ۔
یہ ہے کہ توقیع کا مدار مدعی کی خواہش پر رکھا جائے اور اس کے
مطابق کارروائی کی جائے اگر وساطت یا تفتیش مقدمہ کا طالب ہو

تو صرف اسی قدر کارروائی کی جائے خواہ توقیع بعنوان امر ہو جیسا اسی طرح کہے "اس کی خواہش کے مطابق کارروائی کرو" یا بعنوان خبر و حکایت جیسے یوں کہے "اس کی خواہش کے مطابق کارروائی کرنے کا تمہیں اختیار ہے" یہ توقیع درست ہوتی ہے مگر چونکہ اس کا مقتضا ایسی ولایت نہیں ہے کہ اس کا حکم لازم ہو اس لئے یہ ولایت کم قابل اہتمام ہوگی۔ پس اگر دادخواہ اپنے مقدمہ کا تصفیہ چاہے تو ضروری ہے کہ مدعاعلیہ کا تعین اور نزاع کا تذکرہ کر دے تاکہ ولایت درست ہو اس کے بدون ولایت صحیح نہ ہوگی۔ کیونکہ نہ تو ولایت عامہ ہے کہ اس پر محمول کرلی جائے اور نہ خاصہ اس کہ خصم (مدعاعلیہ) اور خصومت دونوں مجہول ہیں اگر دونوں کو متعین اور ذکر کر دے تو توقیع کی جائے۔ اگر بعنوان امر ہو مثلاً یوں کہے "اس کے معاملہ کو ہاتھ میں لو، جس طرح اس کی خواہش ہو کارروائی کرو"، تو حکم تصفیہ کرنے کا مجاز ہو جائے گا اور یہ توقیع درست ہوگی۔ اور بعنوان حکایت حال ہو مثلاً یوں کہے "اس کی خواہش کے مطابق عمل کرنے کا تمہیں اختیار ہے"؛ تو یہ توقیع قرائن سلطانیہ کے اعتبار سے امر کے حکم میں ہوگی عرفاً بھی اس طرح استعمال کرتے ہیں مگر احکام دینیہ کے لحاظ سے یہ ہے کہ بعض فقہاء کے نزدیک عرف عام کی وجہ سے جائز ہے اور اس سے انعقاد ولایت صحیح ہے اور بعض اس کو اور اس سے انعقاد ولایت کو ناجائز کہتے ہیں۔ ان کی رائے میں الفاظ کے معانی قابل اعتبار ہیں اس لئے انعقاد ولایت کے لئے امر ہونا ضروری ہے لہٰذا اگر ایسے شخص کی توقیع کی گئی جو عرف عام سے واقف ہو تو اس کی ولایت صحیح ہوگی اور جو شخص عرف

ہام سے واقف نہ ہو اس کی ولایت صحیح نہ ہوگی۔ کیونکہ اس کی خواہش تو یہ
تھی کہ حکم ذریعہ سے توقیع عمل میں آجائے نہ کہ نفس حکم۔

توقیع کا مدار

(۲) حالت یہ ہے کہ توقیع کا مدار مدعی کی خواہش
پر رکھا جائے اور کارروائی مقتضائے توقیع
کے مطابق کی جائے جس بات کو توقیع متضمن ہو وہی ولایت میں اعتبار
کی جائے ہٰلذا یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کے تین احوال ہیں۔

(۱) حال کمال

(۲) حال جواز

(۳) اور وہ حال جو دونوں سے خالی ہو۔

پہلا حال جس میں توقیع ولایت بدرجۂ کمال صحیح ہوتی ہے۔ دو حکم
متضمن ہوتا ہے۔

(۱) حکم بابت تفتیش مقدمہ۔

(۲) حکم بابت تصفیہ مقدمہ

اس کا عنوان یہ ہے "فریقین کے نزاع کی تفتیش کرو اور دونوں
شرعی حق کے مطابق فیصلہ کردو" بصورت جائز ہے یہ ظاہر ہے کر
...دہی ہوتا ہے جس کی شریعت مقتضی ہو مگر توقیعات میں شریعت
مذکورہ شرط کے لئے نہیں بلکہ بطور وصف و بیان کے کر دیا جاتا
ہے چونکہ یہ توقیع ان ہر دو حکم کو جامع ہے ہٰلذا کامل ہوئی اس سے
...عہدہ حکومت صحیح ہے دوسرا حال جس میں توقیع کامل نہیں ہوتی
...ہوتی ہے یہ ہے کہ فیصلہ کرنے کا حکم ہو تفتیش کا نہ ہو، اس کا
...یہ ہے "مرافعہ کنندہ اور مدعا علیہ کا فیصلہ کردو" یا یہ کہ "دونوں

کا تصفیہ کردو " اس عنوان سے ولایت درست ہے اس لئے کہ حکم قضا بدون تفتیش کے ممکن نہیں لہٰذا ضمناً تفتیش کا حکم موجود ہے۔

صلح و وساطت جو حال کمال وجواز دونوں سے خالی ہو یہ ہے کہ توقیع اس عنوان سے کی جائے "دو فریقین کے مقدمہ کو دیکھو" اس توقیع ولایت رحکومت ا منعقد نہیں ہوتی کیونکہ نظر کرنے اور دیکھنے کے اندر دو احتمال ہیں ایک مصالحت جو جائز ہے۔ دوسرا حکم وفیصلہ جو لازم ہے۔ متحمل ہونے میں دونوں برابر ہیں لہٰذا اس سے ولایت انعقاد پذیر نہ ہوگی۔ اور اگر اس عنوان سے کہے "حق کے مطابق دونوں کے مقدمے کو دیکھو" تو بعض کے نزدیک ولایت منعقد ہو جائے گی کیونکہ حق وہ ہے جو لازم ہو اور بعض کے نزدیک منعقد نہ ہوگی۔ کیونکہ صلح و وساطت حق تو ہیں مگر لازم نہیں۔

نماز کی اِمامت

امامت کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) پانچوں نمازوں کی امامت۔

(۲) نماز جمعہ کی امامت

(۳) مستحب نمازوں کی امامت۔ پانچوں نمازوں کی امامت
کا تقرر مساجد کے لحاظ سے ہونا چاہیئے۔ مساجد کی دو قسمیں
ہیں۔

(۱) مساجد سلطانیہ

(۲) مساجد عامتہ۔ مساجد سلطانیہ سے وہ چھوٹی بڑی مساجد مراد
ہیں جن کا تکفل سلطان کی طرف سے ہو۔ ایسی مساجد کی امامت
اسی شخص کو جائز ہوگی جس کو سلطان مقرر کرے ورنہ سلطانی
امور میں رعایا کی دخل اندازی لازم آئے گی۔ سلطان جس شخص کو مقرر
کرے وہی مستحق امامت ہوگا اگرچہ دوسرا شخص اس سے افضل اور
زیادہ عالم ہو اس عہدہ کا تقرر اولیٰ اور مندوب ہے قضا اور

تقابتہ کی طرح واجب نہیں۔ اس کی دو وجہ ہیں ایک یہ کہ اگر لوگ رضامند ہو کر کسی شخص کو امام بنالیں اور وہ ان کو نماز پڑھائے، تو امامت اور جماعت دونوں درست ہیں۔ دوسری یہ کہ جماعت ایک پسندیدہ اور بہترین سنت ہے۔ بجز داؤد کے کسی فقیہہ کے نزدیک فرض واجب نہیں داؤد کہتے ہیں کہ اگر معذور نہ ہو تو جماعت واجب ہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ جماعت سنت موکدہ ہے اور سلطان کے مقرر کرنے کے بعد کوئی اور شخص اس کی موجودگی میں امام نہیں ہو سکتا تو جاننا چاہیے کہ اگر امام نے اپنی غیبوبت میں کسی کو نائب تجویز کر دیا تو وہ احق بالامامتہ ہو گا اور نائب مقرر نہ کیا تو جو شخص نماز پڑھائے بصورت امکان امام سے اجازت حاصل کر لے اجازت مشکل ہو اہل شہر اپنی مرضی سے کسی منتخب کر لیں تاکہ نماز باجماعت نہ چھوٹے اس کے بعد دوسری نماز میں بھی امام موجود نہ ہو تو بعض کے نزدیک جس نے پہلی نماز پڑھائی وہی یہ اور اس کے دوبارہ انتخاب کرنے میں سلطانی تقرر کا احتمال ہوتا ہے اس لئے دوسری نماز کے لئے دوسرا امام منتخب کریں مگر میرے نزدیک دونوں رایوں پر اس طرح عمل کیا جائے کہ اگر دوسری نماز میں وہی نمازی ہوں جو پہلی نماز میں شریک تھے تو سابق امام نماز پڑھائے اگر دوسرے نمازی ہوں تو یہ سابق امام بھی مثل ایک نمازی کے ہو گا۔ لہٰذا از سر نو انتخاب کیا جائے۔

جماعت عامہ سے علیٰحدگی

امام مسجد کے نماز پڑھانے کے بعد جو لوگ نماز پڑھنے آئیں وہ اس مسجد میں جماعت کر کے نہ پڑھیں علیٰحدہ علیٰحدہ پڑھیں تاکہ جماعت عامہ

ے علیحدگی اور اس کی مخالفت کی بدگمانی نہ ہو۔ اگر سلطان کی طرف
ے ایک مسجد میں دو امام مقرر کئے جائیں اور بعض نمازیں ایک کو
ر بعض دوسرے کو پڑھانے کا حکم ہو تو یہ تقرر جائز ہے مثلاً ایک
ن کی نمازوں کا امام ہو۔ اور دوسرا رات کی نمازوں کا۔ ہر ایک
نی اپنی متعلقہ نمازیں پڑھانے کا مجاز ہوگا دوسری نمازیں نہ پڑھلے
ر نمازوں کی تخصیص نہیں کی گئی دن جدا جدا مقرر کر دیئے گئے تو
ہر ایک امام اپنے اپنے دن نمازیں پڑھانے کا حق دار ہوگا۔ اور
ں کی تخصیص نہ کی گئی ہو تو دونوں کی امامت مساوی ہوگی جو سبقت
ر جائے وہی حق ہوگا دوسرے کو یہ حق نہ ہوگا کہ الگ دوسری جماعت
نماز پڑھائے۔ سلطانی مساجد میں ایک وقت کی نماز کے لئے دو جماعتیں
ر نا جائز نہیں۔

سبقت میں جس سے ایک احق ہوتا ہے اختلاف ہے۔ ایک
ورت سبقت کی یہ ہے کہ مسجد میں وہی پہلے آیا ہے دوسری صورت
ہے کہ اس نے امامت کے لئے سبقت کی اگر ایک ساتھ ایک
ت میں دونوں مسجد میں آئیں تو کسی کو پڑھانے کا حق نہ ہوگا دونوں
جد میں آئیں تو کسی کو پڑھانے کا حق نہ ہوگا دونوں میں سے جس
اتفاق طے کرلیں وہی نماز پڑھائے اگر آپس میں نزاع کریں تو
صورتیں ہیں۔
یہ کہ قرعہ اندازی کریں جس کے موافق قرعہ نکلے نماز پڑھائے
یہ کہ اہل مسجد دونوں میں سے ایک منتخب کرلیں۔
امام مسجد کا اجتہاد امام مسجد اپنے اجتہاد اور مذہب پر عمل

کر سکتا ہے ۔ شافعی ہو تو نماز اوّل وقت میں پڑھ سکتا ہے اذان
میں ترجیع اور افراد اقامت کرا سکتا ہے چاہے موذن اس کے ہم مسلک
ہوں یا نہ ہوں ۔ اور حنفی ہو بجز مغرب کے دوسری نمازیں آخر
وقت میں پڑھنا افضل سمجھتا ہو اذان میں ترک ترجیع اور اقامت کی
تکرار کا قائل ہو تو مؤذن اس کے تابع ہوں گے اگرچہ مذہبًا اس کے
موافق نہ ہوں ۔

احکام نماز بھی امام اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق ادا کرے
اگر شافعی ہو بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم بالجہر قنوت بوقت صبح پڑھنے کا قائل
ہو تو سلطان یا نمازیوں کو روکنے کا حق نہیں ۔

علی ہذا القیاس امام حنفی ہو تو اپنی رائے پر عمل کرے کوئی شخص
اس سے تعرض کرنے کا مجاز نہیں ہے ۔ امام و موذن میں فرق یہ ہے
کہ نماز ادا کرنا اپنا حق ہے لہٰذا امام سے کوئی تعرض نہیں کر سکتا اور
اذان دوسروں کا حق ہے لہٰذا اس میں مؤذن سے تعرض ہو سکتا ہے
اگر مؤذن کی خواہش ہو کہ اپنے اجتہاد و مسلک کے موافق اذان دے
تو اذان عام کے بعد اپنے لئے اذان خاص سرا دے سکتا ہے جہراً
ندا دے ۔

امام مسجد کے صفات

اس امام کے تقرر میں پانچ صفات قابل لحاظ ہیں ۔ مرد، عادل، نیک،
قاری، فقیہ ہو تو تتلے پن اور الفاظ کی شکستگی سے محفوظ ہو، بچے،
غلام، اور فاسق کی امامت درست ہے لیکن ان کو ولایت درجہ
حاصل نہ ہو گا ۔ صغر سنی، رق اور فسق ولایت کے منافی ہیں ...

کے منافی نہیں - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن مسلمہ کو
حکم دیا تھا کہ اپنی برادری کو نماز پڑھائیں یہ اس وقت بچے تھے مگر
قرآن ان سب میں اچھا پڑھتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
نے غلام کے پیچھے نماز پڑھی آپ نے فرمایا ہر نیک وبد کے پیچھے نماز
پڑھو - عورت، خنثیٰ، گونگے اور توتلے کی امامت جائز نہیں عورت
یعنی نماز پڑھائیں تو مرد یا خنثیٰ مقتدیوں کی نماز فاسد ہو جائے گی
گونگا یا توتلا جو حروف کو دوسرے حروف سے بدل دے . امامت
کرے تو مقتدیوں کی نماز باطل ہو جائے گی صرف ان کی صحیح ہوگی جو
ان کی طرح گونگے یا توتلے ہوں -

قرات اور فقہ کا علم | قرات اور فقہ کے اعتبار سے کم از کم
سورۂ فاتحہ یاد ہو اور احکام نماز جانتا ہو
اس قدر جاننا تو ضروری ہے اگر حافظ قرآن اور تمام احکام نماز کا
عالم بھی ہو تو وہ زیادہ اولیٰ ہوگا -
اگر فقیہ غیر قاری اور قاری غیر فقیہ جمع ہوں تو فقیہ اگر سورۂ فاتحہ
پڑھ سکتا ہو قاری سے اولیٰ ہے کیونکہ قرآن بقدر ضروری محصور ہے
اور حوادث جو نماز میں پیش آئیں غیر محصور ہیں - امام اور اس کے
مؤذن کو بیت المال کے مصالح کی مد دسے امامت اور اذان
کی تنخواہ لینا جائز ہے امام ابو حنیفہؒ اس کو ممنوع کہتے ہیں مساجد
جن کو لوگ اپنے محلوں یا راستوں پر تعمیر کریں ان کے اماموں
کے متعلق سلطان کو تعرض کرنے کا حق نہیں وہ لوگ خود اپنی
پسندی سے مقرر کرنے کے بعد بلا کسی معقول وجہ کے نہ معزول

کر سکتے ہیں اور نہ اس کا نائب مقرر کر سکتے ہیں۔ انتخاب امام کا حق اہل مسجد کو ہو گا۔ اگر انتخاب میں اختلاف ہو تو اکثر کی رائے پر عمل کیا جائے اگر دونوں طرف برابر ہو تو نزاع مٹانے کے لئے سلطان ایسے شخص کا انتخاب کرے جو ان میں سب سے زیادہ دیندار، معمر، قاری اور فقیہ ہو اس میں اختلاف ہے کہ سلطان امام کا انتخاب ان لوگوں میں سے کرے جن کے متعلق اہل مسجد میں اختلاف ہو یا تمام اہل مسجد میں سے کسی کو انتخاب کر سکتا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ جن لوگوں کی امامت میں نزاع ہوا انہی میں سے ایک کو منتخب کر سکتا ہے کیونکہ دوسروں کے ترک کرنے میں سب متفق ہیں اور دوسری رائے یہ ہے کہ سلطان وسیع الاختیار ہے تمام اہل مسجد میں سے جس کو چاہے منتخب کر دے۔

مسجد تعمیر کرانے والا | جو شخص مسجد تعمیر کرائے استحقاق امت و اذن میں مسجد کے سب ہمسایوں کے مثل ہو گا اس کا استحقاق کسی سے زائد نہ ہو گا۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک امامت و اذان میں بانی مسجد احق ہے اگر چند لوگ ایک شخص کے گھر پر آ کر نماز باجماعت پڑھیں تو صاحب خانہ احق بالامامۃ ہے اگرچہ علم و فضل میں ان سے کم ہو اور اگر سلطان آئے تو ایک قول یہ ہے کہ سلطان الولایت ہونے کی وجہ سے احق ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ مالک مکان احق ہے اس لئے کہ اپنے ملک میں تصرفات کرنا اس کے ساتھ مختص ہے۔

نماز جمعہ کی امامت | امامت نماز جمعہ کے واجب التقرر ہونے

ین فقہا کا اختلاف ہے امام ابوحنیفہؒ اور علمائے عراق اس طرف
گئے ہیں کہ یہ ولایات واجبہ میں سے ہے اس لئے سلطان یا اس کے
نائب کے بدون نماز جمعہ صحیح نہیں ہوتی۔ امام شافعی اور علمائے
حجاز کہتے ہیں کہ اس کا تقرر مندوبات سے ہے سلطان کا ہونا
شرط نہیں نمازی شرائط کے مطابق ادا کر دیں تو ادا ہو جائے گی
جمعہ کی امامت غلام بھی کر سکتا ہے مگر اس کی ولایت منعقد نہیں
ہوتی بچے کے امام ہونے میں دو اقوال ہیں۔
نماز جمعہ ایسی آبادی میں جائز ہے جس میں ملے جلے مکانات
ہوں اور ان میں رہنے والوں سے جمعہ منعقد ہو سکتا ہو ایام گرمی و
سردی بلا ضرورت بستی چھوڑ کر باہر نہ جاتے ہوں شہر یا قریہ ہونے
کی کوئی تخصیص نہیں اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جمعہ شہروں کے
ساتھ خاص ہے قریہ میں جائز نہیں۔ مصر سے یہ مراد لیتے ہیں کہ
اس میں سلطان اور قاضی ہوں جو اجرائے حدود اور تنفیذ احکام
کریں۔

خارج المصر آدمی پر نماز جمعہ واجب ہونے میں اختلاف ہے
امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس سے ساقط ہے اور شافعیؒ کہتے ہیں
اگر اذان سنے تو اس پر واجب ہے۔

نمازِ جمعہ — نماز جمعہ کے نمازیوں کی تعداد میں اختلاف ہے
امام شافعیؒ کے نزدیک چالیس سے کم آدمیوں
سے منعقد نہیں ہوتا۔ اس تعداد میں عورت، غلام اور مسافر شامل
نہیں۔ امام چالیس میں داخل ہے یا نہیں اس میں اصحاب شافعیؒ

مختلف الرائے ہیں بعض کے نزدیک اس وقت صحیح ہوگی جبکہ امام اکتالیسواں ہو اور اکثر یہ کہتے ہیں کہ مع امام کے چالیس ہوں تب بھی جائز ہے زہریؒ اور محمد بن حسن کہتے ہیں کہ امام کے علاوہ بارہ ہوں تو منعقد ہو سکتا ہے امام ابوحنیفہؒ اور مزنی کہتے ہیں کہ مع امام کے چار ہوں تو منعقد ہو جاتا ہے امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ کوئی عدد متعین نہیں اتنے آدمی کہ بظن غالب ان کے لئے وطن ہونا چاہئیے۔ راستہ سفر میں یا خارج مصر جمعہ منعقد نہ کیا جائے البتہ اگر شہر کی عمارتیں وہاں تک متصل چلی گئی ہوں تو جائز ہے۔ اگر شہر چند قریوں کو شامل ہو کر عمارت متصل ہو گئی ہوں اور بغداد کی طرح باشندوں کی کثرت سے بہت وسیع شہر ہو گیا ہو تو جن متعدد مقامات پر پہلے سے جمعہ ہوتا تھا وہاں اب بھی جائز ہے یعنی ایسی صورت میں اتصال عمارات متعدد جگہ جمعہ قائم کرنے سے مانع نہیں۔

جامع مسجد اگر ابتدا سے ایک ہی شہر ہو اور جامع مسجد میں تمام باشندوں کی وسعت ہو (جیسے مکہ) تو دوسرے مقام پر جمع قائم کرنا جائز نہیں اور اگر کثرت باشندگان کی وجہ سے مسجد میں تمام کی وسعت نہ ہو جیسے (بصرہ) تو دو جگہ قائم کرنے میں علمائے شافعیہ کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک جائز بعض کے نزدیک ناجائز ہے اگر راستوں میں صفیں قائم کر لیں تو دوسری جگہ جمعہ قائم کرنے کی مجبوری نہ رہے گی

جس شہر میں دو جگہ جمعہ قائم کرنے کی ممانعت ہو اگر اس کے باشندے دو جگہ قائم کر لیں تو اس میں دو قول ہیں ایک یہ کہ جس میں اقامت جمعہ

سابق ہو ان کا جمعہ صحیح ہے اور بعد والے نماز ظہر سے اعادہ کریں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جمعہ بڑی مسجد میں جس میں سلطان آئے قائم ہو وہ صحیح ہے خواہ سابق ہو خواہ مسبوق ہو۔ اور جو لوگ چھوٹی مسجد میں پڑھیں وہ ظہر کی نماز پڑھ کر اعادہ کریں۔

امام جمعہ کے فرائض میں پانچوں وقت کی نماز کی امامت نہیں ہے جو شخص پانچ نمازوں کا امام ہو وہ امام جمعہ بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ جو علماء جمعہ کو مستقل فرض کہتے ہیں ان کے نزدیک نہیں ہو سکتا جن کے نزدیک جمعہ ظہر کا اختصار ہے وہ کہتے ہیں کہ جمعہ کا امام ہو سکتا ہے۔

اگر امام جمعہ کا مذہب یہ ہو کہ چالیس آدمیوں سے کم کا جمعہ منعقد نہیں ہوتا اور مقتدی جو چالیس سے کم ہوں اس کو جائز سمجھتے ہوں تو اس کو امامت کرنا جائز نہیں۔ مقتدیوں میں سے کسی کو اپنا نائب بنانا واجب ہے۔

اگر امام چالیس سے کم کا جمعہ جائز سمجھتا ہے مگر مقتدی جائز نہیں سمجھتے تو جمعہ قائم کرنا لازم نہیں۔ اس لئے کہ ان مقتدیوں کے نزدیک جائز نہیں۔ اور دوسرے مقتدی جو امام کے ساتھ نماز پڑھیں موجود نہیں۔

امام اور حاکم اگر امام کو سلطان کا حکم ہو کہ چالیس سے کم لوگوں کو نماز جمعہ نہ پڑھائے تو اگرچہ امام اس کو جائز سمجھتا ہو مگر اس کو پڑھانا جائز نہیں کیونکہ اس کو چالیس کی صورت میں اختیار دیا گیا ہے اس سے کم کا اختیار نہیں ہے مگر یہ جائز ہے

کہ کسی دوسرے شخص کو اپنا نائب بنا دے وہ ان کو نماز پڑھائے اگر سلطان کا حکم ہو کہ چالیس سے کم کو بھی پڑھائے اور امام اس کو جائز نہ سمجھتا ہو تو اس کے متعلق دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ جو کہ امام کے نزدیک جائز نہیں لہٰذا نماز باطل ہوگی دوسری صورت یہ ہے کسی کو اپنا خلیفہ بنا دے نماز صحیح ہو جائے گی۔

مسنون نماز کی امامت | مسنون نمازوں کی امامت پانچ قسم پر ہے۔

(۱، ۲) عیدین
(۳) کسوف
(۴) خسوف
(۵) اور استسقا۔

ان نمازوں کے لئے امام کا تقرر مندوب ہے اس لئے کہ باجماعت اور تنہا دونوں طرح پڑھنی جائز ہیں۔ ان کے حکم میں اختلاف ہے بعض اصحاب شافعی کے نزدیک سنت موکدہ ہیں اور بعض کے نزدیک فرض کفایہ جو شخص پانچوں نمازوں یا جمعہ کا امام مقرر کیا جائے تو ان کو بھی قائم کر سکتا ہے۔

نماز عید | نماز عید کا وقت طلوع شمس اور زوال شمس کے بین ہے عید الضحیٰ کی نماز میں تعجل اور عید الفطر کی نماز میں تاخیر بہتر ہے لوگوں کو چاہیئے کہ دونوں عیدوں کی رات میں غروب شمس سے لے کر جب تک نماز عید شروع ہو تکبیرات پڑھتے رہیں بالخصوص عید الضحیٰ میں فرض نمازوں کے بعد یوم نحر کی نماز ظہر کے بعد

ے آخر ایام تشریق تک پڑھیں۔

خطبہ عیدین

نماز عیدین خطبے سے قبل اور نماز جمعہ خطبے کے بعد مسنون ہے نماز عیدین میں تکبیرات زائد بھی داخل ہیں ان کی تعداد میں فقہا کا اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک تکبیر احرام کے علاوہ سات تکبیریں زیادہ کہے اور دوسری رکعت میں تکبیر قیام کے علاوہ پانچ تکبیریں کہے مگر ہر دو رکعت کی تکبیریں قرائت سے پہلے کہی جائیں امام مالکؒ کے نزدیک پہلی میں چھ اور دوسری میں تکبیر قیام کے علاوہ پانچ کہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ پہلی میں قرأت سے قبل تین کہے اور دوسری میں قرائت کے بعد علاوہ تکبیر قیام کے چار کہے۔ اعداد تکبیرات کے متعلق امام اپنے مسلک واجتہاد پر عمل کر سکتا ہے تقرر کرنے والا اپنی رائے پر مجبور کرنے کا مجاز نہیں۔ برخلاف اس کے جمعہ کے نمازیوں کی تعداد معین کرنے سے امام خاص الولایہ ہو جاتا ہے اور عیدین کی تکبیرات کرنے سے خاص الولایہ نہیں ہوتا خسوف شمس وقمر کی نمازیں وہی شخص پڑھا سکتا ہے جس کو سلطان تجویز کرے یا وہ شخص جس کی امامت عام نمازوں کے لئے ہو تو یہ بھی ان میں شامل ہوں گی۔ یہ نماز دو رکعتوں پر مشتمل ہوتی ہے ہر رکعت میں دو رکوع دو قیام ہوتے ہیں ہر قیام میں قرأت طویل ہوتی ہے پہلی رکعت کے پہلے قیام میں سورہ فاتحہ کے بعد سورۂ بقرہ یا اس کی برابر کسی اور جگہ سے پڑھے رکوع سو آیتوں کے برابر ہو۔ رکوع میں تسبیح پڑھے۔ پھر سیدھا کھڑا ہو کر فاتحہ کے بعد سورۂ آل عمران یا اس کے برابر پڑھے اور رکوع اسی آیتوں کے قدر کیا جائے دو سجدے

عام نمازوں کی طرح کئے جائیں اسی طرح دوسری رکعت میں قرأت قیام وتسبیح درکوع پہلی رکعت کے دو ثلث کے برابر ہونی چاہیئے ۔اس کے بعد خطبہ پڑھے ۔

کسوف وخسوف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دو رکعت عام نمازوں کی مانند پڑھے ۔خسوف قمر کی نماز کسوف شمس کی طرح ہے مگر جہراً پڑھی جائے کیونکہ رات کی نماز ہے امام مالکؒ کی رائے ہے کہ خسوف قمر کی نماز کسوف شمس کی طرح سرّ پڑھی جائے۔

نماز استسقاء اندیشۂ قحط اور انقطاع بارش کے وقت پڑھی جائے جس کو اس کا انتظام تفویض ہو اس کو چاہیئے کہ نماز سے قبل تین روزے رکھے ظلم وتعدی اور جھگڑوں کو موقوف کرے جن لوگوں میں مخاصمت اور نزاع ہو یا انقطاع تعلقات ہو ان میں صلح کرائے ۔اس نماز کا وقت وہی جو نماز عید کا ۔

جس کو بلا تخصیص ایک سال نماز عید کا امام بنایا جائے وہ جب تک معزول نہ کیا جائے آئندہ بھی نماز عید پڑھانے کا مجاز ہے جس کو بلا تخصیص ایک سال نماز کسوف یا استسقاء کا امام مقرر کیا جائے وہ آئندہ بلا اس کے دوبارہ مقرر کیا جائے نماز پڑھانے کا مجاز نہیں فرق یہ ہے کہ نماز دائمی سالانہ ہوتی ہے اور نماز خسوف واستسقاء عارضی ہوتی ہیں ۔

نماز استسقاء اگر نماز استسقاء پڑھتے ہوئے بارش ہوجائے تو نماز پوری کردیں اور اس کے بعد شکریہ کا خطبہ پڑھا جائے نماز سے پہلے بارش ہوجائے تو نماز نہ پڑھیں بغیر

خطبے کے اللہ تعالیٰ کا شکرا دا کریں۔ یہی حکم خسوف کے ختم ہوجانے کی صورت میں ہے استسقاء کے لئے دعا بغیر نماز کے کافی ہے ابو مسلم انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ اتیناد ما لنا بعیر یئط ولا صبی یصطبح

ترجمہ :۔ میں آپ کے پاس اس حالت میں آیا ہوں کہ نہ ہمارے پاس کوئی اونٹ زندہ رہا ہے اور نہ کوئی بچہ۔

اور یہ شعر پڑھے۔

اتیناک والعذراء یدمی لبانها ۔۔۔ وقد شغلت ام الصبی عن الطفل
والقی بکفیه الصبی استکانة ۔۔۔ من الجوع ضعفا لا یمر ولا یحلی
ولا شیئ مما یاکل الناس عندنا ۔۔۔ سوی الحنظل العامی والعلهز الفل
ولیس لنا الا الیک فرارنا ۔۔۔ واین فرار الناس الا الی الرسول

ترجمہ :۔ میں آپ کی خدمت میں اس حالت میں آیا ہوں کہ ہمارے یہاں کی باکرہ عورتیں بھوک کی وجہ سے اپنے پستان چوس رہی ہیں، اور ماں اپنے شیرخوار بچے کی طرف سے دودھ خشک ہوجانے کی وجہ سے بے فکر ہوگئی ہے اور بھوک سے وہ اس قدر ناتواں اور کمزور ہوگئی ہے کہ وہ اپنے بچے کو ہاتھ سے اٹھا بھی نہیں سکتی اور اٹھنے بیٹھنے کی بھی طاقت اس میں نہیں رہی۔

اب ہمارے پاس سوائے عام اندرائن اور کٹیلی کے اور کوئی کھانے کی شئے نہیں رہی۔ مجبوراً میں آپ کے پاس بھاگ کر آیا ہو کر آپ مدد کریں اور لوگوں کا یہ دستور ہے کہ وہ مصیبت کے وقت انبیاء کے پاس دوڑ کر آتے ہیں۔

آپ صلعم اٹھے اور چادر سنبھالتے ہوئے منبر پر تشریف لے گئے حمد و ثنا کے بعد آپ نے دعا کی اللّٰھم اسقنا غیثاً غدقاً مغیثاً سحاً طبقاً غیر رائث ینبت بہ الزرع و یملاء بہ الضرع و یحیی بہ الارض بعد موتھا وکذالک تخرجون۔

ترجمہ:۔ خداوندا تو ہم پر کثیر مقدار میں باران رحمت نازل فرما جس سے ہر جگہ سیراب ہو جائے۔ اور وہ مینہ مفید ہو جس سے کھیتی اگ جائے تھنوں میں دودھ بھر جائے اور زمین موت کے بعد حیات نو اختیار کرے اور اسی طرح تم قبروں سے دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔

آپ نے دعا ختم نہ فرمائی تھی کہ بارش شروع ہوئی اور اس قدر پانی برسا کہ نشیبی مقامات کے رہنے والے چلاتے ہوئے آئے یا رسول اللہ ہم ڈوبے آپ نے دعا کی حوالینا علینا (الٰہی ہمارے گرد نہ ہم پر) بادل مدینہ کے اوپر سے پھٹ کر تاج کی طرح نظر آنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے مسکرائے کہ آپ کے دندان مبارک نظر آنے لگے فرمایا ابوطالب کا بھلا ہو اگر زندہ ہوتے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں کون ہے جو ان کے شعر سنائے علی بن ابی طالب نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ یا رسول اللہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان کی اس بات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں

بحر طویل

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ	ثمال الیتامی عصمۃ للارامل
یلوذ بہ الھلاک من آل ھاشم	فھم عندہ فی نعمۃ وفواضل
کذبتم وبیت اللہ نبزی محمداً	ولما نقاتل دونہ ونناضل
ونسلمہ حتی نصرع حولہ	ونذھل عن ابنائنا والحلائل

ترجمہ :- میرے ممدوح کا چہرہ ایسا روشن ہے کہ ابر سفید اس سے
آب حاصل کرتا ہے ، وہ تیمیوں کا مددگار اور رانڈوں کا معین و محافظ ہے
آل ہاشم کے تباہ حال اس کی پناہ لیتے ہیں اور اب وہ اس کے پاس مزے
سے عیش کرتے ہیں ۔

خانۂ کعبہ کی قسم تم اس خیال میں جھوٹے ہو کہ ہم محمدؐ کو بغیر نیزہ زنی اور
تیر اندازی کئے دشمن کے حوالے کر دیں گے یہ کبھی نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ ہم اپنی
اولاد اور بیویوں کو فراموش کر کے اس کے گرد کٹ نہ جائیں ہم اس کو ہرگز
نہ چھوڑیں گے ۔

امیرِ حج

اس عہد کی دو قسمیں ہیں ایک حجاج کے سفر کے لئے۔ دوسرا
ادائے حج کے لئے امیر سفر کا عہدہ سیاسی و انتظامی حیثیت سے
ہوتا ہے اس کی قابل اجتہاد و شرائط دس ہیں۔

(۱) سفر اور قیام کی حالت میں لوگوں کو منتشر نہ ہونے دے تاکہ
ہلاک ہونے کا خطرہ نہ ہو۔

(۲) سفر و قیام کے لئے اس طرح ترتیب قائم کرے کہ علیحدہ علیحدہ
جماعتیں بنا کر ان پر سردار مقرر کرے ہر جماعت سفر و
قیام میں اپنے سردار کی متبع ہو جہاں وہ ٹھہرے اسی
جگہ اس کی جماعت ٹھہرے تاکہ اس کی بابت آپس میں نزاع
نہ ہو اور نہ اپنی جگہ سے گم ہوں۔

(۳) اس قدر تیز نہ چلے کہ کمزور لوگوں کو دشواری ہو یا جو پیچھے
رہ جائیں پھر قافلہ تک نہ پہنچ سکیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
سے روایت ہے آپ نے فرمایا وہ کمزور شخص قافلہ کا امیر ہے
آپ کا مقصود یہ ہے کہ جس کی سواری ضعیف ہو لوگوں

چاہیئے کہ اسی کی رفتار سے چلیں ۔

(۴) قافلہ کھلے ہوئے اور سر سبز راستے سے لے جائے قحط زدہ اور چٹیل علاقوں سے بچے ۔

(۵) پانی اور چارہ کی قلت محسوس ہو تو فوراً تلاش کرائے ۔

(۶) راستے میں جب کسی جگہ ٹھہرنا ہو تو قافلہ کی حفاظت کا انتظام کرے چلتے ہوئے مکمل نگرانی رکھے تاکہ اچکوں اور چوروں کو موقع نہ ملے ۔

(۷) جو لوگ راستے میں قافلہ کو سفر سے روکیں اور حج کو نہ جانے دیں اگر امیر میں قدرت ہو تو ان کے ساتھ جنگ کر کے راستہ صاف کرے قدرت نہ ہو تو اگر روپیہ وغیرہ دیکر کام چل سکے اور حجاج اس کو منظور کریں تو یہ بھی دے سکتا ہے امیر کو یہ اختیار نہیں ہے کہ حجاج سے خفارت (رہبری) کے لئے جبراً روپیہ وصول کرے اگر وہ خود اپنی خوشی سے صرف کرنا چاہیں تو جائز ہے وجہ یہ ہے کہ حج کی قدرت حاصل کرنے کے لئے مال کا صرف کرنا واجب نہیں ہے ۔

حجاج کے مناقشات اور جھگڑوں کو صلح کرا کر مٹا دے اپنے فیصلے پر کسی کو مجبور کرنے کا مجاز نہیں اگر اختیارات فیصلہ بھی اس کو تفویض کئے گئے ہوں تو بیشک فیصلہ پر مجبور کر سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ حکومت کی اہلیت رکھتا ہو ۔ پس اگر ایسے شہر میں ٹھہرنا ہو جس میں عدالت موجود ہو تو یہ اور حاکم شہر دونوں حجاج کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں دونوں

کا حکم نافذ ہوگا اگر نزاع حجاج اور اہل شہر کے مابین ہو تو صرف حاکم شہر فیصلہ کر سکتا ہے۔

(۹) کج رو اور خائن کو تادیب اور سزا دے مگر یہ سزا حد کی مقدار تک نہ پہنچنی چاہیئے البتہ حد کے قائم کرنے کی اس کو اجازت ہو اور اس کے متعلق درجۂ اجتہاد رکھتا ہو تو حد بھی جاری کر سکتا ہے اگر ایسے شہر میں داخل ہو جس میں وہاں کا حاکم حدود موجود ہو تو اگر جرم کا مرتکب داخلہ سے پہلے ہوا ہو تو اولیٰ یہ ہے کہ امیر حجاج حد جاری کرے اور اگر شہر میں داخل ہو کر ہوا ہو تو حاکم شہر کا حد جاری کرنا بہتر ہے۔

(۱۰) وقت کا خاص لحاظ رکھے ایسا نہ ہو کہ حج فوت ہو جائے یا تنگی وقت کی وجہ سے گھبرا کر چلنا پڑے میقات پر پہنچنے کے بعد احرام باندھنے اور سنتیں پڑھنے کا وقت دے پھر اگر وقت کافی ہو تو قافلے کو مکہ لے جائے تاکہ مکہ والوں کے ہمراہ حج کے لئے نکلیں اور وقت تنگ ہو تو سیدھا عرفات لے جائے تاکہ قیام عرفات فوت نہ ہونے پائے۔ ورنہ حج فوت ہو جائے گا اس لئے کہ فوت عرفات کا وقت عرفہ کے دن زوال شمس سے لے کر نحر کے دن کی صبح صادق کے طلوع تک ہے لہٰذا جس شخص کو اس عرصہ میں دن یا رات میں وقوف عرفات میسر ہو گیا تو اس کا حج ہو گیا اور جو شخص اس عرصہ میں وقوف نہ کر سکا اس کا حج فوت ہو گیا۔ وہ مابقی ارکان کو پورا کرے اور اس قصور میں ایک دم قربانی دے اور آئندہ سال اگر ممکن ہو حج کی قضا کرے ورنہ اس کے بعد جب میسر ہو۔ حج فوت ہو کر عمرہ نہیں بن جاتا۔ حج کے فوت ہونے کے

بعد حلال ہونے کے وہی طریقہ ہے جو حج کے بعد حلال ہونے کا۔ امام
بوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اعمال عمرہ کرکے حلال ہو جائے ۔ ابو یوسفؒ
رماتے ہیں کہ فوت ہونے سے اس کا احرام عمرہ ہو جاتا ہے ۔ مکہ پہنچنے
کے بعد جو لوگ واپسی کے خیال سے نہ گئے ہوں وہ امیر کی ماتحتی سے
ے نکل جائیں گے اب ان کے ذمہ اس امیر کی اطاعت لازم نہ
ہے گی۔ جب حج سے فراغت ہو جائے تو جتنے دن کا دستور ہو لوگوں
ضروریات پوری کرنے کے لئے وہاں ٹھہرنے کی مہلت دے ایسی
جلت نہ کرے کہ ان کو نقصان پہنچے ۔

جب واپسی ہو تو مدینہ طیبہ کے راستے سے چلے تاکہ روضۂ مبارک
ناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں اور حجاج
یت اللہ اور زیارت روضۂ اطہر دونوں میسر ہو جائیں ۔ اگر زیارت
ان میں سے نہیں ہے مگر آپ (صلعم) کا احترام اور حق اطاعت
مت پر عائد ہوتا ہے اس کا مقتضا ہے کہ ہم اس سے محروم نہ رہیں
ایہ حجاج کی عادات مستحسنہ اور مندوبات شرع میں داخل ہو گئی
ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
یا من زار قبری وجبت لہ شفاعتی (جس نے میری قبر کی زیارت
اس کے لئے میری شفاعت واجب ہو گئی)

مارت ادائے حج | امامت ادائے حج کی کیفیت امارت
نماز کی ایسی ہے ۔ لہٰذا اس کے لئے
ط نماز کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مناسک اور احکام حج
م اور مواقیت و ایام حج کو جانتا ہو ۔ اس کی امارت سات دن

کے لئے ہوتی ہے یعنی ۷ ذی الحج کی نماز ظہر کے بعد سے حلق کے
(۱۳ ذی حجہ) نفر ثانی تک۔ ان ایام سے پہلے اور بعد امام حج عام ولایا
کی طرح ہے اگر مطلقاً اقامتہ حج کا امام بنایا گیا ہے تو آئندہ ہر سال بھی
بشرطیکہ معزول نہ کیا جائے امیر حج رہے گا اور اگر صرف ایک سال
کے لئے امیر بنایا جائے تو بلا جدید تقرر کے آئندہ سال کا امام نہ ہوگا
جن احکام کی پابندی اس امام سے متعلق ہے ان میں سے پانچ
تو متفق علیہ ہیں اور چھٹا مختلف فیہ ہے۔

(۱) احرام باندھنے اور روانگی کے اوقات سے لوگوں کو مطلع کرے
تاکہ لوگ اس کے افعال کا اتباع کر سکیں۔

مناسک حج

(۲) مناسک حج بالترتیب ادا کرے کسی کو مقدم و موخر نہ کرے
خواہ ان میں ترتیب ضروری ہو یا مستحب۔

(۳) ٹھہرنے کے مقامات اور ان سے روانگی کا تعین اس طرح
کرے۔ جیسے مقتدیوں کی نماز امام کی نماز کے ساتھ متعین
ہوتی ہے۔

(۴) تمام ارکان مشروعہ کا اتباع کرے اور دعاؤں کے بعد آمین
کہے تاکہ لوگ اس کے ہر قول و فعل کی پیروی کریں اور سب
کی دعائیں جمع ہونے سے اجابت و قبولیت کے دروازے
مفتوح ہوں۔

(۵) ان ایام میں جن نمازوں کے بعد خطبات حج اور حجاج کا جمع ہونا
ضروری ہے ان کی امامت کرے ایسی نمازیں چار ہیں جبکہ احرام

باندھنے کے بعد مسنونات و مندوبات حج شروع ہوتے ہیں اگرچہ ان کے بعد احرام باندھنا درست ہے ساتویں تاریخ کو مکہ میں ظہر کی نماز پڑھے اس نماز کے بعد خطبہ کہے حج کے چار خطبوں میں سے یہ پہلا خطبہ ہے جس کو اگر محرم ہو تو تلبیہ سے شروع کرے محرم نہ ہو تو تکبیر سے لوگوں کو بتلائے کہ کل انھیں منیٰ جانا ہے تاکہ سب تیار رہیں یہ آٹھویں تاریخ ہوگی لہٰذا خیف منیٰ میں کنانہ کے قریب جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا تھا اترے۔ شب گذار کر نویں تاریخ کی صبح کو طلوع شمس کے ساتھ عرفات کی طرف ضب کے راستے سے روانہ ہو اور مازمین کے راستے سے واپس ہو تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہو اور آمد و رفت کے راستے بدل جائیں۔

عرفات کے قریب پہنچ کر بطن عرفہ میں اتر جائے زوال شمس تک وہیں مقیم رہے ظہر کی نماز کے لئے وادی عرنہ میں ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مسجد میں جائے نماز سے قبل جمعہ کے مثل دوسرا خطبہ کہے۔ خطبۂ جمعہ عرفہ کے سوا تمام خطبے نماز کے بعد ہوتے ہیں اس خطبہ میں ارکان حج اور مناسک کی جن کی ادائی لازمی ہے تعلیم دے محرمات و ممنوعات سے روکے خطبے کے بعد ظہر و عصر ایک وقت میں جمع کرکے پڑھائے۔

نمازیں قصر مسافران نمازوں میں قصر کریں اور مقیم پوری پڑھیں جمع اور قصر دونوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے نمازوں سے فارغ ہو کر عرفات میں جائے یہ وہ مقام ہے جس میں ٹھہرنا ضروری ہے رسول اللہ صلی علیہ وسلم

کا ارشاد ہے حج عرفات ہے جس نے عرفات کو پالیا اور جس سے
عرفات فوت ہوگیا اس سے حج فوت ہوگیا۔

میدان عرفات کی حد وادی عرفہ اور اس کی مسجد سے آگے بڑھ کر (کیونکہ وادی عرنہ اور اس کی مسجد عرفات سے خارج ہیں) سامنے کے پہاڑوں تک ہے۔ لہٰذا تینوں پہاڑ نَبْعَۃ، نُبَیْعَۃ اور تائب کے قریب ٹھہرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تائب کے کنارے پر قیام فرمایا تھا اور اپنی اونٹنی کا سینہ محراب کی طرف رکھا تھا لہٰذا امام کے ٹھہرنے کے لئے سب سے بہتر مقام یہی ہے۔ یوں عرفات میں ہر جگہ امام اور لوگ ٹھہر سکتے ہیں بہتر یہ ہے کہ امام اپنی سواری پر وقوف کرے تاکہ لوگ بھی اس کا اتباع کر سکیں۔

مزدلفہ غروب شمس کے بعد نماز کو مؤخر کر کے وہاں سے مزدلفہ کو روانہ ہو وہاں پہنچ کر عشاء کے وقت مغرب و عشا جمع کر کے پڑھا ئے۔ شب مزدلفہ میں گذرے مزدلفہ کی حد مازمین عرفات سے لے کر قرن محسر تک ہے مازمین اور قرن محسر مزدلفہ سے خارج ہیں۔ یہاں سے امام اور لوگ جمار کے واسطے انگلیوں برابر چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھالیں فجر کے بعد یہاں سے روانہ ہو ... ... ہو فجر کے پہلے آدھی رات کے بعد بھی روانہ ہو سکتا ہے یہاں شب گذرنا رکن حج نہیں ہے اگر چھوڑ دے تو دم سے تلافی ہو سکتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ارکان واجبہ سے ہے یہاں سے چل کر مشعر حرام پہنچے اور دعا کرنے کے لئے تھوڑی دیر میں ٹھہرے یہاں وقوف فرض نہیں ہے پھر منیٰ کو روانہ ہو وہاں پہنچ کر

زوال سے پہلے سات کنکریوں سے جمرۂ عقبہ کی رمی کرے اس کے بعد جو لوگ اپنے ساتھ ہدی لائے ہوں اس کی قربانی کریں پھر حلق یا قصر کریں دونوں درست ہیں لیکن حلق افضل ہے پھر مکہ کی طرف متوجہ ہوں وہاں پہنچکر طواف افاضہ ادا کریں یہ فرض ہے اس سے فارغ ہو کر اگر عرفات سے پہلے سعی نہ کی ہو تو سعی کریں، سعی عرفات سے مقدم کر سکتے ہیں مگر طواف افاضہ مقدم نہیں کر سکتے اس کے بعد منیٰ میں لوٹ آئے اور لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائے نماز پڑھ کر حج کا تیسرا خطبہ کہے اس میں بقیہ مناسک احلال اول وثانی کے احکام اور یہ کہ کون سے احلال سے کیا کیا ممنوع چیزیں ان پر حلال ہو جاتی ہیں بتلائے۔

امیر حج اگر امیر فقیہ ہو تو اعلان کر دے کہ ہر شخص مسئلہ دریافت کر سکتا ہے فقیہ نہ ہو تو یہ اعلان نہ کرے رات منیٰ
ں گذارے گیارھویں کی صبح کو جس دن نفر کی اجازت ہے زوال
ے بعد تینوں جمار کی اکیس کنکریوں سے رمی کرے ہر جمرہ کو سات
ات کنکریاں مارے دوسری شب بھی یہیں رہے اگلے دن (اس
ں بھی نفر کی اجازت ہے) جمار ثلاث کی رمی کرے اور نماز ظہر کے
جو تھا یعنی حج کا آخری خطبہ کہے اس میں بتلائے کہ ایام حج میں دو
کوچ ہیں اللہ تعالیٰ نے دونوں کا اختیار دیا ہے ارشاد ہے۔
اذکروا اللہ فی ایام معدودات فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیہ
ن تاخر فلا اثم علیہ لمن اتقیٰ)۔
جمہ:- چند دن اللہ تعالیٰ کو یاد کرو جس شخص کو دو دنوں میں جانے کی

جلدی ہو وہ گنہگار نہیں اور جو بعد میں وہ بھی گنہگار نہیں۔
اور بتلائے کہ جو شخص آج غروب شمس سے پہلے منیٰ سے چلا جائے گا اس سے شب کا قیام اور کل کی رمی ساقط ہو جائے گی اور جو شخص غروب شمس تک مقیم رہے گا اس کے ذمے شب کا قیام بھی ہے اور کل کی رمی بھی۔

مگر امام حج بہ حیثیت ذمے دار ہونے کے نفر اول سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اس کو چاہیئے کہ شب منیٰ میں گذارے اور دوسرے نفر یعنی کل کے دن حلق کے دن بتاریخ ۱۳ ذی الحجہ رمی جمار ثلاث سے فارغ ہو کر یہاں سے کوچ کرے چونکہ لوگ اس کے متبع ہوتے ہیں لہٰذا مناسک کی تکمیل سے قبل نہ جائے۔

جب نفر ثانی کی اجازت کا وقت ہو جائے تو امام حج کی ولایت ختم ہو جائیگی اور فرائض امامت سے سبکدوش ہو جائے گا ہم پانچ احکام متفق علیہ کو بیان کر چکے۔

چھٹے حکم مختلف فیہ میں تین چیزیں ہیں۔

نزاعات کا فیصلہ (پہلی) یہ کہ اگر کسی حاجی سے ایسا جرم ہوا جس کی سزا تعزیر یا حد ہو تو اگر اس فعل کا حج سے کوئی تعلق نہ ہو تو امام حج تعزیر یا حد کا نفاذ نہیں کر سکتا اور اگر حج سے متعلق ہو تو زجر و تادیب کے لئے تعزیر کر سکتا ہے اور نفاذ حد کے متعلق دو رائے ہیں ایک یہ کہ حد کا نفاذ کرے اس لئے کہ حج سے اس کو تعلق ہے دوسری یہ کہ حد کا نفاذ نہ کرے کیونکہ افعال حج سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

(دوسری) یہ کہ احکام حج کے ماسوائے حجاج کے تنازعات میں کوئی
کم وفیصلہ نہ کرے۔ اور احکام حج سے متعلق نزاعات میں (مثلاً
(عین کا نزاع کفارۂ وطی میں) اور قضائے حج کے واجب ہونے میں)
ام حج کے حکم کی دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ حکم نافذ کرے دوسری یہ
حکم نافذ نہ کرے۔

(تیسری) یہ کہ اگر کسی حاجی سے ایسا فعل سرزد ہو جس سے فدیہ لازم
ے تو اس کی ادائی کا حکم دے آیا اس سے جبراً مدعی بنکر بھی مطالبہ
سکتا ہے یا نہیں اس کی بابت بھی اقامت حدود کی طرح دو قول ہیں۔
حج فقیہہ ہو تو فتویٰ بھی دے سکتا ہے اگرچہ حکم کرنے کا مجاز نہ ہو
م کو جائز افعال سے روکنے کا حق نہیں ہے اگر یہ خیال ہو کہ جاہل
س اس سے ممنوعات پر آمادہ ہو جائیں گے تو رو کدے جیسے طلحہ
عبداللہ نے حج میں سرخ رنگ کا کپڑا پہنا تھا تو حضرت عمرؓ ان پر خفا
ے اور فرمایا" مجھے اندیشہ ہے کہ جاہل تمہارا اتباع کریں گے۔ امام
ں کو اپنے مسلک پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہیں۔ اگر بلا
م باندھے لوگوں کو حج ادا کرائے تو یہ مکروہ ہے۔ مگر
ں کا حج درست ہو جائے گا نماز کو اس پر قیاس نہ کیا
ے غیر مصلی نمازیوں کا امام نہیں بن سکتا حجاج ارکان حج کو
ے مقدم یا موخر ادا کریں تو ادا ہو جائیں گے اگرچہ متبوع کی
ت مکروہ ہے مگر نماز میں امام کی مخالفت سے نماز باطل ہو جاتی ہے
کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز سے مرتبط ہے اور حج امام کے حج
بط نہیں ہوتا۔

حاکِم صَدقات

صدقات وزکات کا مفہوم ایک ہے صرف لفظوں کا فرق ہے مسلمانوں کے مال پر اس کے سوا اور کوئی حق یا محصول واجب نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لیس فی المال حق سوی الزکاۃ - (زکواۃ کے علاوہ مال پر اور کوئی محصول نہیں)

زکوٰۃ کس مال پر واجب ہے؟ زکوٰۃ اس مال پر واجب ہوتی ہے جو خود بڑھتا ہو یا کام کر کے بڑھایا جا سکتا ہو تاکہ صاحب مال کا مال پاک ہو جائے اور ضرورتمندوں کی حاجت روائی ہو - قابل زکوٰۃ کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ظاہر

(۲) پوشیدہ -

ظاہر سے مراد وہ مال ہے جس کا اخفا ممکن نہ ہو جیسے کھیتی، بیل اور چوپائے - پوشیدہ سے مراد وہ مال ہے جس کا اخفا ممکن ہو

جیسے سونا، چاندی اور سامان تجارت۔

مال باطن کے متعلق حاکم زکوٰۃ کو کچھ تعرض کرنے کا حق نہیں ارباب مال خود ادا کرنے کا حق رکھتے ہیں اگر برضا و رغبت حاکم کو دینا چاہیں تو قبول کرے اور تقسیم کرنے میں ان کا معاون ہو۔ اس کے اختیارات مال ظاہر کے ساتھ مختص ہیں ارباب مال کو حکم دیا جائے کہ مال ظاہر کی زکوٰۃ ادا کریں۔ اس حکم کے متعلق اگر حاکم عادل ہو تو دو قول ہیں۔

(۱) یہ کہ حکم ایجاب ہے خود ادا نہیں کر سکتے ادا کر دیں تو ادا نہ ہو گا۔

(۲) یہ کہ حکم استحباب ہے تاکہ اظہار اطاعت ہو اگر خود ادا کر دیں تو ادا ہو جائے گی۔ ان ہر دو قول کے ساتھ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اگر ادائے زکوٰۃ سے انکار کر دیں تو ان سے جنگ کی جائے ابو بکر صدیق رضؓ نے منکرین زکوٰۃ سے جنگ کی تھی وجہ یہ ہے کہ انکار کرنا حکام سے بغاوت کے معنی رکھتا ہے ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر خود ادا کرنے لگیں تو جنگ نہ کی جائے۔

تقرر حاکم کے شرائط اس عہدہ کی شرائط حسب ذیل ہیں۔ حر، مسلمان اور عادل (نیک چلن) وصول کرنے کے لئے مقرر کیا جائے تو ان مسائل سے ناواقف کا تقرر بھی جائز ہے۔ ذوی القربیٰ کو جن پر زکوٰۃ حرام ہے اس عہدے پر مقرر کر سکتے ہیں مگر ان کی تنخواہ مصالحت کے روپے سے دی جائے۔

عہدہ بحیثیت اختیارات کے تین قسم کا ہے۔

(۱) زکوٰۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم کے اختیارات ہوں ان کاموں کو حسب تفصیل آئندہ ایک شخص کر سکتا ہے۔

(۲) وصول کا اختیار ہو تقسیم کا نہ ہو لہٰذا وصول کر سکتا ہے تقسیم کی ماز
ہوگی - جس شخص کو دونوں اختیار ہوں تقسیم میں تاخیر کرنے سے
گنہگار ہوگا اور اگر جلد تقسیم کرنے کے لئے کوئی دوسرا شخص مقر
ہو تو یہ گنہگار ہوگا -

(۳) مطلقاً بلا تعین اختیارات مقرر کیا جائے مثلاً تقسیم کا حکم ہو
اس کی ممانعت - تو اطلاق کی وجہ سے اس کو وصول و تقسیم دونوں
کا اختیار ہوگا -

نصاب صدقات

صدقات دو امر کو مشتمل ہیں -
(۱) وصول -
(۲) تقسیم -

دونوں کے احکام مختلف ہیں جن کو ہم اختصار کے لئے اسی
باب میں بیان کرتے ہیں مال زکات کی چار قسمیں ہیں -

(۱) مواشی یعنی اونٹ گائے اور بکری ان کو مواشی اس لئے کہتے
ہیں کہ یہ مشی کرتے ہیں یعنی چلکر چرتے ہیں اونٹ کا ابتدائی نصاب
پانچ ہے پانچ سے نو تک ایک جذع (بھیڑ کا بچہ) یا ایک ثنی (بکری)
دیا جائے جذع چھ ماہ کی عمر کا ہوتا ہے اور ثنی پورے ایک سال
کا جب دس اونٹ ہو جائیں تو ان میں چودہ[۱۴] تک دو بکریاں اور
پندرہ میں انیس[۱۹] تک تین بکریاں اور بیس میں چوبیس[۲۴] تک چار بکریاں
دی جائیں اور جب پچیس[۲۵] ہو جائیں تو بکریوں کی بجائے اونٹ سے زکات
دے از ایکپیس[۲۵] میں بتیس تک بنت مخاض یعنی ایک سالہ اونٹنی
تو اس لبون بذکر دیا جائے اور چھتیس میں پنتالیس

...ت لبون یعنی دوسالہ اونٹنی دی جائے اور چھیالیس میں ساٹھ
... ایک حقہ یعنی تین سالہ اونٹنی جو نر سے ملنے اور سواری دینے کے
... جو دی جائے اور اکسٹھ میں پچھتر تک ایک جذعہ یعنی چار سالہ
...ٹنی دی جائے اور چھہتر میں نوے تک دو بنت لبون دی جائیں
... اکانوے میں ایک سو بیس تک دو حقہ دئے جائیں اس قدر
...یل تو نص سے ثابت ہے اور اس پر اجماع منعقد ہے مگر ایک سو
... زائد میں فقہا کا اختلاف ہے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس
...ے زائد میں سلسلہ پھر سے شروع کیا جائے امام مالکؒ فرماتے
... کہ اس پر زیادتی کا اعتبار نہیں جب تک ایک سو تیس نہ ہوں
...سو تیس پر ایک حقہ دو بنت لبون دی جائیں۔ امام شافعیؒ
...اتے ہیں جب ایک سو بیس پر ایک زیادہ ہو جائے تو ہر چالیس
...ک بنت لبون اور پچاس پر ایک حقہ دیا جائے لہٰذا ایک سو
...ں میں تین بنت لبون اور ایک سو تیس میں ایک حقہ دو بنت
...ن اور ایک سو پچاس میں تین حقے اور ایک سو ساٹھ میں چار بنت
...ن اور ایک سو ستر میں ایک حقہ تین بنت لبون اور ایک سو
...میں دو حقے دو بنت لبون اور ایک سو نوے میں تین حقے
...بنت لبون اور جب دو سو ہو جائیں تو ان میں جو موجود ہو
...ار حقے یا پانچ بنت لبون لی جائیں اگر دونوں موجود ہوں تو
...لیا جائے بعض کی رائے ہے کہ حقے ہی لئے جائیں ان میں
...ت زیادہ اور وقت کم ہوتی ہے اس سے زائد میں اسی
...ل کر کے ہر چالیس میں ایک بنت لبون اور ہر پچاس میں

ایک حقہ لیا جائے۔

گائے کا ابتدائی نصاب تیس ہے تیس میں ایک تبیع نر یعنی چھ ماہ کا بیل جو ماں کے پیچھے چلنے لگے اگر تبیعہ مادہ دینا چاہے تو قبول کر لی جائے۔ چالیس ہو جائیں تو ان میں مسنہ مادہ لی جائے۔ مسنہ سال بھر کی گائے ہوتی ہے۔ اگر سب نر ہوں تو ایک قول یہ ہے کہ مسن نر قبول کر لیا جائے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ قبول نہ کیا جائے چالیس سے زائد گایوں میں اختلاف ہے ابو حنیفہؒ کی ایک روایت کہ پچاس میں ایک مسنہ اور ربع لیا جائے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ چالیس سے ساٹھ تک کچھ نہیں ساٹھ میں دو تبیعے واجب ہونگے ساٹھ کے بعد ہر تیس میں ایک تبیع اور چالیس میں ایک مسنہ لہٰذا ستر میں ایک مسنہ اور ایک تبیع اور اسی میں دو مسنے نوے میں تین تبیعے ہوں گے۔ سو میں دو تبیعے ایک مسنہ ہوگا ایک سو دس میں دو مسنے ایک سو بیس میں دوسو اونٹوں کی طرح دو صورتیں ہیں یا تو چار تبیعے یا تین مسنے ہوں گے بعض کی رائے ہے کہ عامل کو جو ملے وہی لے لے اگر دونوں موجود ہوں تو افضل کو لے۔ اور بعض کے نزدیک مسنات ہی لے اس سے زائد میں ہر تیس پر ایک تبیع اور ہر چالیس پر ایک مسنہ دیا جائے۔

بکری کا ابتدائی نصاب چالیس ہے چالیس میں سے ایک سو بیس تک ایک جذع یا ایک ثنی ہے اگر سب جذع اور ثنی سے چھوٹی ہوں تو امام شافعیؒ کے مذہب پر ان سے کم عمر بھی لی جا سکتی ہے امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جذع یا ثنی کے سوا نہ لی جائے۔

ایک سو اکیس میں دو سو تک دو بکریاں دو سو ایک میں چار سو تک
تین بکریاں اور جب چار سو ہو جائیں تو چار بکریاں لی جائیں اس
کے بعد ہر سو پر ایک بکری۔ بھیڑ بکری کے حکم میں اور بھینس
گائے کے حکم میں اور بخت اونٹ عربی اونٹ کے حکم میں ہے
کیونکہ جنسیں متحد ہیں مگر اونٹ کو گائے کے اور گائے کو بکری
کے حکم میں شامل نہ کیا جائے۔ ان کی اجناس متحد نہیں ہیں۔

زکوٰۃ کے لئے ایک شخص کا تمام مال جمع کر لیا جائے اگرچہ
اس کے پاس متفرق مال ہوں ایک نصاب کے چند شریک زکوٰۃ
ادا کریں بشرطیکہ شرکت کی شرائط موجود ہوں۔ امام مالکؒ فرماتے
ہیں کہ تا وقتیکہ کوئی شخص مالک نصاب نہ ہو شرکت موثر نہیں
زکوٰۃ نہ لی جائے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ خلط کا کچھ اعتبار نہیں
ہر شخص علیحدہ اپنے مال کی زکوٰۃ دے۔

مواشی میں زکوٰۃ واجب ہونے کی دو شرطیں ہیں۔

۱ شرط یہ ہے کہ چرنے والے ہوں جنگل کی گھانس چرتے ہوں
تاکہ مشقت کم اور نفع و اولاد زیادہ ہو لادو اور کام کرنے
والے یا بقیمت گھانس کھانے والے جانوروں میں امام ابوحنیفہؒ
اور امام شافعیؒ کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں امام مالکؒ
چرنے والوں کی طرح ان میں بھی وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں۔

۲ شرط یہ ہے کہ ان پر ایک سال گذر جائے تاکہ ان میں نسل
ری ہو جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے سال
نے سے پہلے مال میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

ان جانوروں کے چھوٹے بچوں کی زکوٰۃ جو ماؤں کا سال پورا ہونے سے پہلے پیدا ہوں اور ماؤں کا نصاب پورا ہو ماؤں کی زکوٰۃ کے ساتھ تابع کر کے دی جائے۔ اگر ماؤں کا نصاب کامل نہ تھا مگر بچوں کے ملنے سے نصاب پورا ہوگیا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ماؤں کے سال سے زکوٰۃ دی جائے اور امام شافعیؒ کے نزدیک بچے مل کر نصاب پورا ہونے کے بعد سے سال شمار کیا جائے۔

گھوڑوں، خچروں، اور گدھوں میں زکوٰۃ نہیں ہے امام ابوحنیفہؒ چرنے والی گھوڑیوں میں ہر گھوڑی پر ایک دینار واجب کرتے ہیں مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "میں غلام اور گھوڑوں کا صدقہ تم کو معاف کرتا ہوں"

حاکم صدقات کی حیثیت

اگر حاکم صدقات عمال تفویض سے ہو فقہا کی مختلف رایوں میں سے کسی ایک کی رائے پر اپنے اجتہاد کے ساتھ زکوٰۃ لے امام یا ارباب مال کے اجتہاد پر نہ لے نہ امام کو جائز ہے کہ اس کے لئے زکوٰۃ لینے کی مقدار معین کرے۔ اور اگر عمال تنفیذ سے ہو تو مختلف فیہ مقدار میں امام کے اجتہاد پر عمل کرے۔ ارباب مال یا اپنے اجتہاد پر عمل کرنا جائز نہیں۔ امام مقدار زکوٰۃ معین کر دے۔ یہ شخص تحصیل زکوٰۃ کے لئے امام کا قاصد اور اس کے احکام کا نافذ کرنے والا ہوگا یہ عامل غلام اور ذمی بھی ہو سکتا ہے لیکن زکوٰۃ عامہ کے لئے جائز نہیں اس میں ولایت ہے جو کفر اور غلامی کے منافی ہے اور زکوٰۃ خاصہ میں یہ ہے کہ اگر زکوٰۃ کی

مقدار معلوم ہو تو اس کی وصولی کے لئے غلام و ذمی کا تقرر جائز ہے
کیونکہ اس میں کسی قسم کی ولایت نہیں صرف قاصدانہ کارروائی ہے
اور مقدار معلوم و متعین نہ ہو تو اس کی وصولی کے لئے ذمی کا تقرر
جائز نہیں یہ امانت کا معاملہ ہے جس میں اس کی بات پر اعتماد نہیں
ہو سکتا اور غلام کا تقرر جائز ہے۔ اس کی بات قابل قبول ہے۔

عامل صدقات وجوب زکوٰۃ کے بعد عامل صدقات کے آنے میں تاخیر ہو تو اگر تاخیر کام شروع کرنے کے بعد اس وجہ سے ہو کہ وہ اور لوگوں سے وصول کر رہا ہے تو اس کا انتظار کریں کیونکہ بیک وقت سب سے وصولی دشوار ہے یکے بعد دیگرے وصول کر سکتا ہے اور اگر سب سے زکوٰۃ لینے میں تاخیر ہو اور اس وقت معلوم سے زیادہ گزر جائے تو خود اداکریں عامل کو اداکرنے کے اس وقت مامور ہیں جبکہ اس کو اداکر نا ممکن ہو ورنہ مامور نہیں۔ صاحب مال جب خود زکوٰۃ اداکرے اگر خود مجتہد ہو تو اپنے اجتہاد کے مطابق کام کرے اور مجتہد نہ ہو اس کے فتوے پر عمل کرے کسی اور سے فتویٰ لینا لازمی نہیں اگر دو فقیہوں سے فتویٰ لیا ایک نے وجوب زکوٰۃ کا اور دوسرے نے ساقط ہونے کا فتویٰ دیا یا ایک نے کم مقدار اور دوسرے نے زیادہ مقدار بتلائی تو اس صورت کے متعلق اصحاب شافعی میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک جس کے قول کا حکم سخت ہو اس پر عمل کرے اور بعض کی رائے ہے کہ جس کے قول پر چاہے عمل کرے اپنے اجتہاد یا مفتی کے فتوے کے مطابق عمل کرنے کے بعد اگر عامل زکوٰۃ کے لئے آئے اور اس

کے اجتہاد سے ساقط شدہ واجب ہو یا ادا شدہ سے زیادہ واجب ہو تو عامل کے اجتہاد پر عمل ضروری ہوگا بشرطیکہ عامل کے آنے کا امکان باقی ہو۔ اگر امکان کا وقت نکل گیا تو رب المال کا اجتہاد زیادہ نافذ ہوگا۔

عامل کا اجتہاد

اگر عامل نے زکوٰۃ اور اس کے وجوب وانساط میں اپنی رائے واجتہاد پر عمل کر لیا مگر رب المال کے اجتہاد میں ساقط شدہ واجب ہے یا جس قدر اس نے لی ہے اس سے زیادہ واجب ہے تو رب المال کا اپنے اور خدا کے درمیان معاملہ یہ ہے کہ ساقط یا مابقی کو ادا کرے کیونکہ وہ خود مستحقین کے حق کو اپنے اوپر واجب سمجھتا ہے۔

مزید تفصیل

دوسری قسم کے مال جن میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے کھجور اور درختوں کے پھل ہیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہر قسم کے پھلوں میں واجب کہتے ہیں امام شافعیؒ کے نزدیک صرف کھجور اور انگور میں زکوٰۃ واجب ہے ان کے علاوہ سب پھلوں سے ساقط ہے۔ پھلوں میں زکوٰۃ واجب ہونے کی دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ پھل کارآمد اور کھانے قابل ہو جائیں اگر اس سے پہلے کوئی شخص قطع کرے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی مگر زکوٰۃ سے بچنے کے لئے قطع کرنا مکروہ ہے بضرورت مکروہ نہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ پنج وسق تک مقدار ہو اس سے کم میں امام شافعیؒ کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے ایک صاع ۵ ۱/۳ عراقی رطل کا ہوتا ہے امام ابوحنیفہ کے نزدیک کم و بیش سب میں زکوٰۃ واجب ہے امام موصوف

پھلوں کی مقدار کا اندازہ کرنے سے منع کرتے ہیں امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے تاکہ زکوٰۃ کا اندازہ اور مستحقین کا حق معلوم ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کے لئے عمال مقرر کئے تھے آپ ان سے فرماتے تھے اندازے میں تخفیف سے کام لو کیونکہ مال میں وصیت عریّہ واطئہ نائبتہ ہوتی ہیں۔ وصیت وہ جس کو صاحب مال مرنے کے بعد کسی کو دینا چاہیں۔ عریّہ وہ منفعت جس کو اپنی زندگی میں بخشے واطئہ وہ جو راستے میں آنے جانے والے کھائیں۔ واطئہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ زمین کو روندتے ہیں۔ نائبہ وہ آفات جن سے پھل برباد ہو جائیں۔ بصرہ کے پھلوں میں صرف انگور کا اندازہ کیا جائے جس طرح اور مقامات کے انگوروں کا کیا جاتا ہے اور کھجور چونکہ وہاں بکثرت ہوتی ہے اور اندازہ کرنے میں وقت بھی ہے لہٰذا اس کا اندازہ کرنے کی ضرورت نہیں نیز وہاں رواج یہ ہے کہ آمد و رفت والے کھجور کھا سکتے ہیں بصرہ میں یہ دستور مقرر تھا کہ جو پھل درخت سے گر جاتے ان کا بڑا حصہ جمعہ اور منگل کے دن اہل صدقات میں خرچ کر دیا جاتا اور جو بڑے پھل درخت پر رہ جاتے وہ جب بکنے کے لئے بصرہ کے بازار میں آتے تو اب ان سے عشر لیا جاتا چونکہ اہل بصرہ کے سوا اور لوگوں پر یہ ضروری نہیں ہے لہٰذا ان کا حکم ان سے مختلف ہو گیا۔

ازہ

انگور و کھجور کا اندازہ اس وقت کیا جائے جب وہ کار آمد درجہ کو پہنچ جائے یعنی جب بسرا اور عنب ہو جائیں۔ اندازہ کے بعد ان کو تمر اور زبیب ہونے دیا جائے۔ اندازہ لگانے کے بعد یہ معلوم ہو کہ مالک امانت دار ہے مقدار زکوٰۃ کا ضامن

رہے گا تو اس کو کھانے پینے اور تصرف کرنے کی اجازت دی جائے
بعد میں زکوٰۃ وصول کرلی جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بحیثیت
امین کے مال کی حفاظت کرے پھل پکنے پر زکوٰۃ نکالی جائے مقدار
زکوٰۃ کی تفصیل یہ ہے کہ اگر سیرابی نالی یا نہر سے کی جائے دسواں
حصہ ہے اور چرس یا اونٹ پر پانی لاکر سیراب کریں تو بیسواں حصہ
ہے دونوں سے کی جائے تو ایک قول یہ ہے کہ اعلیٰ کا اعتبار ہوگا اور
دوسرا یہ ہے کہ ہر ایک کا حصہ لگا کر لی جائے۔ سیرابی کے متعلق عامل
اور رب المال میں اختلاف ہو تو رب المال کا قول قابل تسلیم ہے
مگر تقویت کے لئے عامل اس کو قسم دے قسم سے انکار کرے تو جس
کا اعتراف کرچکا ہے صرف اسی کی زکوٰۃ لازم ہوگی کھجور کی تمام مختلف
انواع ایک سمجھی جائیں انگور کی مختلف انواع کا حکم بھی یہی ہے کیونکہ
اجناس متحد ہیں مگر کھجور و انگور ایک حکم میں نہیں ہوسکتے دونوں کی
جنسیں مختلف ہیں کھجور و انگور کے پھل خشک کھجور اور منقیٰ ہوجائیں
تو زکوٰۃ بالکل خشک ہونے کے بعد لی جائے اور اگر تازہ توڑے

- - - - - - - - - - - - - - -

جائیں تو فروخت کے بعد قیمت کا دسواں حصہ لیا جائے اگر مستحقین زکوٰۃ
کو تر و تازہ پھلوں کی ضرورت ہو تو ایک قول کے مطابق جس کا حاصل
یہ ہے کہ تقسیم کا مطلب حصہ نکالنا ہے تازہ پھل دینے جائز نہیں۔
اگر اندازہ لگانے کے بعد ادائے زکوٰۃ کے امکان سے پہلے
پھل آفت ارضی یا سماوی سے ضائع ہوجائیں تو زکوٰۃ معاف ہوجائیگی
اور زکوٰۃ کے امکان کے بعد ضائع ہوجائیں تو زکوٰۃ وصول کی

کی جائے گی۔

کھیت تیسری قسم کا مال جس میں زکوٰۃ واجب ہے کھیتیاں ہیں امام ابوحنیفہؒ ہر قسم کی کھیتی میں واجب کہتے ہیں امام شافعیؒ کے نزدیک صرف ان میں واجب ہے جو لوگ کھانے کے ذخیرے بناکر رکھیں لہٰذا ان کے نزدیک سبزی اور ترکاری (البقولات) میں زکوٰۃ واجب نہیں نہ ایسی اشیا میں جو کھانے کے کام نہ آئیں جیسے روئی اور کتان اور نہ وادیوں اور پہاڑوں کی پیداوار میں۔ ان کے نزدیک ان دس قسم کی کھیتیوں سے زکات لی جائے۔ گیہوں، جو، چاول ذرہ باقلا، لوبیا، چنا، اڑد، دخن اور جلبیاں۔ علس ایک قسم کا گیہوں ہے اس کے ساتھ ملایا جائے اس پر چھلکے ہوتے ہیں مع چھلکوں کے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ یہی حکم چاول مع چھلکوں (دھانوں) کا ہے۔ سلت ایک قسم کا جو ہے اس کے حکم میں ہوگا۔ ان دونوں کے سوا اور اجناس ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملائی جائیں۔ امام مالکؒ گیہوں کو اور بقیہ اجناس کو ایک دوسرے کے حکم میں قرار دیتے ہیں۔

کھیتوں کی زکوٰۃ خشک اور پختہ ہونے کے بعد واجب ہوتی ہے لیکن گاہنے اور صاف کرنے کے بعد جبکہ ایک صنف کی مقدار پانچ وسق تک پہنچ جائے زکوٰۃ وصول کی جائے اس سے کم میں واجب نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قلیل وکثیر سب میں واجب ہے اگر مالک ترا اور ہری کھیتی کاٹ لے تو زکوٰۃ واجب نہیں لیکن زکوٰۃ سے بچنے کے لئے ایسا کرنا مکروہ ہے۔ ذمی زمین عشری کا مالک ہو کر اس

کی کاشت کرے تو اس کے حکم میں فقہا کا اختلاف ہے۔امام شافعیؒ
کی رائے ہے کہ نہ عشر لیا جائے نہ خراج امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں
خراج قائم کیا جائے۔جو اس کے مسلمان ہونے سے ساقط نہ ہوگا
ابویوسفؒ فرماتے ہیں جو مقدار مسلمان سے لی جاتی تھی اس کا دوچند
لیا جائے مگر مسلمان ہونے پر دوچند نہ رکھا جائے۔محمد ابن الحسن
اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ مسلمان کے صدقہ کے برابر لیا جائے
دوچند نہ کیا جائے۔

مسلمان زمین خراجی کی کاشت کرے تو امام شافعیؒ کے نزدیک
زمین کے خراج کے ساتھ زراعت کا عشر بھی لیا جائے۔امام ابوحنیفہؒ
فرماتے ہیں دونوں جمع نہیں ہوسکتے صرف خراج لیا جائے۔خراجی زمین
کو کرایہ پر دیا جائے تو خراج مالک پر اور عشر کرایہ دار پر واجب ہوگا
ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ زراعت کا عشر مالک کو دینا ہوگا یہی حکم عمر کا ہے
مال ظاہر کے احکام ختم ہوئے۔

سونا چاندی چوتھی قسم کا مال سونا اور چاندی ہیں یہ اموال باطنہ
سے ہیں ان کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہے نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے " چاندی میں چالیسواں حصہ واجب ہے"
چاندی کا نصاب دوسو درہم ہے ایک درہم اسلامی وزن سے چھ
دانق کا ہوتا ہے دس درہم کا وزن سات مثقال ہے۔دوسو میں پانچ
درہم یعنی چالیسواں حصہ واجب ہے اس سے کم میں واجب نہیں
اور زائد میں اس کے حساب سے دیا جائے۔امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں
دوسو سے زائد میں چالیس تک کچھ نہیں اور چالیس میں ایک چھٹا درہم

بڑھ جاتاہے۔ چاندی کے ٹکڑے اور مضروب سکے ایک حکم میں ہیں۔

سونے کا نصاب اسلامی مثقال سے بیس مثقال ہے۔ چالیسواں حصہ یعنی نصف مثقال دینا واجب ہے اور زائد میں اس کے حساب سے دیا جائے۔ خالص اور مضروب ہونے کا حکم ہے۔ چاندی کو سونے کے ساتھ نہ ملایا جائے۔ ہر ایک کا نصاب الگ الگ اعتبار کیا جائے۔ امام مالکؒ اور ابو حنیفہؒ کی رائے ہے کہ کم کو زیادہ کے ساتھ ملاکر دونوں کی قیمت زیادہ کی قیمت سے لگائی جائے۔ درہم و دینار کی تجارت میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اصل کا سال پورا ہونے پر منافع اس کے تابع کرلیا جائے کیونکہ وجوب زکوٰۃ کے سال گذرنا شرط ہے۔ داؤد کہتے ہیں کہ مال تجارت میں زکوٰۃ نہیں ہے وہ اس رائے میں تمام جماعت سے منفرد ہیں۔

سونے چاندی کے مباح زیورات میں امام شافعیؒ کا قول یہ ہے کہ زکات واجب نہیں۔ امام مالکؒ کا یہی مذہب ہے اور ضعیف قول یہ ہے کہ زکوٰۃ واجب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہی مسلک ہے۔ اور ان کے ممنوع زیورات اور برتنوں میں سب کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہے۔

معادن (کانیں) یہ اموال ظاہری میں داخل ہیں۔ فقہا کا اس میں اختلاف ہے کہ کون سی معدن میں زکوٰۃ واجب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ڈھلنے والی دھات جیسے سونا، چاندی، تانبا، پیتل میں زکوٰۃ واجب ہے اور نہ ڈھلنے والی یعنی رقیق چیزوں [illegible] پتھروں میں واجب نہیں۔ ابو یوسفؒ کے نزدیک زیورات کے

پتھر جواہر وغیرہ میں واجب ہے جبکہ پگھلانے اور صاف کرنے سے مقدار نصاب نکلے زکوٰۃ واجب ہے اس کے اندر مقدار زکوٰۃ میں تین قول ہیں -

(۱) چالیسواں حصہ جمع شدہ سونے چاندی کی طرح -

(۲) پانچواں رکاز کی طرح

(۳) اگر مشقت زیادہ ہو تو چالیسواں اور کم ہو تو پانچواں -

اس میں سال گذرنا شرط نہیں اس منفعت کی فوراً زکوٰۃ دینی چاہیئے -

رکاز وہ مال ہے جو زمانۂ جاہلیت کا مضروب ہو اور کسی بیکار زمین یا راستے میں مدفون ہو یہ مال پانے والے کی ملک ہے اور اس پر پانچواں حصہ واجب ہے جس کو مصارف زکوٰۃ میں صرف کیا جائے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ پانے والے کو اس کے ظاہر کرنے اور پوشیدہ رکھنے کا اختیار ہے ایسے ہی امام کو معلوم ہونے کے بعد اختیار ہے پانچواں حصہ لے یا نہ لے اور جو دفینہ مملوکہ زمین میں دستیاب ہو بظاہر مالک زمین کا مملوک ہے پانیوالے کا کچھ حق نہیں - نہ مالک پر (بجز زکات کے اگر مالک کی طرف سے اس نے ادا کردی ہو) اس کو کچھ دینا ضروری ہے اسلامی دور کے سکے مدفون ہوں یا غیر مدفون اگر دستیاب ہوں تو لقطے کے حکم میں ہیں ایک سال تک اس کا اعلان ضروری ہے مالک آجائے تو فبہا ورنہ پانے والا مالک ہو جائے گا مگر شرط یہ ہے کہ مالک کے معلوم ہونے پر ضمان ادا کردے -

مال زکوٰۃ کا چھپانا | اگر کوئی شخص اپنے مال کی زکوٰۃ پوشیدہ کرے

اور عامل کے باوجود اس کے حق پرست ہونے کے نہ دے تو جب
عامل کو اطلاع ہو سکتا ہے - اگر تحقیق سے پوشیدہ کرنے کی وجہ یہ
معلوم ہو کہ خود ادا کرنا چاہتا تھا، تو سزا نہ دے۔ اور اگر حق اللہ کے
ہضم کرنے کی نیت معلوم ہو تو سزا دے اور واجب سے زیادہ
وصول نہ کرے ۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کا آدھا مال لے لے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص زکوٰۃ ہضم کرے گا
میں اس سے زکوٰۃ اور اس کا آدھا مال لے لوں گا یہ اللہ کا حق ہے
آل محمد کا اس میں کچھ نہیں ۔ مگر حدیث لیس فی المال حق سوی الزکاۃ
بظاہر اس حدیث کے معارض ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ پہلی حدیث ایجاب
پر محمول نہیں، زجر و توبیخ مقصود ہے جیسا کہ آپ (صلعم) کا ارشاد
من قتل عبدہ قتلناہ) زجر و توبیخ کے لئے ہے حالانکہ غلام کے
قصاص میں آقا کو قتل نہیں کیا جاتا۔ اگر عامل صدقات کے لینے میں ظالم ہو
اور تقسیم میں حق پرست ہو تو اس سے پوشیدہ کرنا اور دینا دونوں جائز
ہیں اور اگر لینے میں عدل پرور مگر تقسیم میں ناانصاف ہو تو اس سے زکوٰۃ
پوشیدہ رکھنا واجب ہے پس اگر برضامندی یا بجبر وصول کرے
ارباب مال حق اللہ سے بری نہ ہوں گے ان پر واجب ہے کہ خود
مستحقین کو ادا کریں امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ عادل کو دینا کافی ہے اعادہ
زکوٰۃ واجب نہیں ۔
عامل کا یہ اقرار کہ لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر لی دوران تقرر میں قابل
قبول ہے خواہ عمال تفویض سے ہو یا عمال تنفیذ سے اور عزل کے بعد
دو قول ہیں جن کا مدار اموال ظاہری کی زکوٰۃ کے ان دو قولوں پر ہے

کہ آیا عامل کو زکوٰۃ دینا مستحب ہے یا واجب؟ اگر کہا جائے کہ مستحب ہے تو عزل کے بعد اس کا قول قبول کیا جائے اور کہا جائے کہ واجب ہے تو عزل کے بعد بدون بینہ کے اس کا قول مقبول نہیں اور نہ وصولی کے متعلق اس کی شہادت جائز ہے اگرچہ عدل (نیک چلن) ہو۔

اختلاف رائے

اگر رب المال ادائے زکوٰۃ کا مدعی ہو اور یہ دعویٰ امکان ادا کے بعد باوجود عامل کی تاخیر کے ہو تو قبول کیا جائے لیکن عامل کو بدگمانی ہو تو حلف دے۔ حلف کے متعلق دو رائیں ہیں ایک رائے یہ ہے کہ واجب ہے اگر حلف سے منکر ہو زکوٰۃ وصول کی جائے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ محض تقویت دعویٰ کے لئے حلف سے انکاری ہو تب بھی زکوٰۃ نہ لی جائے اور اگر عامل کے ہوتے ہوئے اس کا مدعی ہو تو اس قول پر کہ عامل کو ادا کرنا واجب ہے اس کا دعویٰ قبول نہ کیا جائے۔ اور اس قول پر کہ عامل کو ادا کرنا مستحب ہے دعویٰ قبول کیا جائے۔

رقم زکوٰۃ کے مستحق

زکوٰۃ کی تقسیم مستحقین میں ہو مستحقین زکوٰۃ کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا

(انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله وابن السبیل فریضة من الله والله علیم حکیم۔

ترجمہ:۔ بیشک صدقات فقیروں، مسکینوں، صدقات کا کام کرنیوالوں، مؤلفۃ القلوب، غلاموں قرضداروں اور فی سبیل اللہ جہاد کرنے والوں اور مسافروں کے لئے ہیں یہ تعیین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔

اس سے پہلے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رائے سے خود تقسیم فرماتے تھے ایک منافق نے گستاخانہ جسارت کی اور یہ کہا "محمد عدل کرو"۔ آپ نے فرمایا تیری ماں تجھے روئے میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون کریگا۔ اس کے بعد مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تقسیم اموال کو کسی مقرب فرشتے یا نبی مرسل کی مرضی پر نہیں چھوڑا خود ہی اس کام کو فرمایا۔ لہٰذا معلوم ہُوا کہ تمام صدقات مواشی۔ کھیتیوں اور پھلوں کے عشر مال و معادن کی زکوٰۃ۔ رکاز کا خمس تقسیم کرنا واجب ہے۔ ہر زکوٰۃ کے آٹھ سہام کئے جائیں کیونکہ آٹھوں مستحقین کو بشرطیکہ موجود ہوں تقسیم کرنا واجب ہے کسی کو چھوڑ نا جائز نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ آٹھوں مستحقین کے ہوتے ہوئے کسی ایک صنف کو دینا جائز ہے سب کو دینا واجب نہیں۔

مگر اللہ تعالیٰ نے سب کو حقدار قرار دیا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض کو دینا کافی نہیں لہٰذا عامل صدقات پر واجب ہے کہ اگر سب اصناف موجود ہوں تو برابر آٹھ حصے کر کے تقسیم کرے۔

فقیر و مسکین ایک حصہ فقراء کو دیا جائے۔ مسکین فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو دوسرا حصہ مساکین کو دیا جائے۔ مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ ناکافی موجود ہو اس سے معلوم ہو گیا کہ فقیر کی حالت مسکین سے گری ہوئی ہوتی ہے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مسکین کی حالت بدتر ہوتی ہے کیونکہ مسکین وہ ہے جس کو عدم نے ساکن کر دیا۔ بہرحال دونوں کو اتنی مقدار دینی چاہیئے کہ جس سے فقر و مسکنت کے درجے سے نکل کر غنا کے ادنیٰ مرتبہ کو پہنچ جائیں۔ مگر اس میں احوال

کا اعتبار ہونا چاہیئے بعض لوگ تو ایک ہی دینار سے غنی ہو جاتے ہیں جیسے
بازار کے لوگ کہ ایک دینار سے بقدر کفایت نفع کما سکتے ہیں۔ لہٰذا ان
کو ایک دینار سے زیادہ نہ دیا جائے اور بعض لوگ سو دینار سے بھی غنی
نہیں ہوتے ان کو اس سے زیادہ دینا بھی جائز ہے اور بعض لوگ جو
کٹے مزدوری پیشہ ہوتے ہیں حسب کفایت کما سکتے ہیں ان کو قطعاً دینا
جائز نہیں اگرچہ ان کے پاس ایک درہم بھی نہ ہو۔

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک

امام ابو حنیفہؒ نے فقیر و مسکین کے لئے
زیادہ سے زیادہ مقدار دو سو درہم
سے کم چاندی اور بیس دینار سے کم سونا تجویز کی ہے تاکہ انھوں نے جو
کچھ لیا ہو اس پر زکوٰۃ لازم نہ آئے ۔ تیسرا حصّہ عمال صدقات کا ہے ان
کی دو قسمیں ہیں ایک عمال تحصیل دوسرے عمال تقسیم ان میں امین اکاؤنٹ
اور چھوٹے بڑے اہل کار سب داخل ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی تنخواہیں بھی
مال زکوٰۃ سے تجویز فرمائی ہیں تاکہ ارباب اموال سے زیادہ وصول نہ کریں
اس مد سے ہر ایک کی تنخواہ کارکردگی کی حیثیت سے دی جائے تنخواہیں
دیکر جو بچ رہے اس کو دوسرے حصہ داروں پر تقسیم کر دیا جائے اور
کمی واقع ہو تو ایک رائے یہ ہے مال زکوٰۃ سے پوری کی جائے اور دوسری
یہ ہے کہ مال مصالحت سے پوری کی جائے ۔

مولفۃ القلوب

چوتھا حصّہ مولفۃ القلوب کا ہے ان کی چار
قسمیں ہیں ۔
(۱) قسم وہ ہیں جن کو مسلمانوں کی اعانت پر آمادہ کرنے کے لئے دیا جائے
(۲) قسم وہ ہیں جن کو سب مسلمانوں کی اذیت سے روکنے کے لئے

دیا جائے۔

(۳) وہ ہیں جن کو دین اسلام کی رغبت دلانے کے لئے دیا جائے۔

(۴) قسم وہ ہیں جن کو اس لئے دیا جائے کہ ان کی قوم اور قبیلہ والے اسلام کی طرف مائل ہوں ان چاروں اقسام میں سے جو مسلمان ہوں ان کو مال زکوٰۃ سے مولفہ کے سہم سے دینا چاہیئے اور جو مشرک ہوں ان کو زکوٰۃ کے بجائے مال مصالحت فئی اور غنیمت سے دینا چاہیئے۔

غلام | پانچواں حصہ غلاموں کا ہے امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مکاتبین کو اتنی رقم دیں جس سے خود کو آزاد کرالیں۔ امام مالک فرماتے ہیں غلام خرید کر آزاد کئے جائیں۔

مقروض | چھٹا حصہ قرضداروں کا ہے ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے اپنی ضروریات کے لئے قرض لیا ان کو اگر غنی نہ ہوں تو اس میں سے دیا جائے۔

دوسرے وہ جنہوں نے مسلمانوں کی مصالح کے لئے قرض لیا ہو ان کو اگر غنی نہ ہوں تو اس میں سے دیا جائے لیکن زیادہ نہ دیا جائے۔

مجاہدین | ساتواں حصہ فی سبیل اللہ کا ہے اس سے مراد مجاہدین ہیں ان کو اس میں سے جہاد کی ضرورت کے موافق دیا جائے۔ چھاؤنی ڈال کر رہنے والے ہوں تو جانے کا اور بقدر امکان وہاں قیام کا خرچ دیا جائے اور اگر جہاد کے واپس آنے والے ہوں تو ضرورت دیا جائے۔

مسافر | آٹھواں حصہ ابن سبیل کا ہے اس سے مراد وہ مسافر

جن کے پاس زادراہ نہ ہو یہ حصہ ان کو بشرطیکہ سفر کسی معصیت کے لئے نہ ہو اس قدر دیا جائے کہ سفر میں کفایت کرے۔ اس میں آغاز سفر کرنے والا اور درمیان سفر والے کو دیا جائے آغاز کنندہ کو نہ دیا جائے۔

آٹھوں قسم کے مستحقین کو زکوٰۃ تقسیم کرنے کے بعد سمجھنا چاہیئے کہ ان کی پانچ حالتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) یہ کہ ان کو بقدر کفایت مل جائے نہ کم ہو نہ زیادہ۔ اس صورت میں مستقین زکوٰۃ سے خارج ہو جائیں گے اب زکوٰۃ طلب کرنا ان پر حرام ہو گا۔

(۲) یہ کہ ناکافی ہو اس صورت میں مستحقین سے خارج نہ ہوں گے بقیہ ضرورت کے لئے کوئی اور تدبیر کی جائے۔

(۳) یہ کہ بعض کے لئے کافی اور بعض کے ناکافی ہو لہٰذا پہلے تو مستحقین سے خارج ہو جائیں گے اور دوسرے خارج نہ ہوں گے۔

مذہب ابوحنیفہ رح

(۴) یہ کہ سب کو کافی پہنچکر ان کے حصہ میں سے بچ جائے لہٰذا سب مستحقین زکوٰۃ سے خارج ہو جائیں گے۔ مابقی صدقہ کو دوسرے لوگوں کے لئے جو قریب تر مقامات میں ہو بھیج دیا جائے۔

(۵) یہ کہ بعض کو پہنچکر ان کے حصوں میں سے بچ جائے اور دوسروں کے حصے ناکافی رہیں لہٰذا اول الذکر مابقی ان کو دیا جائے تاکہ ہر دو فریق کو بقدر کفایت پہنچ جائے۔ اگر آٹھوں اصناف موجود نہ ہوں تو موجودہ کو خواہ وہ ایک ہی صنف ہو زکوٰۃ دی جائے۔ غیر موجود صنف کا حصہ مال کے ہمسایوں کی طرف منتقل نہ کیا جائے مگر محتاجوں کا حصہ

جو بیشتر چھاؤنیوں میں رہتے ہیں دوسرے مقامات پر بھیجا جا سکتا ہے۔
ہر مقام کی زکوٰۃ وہیں کے مستحقین میں صرف کی جائے دوسری جگہ منتقل کرنا
جائز نہیں البتہ اگر وہاں کوئی صنف مستحق نہ ہو تو منتقل کی جائے تو ایک قول
یہ ہے کہ ادا ہو جائے گی اور دوسرا یہ ہے کہ ادا نہ ہوگی یہی مذہب امام
ابو حنیفہؒ کا ہے کافر کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ صرف
صدقہ فطر ذمی کو دینا جائز ہے معاہد کو یہ بھی دینا جائز نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزہ بنو ہاشم بنو عبدالمطلب کو زکوٰۃ
دینا جائز نہیں تاکہ گناہوں کے میل سے پاک رہیں امام ابو حنیفہؒ ان کو
دینا جائز کہتے ہیں۔ غلام، مدبر، ام ولد، اور جس کا بعض حصہ غلام ہو انکو دینا
جائز نہیں۔ شوہر بیوی کو زکوٰۃ نہ دے بیوی شوہر کو دے سکتی ہے امام
ابو حنیفہؒ اس کو ناجائز فرماتے ہیں جس کے ذمے نفقہ واجب ہو اس کو زکوٰۃ
دینا جائز نہیں جیسے باپ یا بیٹا کیونکہ زکوٰۃ دہندہ کی وجہ سے وہ غنی ہوتے
ہیں لیکن اگر یہ لوگ قرضدار ہوں تو قرضداروں کے حصے سے دینا جائز
ہے ان کے علاوہ اور قرابت داروں کو دینا جائز ہے بلکہ ان کو دینا غیروں
سے افضل ہے ایسے ہی مال کے ہمسائے دور والوں سے افضل ہیں اگر
بیت المال عامل کے پاس اپنے عزیزوں کو لاکر مطالبہ کرے کہ میری زکوٰۃ
ان کو دو تو اگر دوسروں کی زکوٰۃ میں اس کی زکوٰۃ مخلوط نہیں ہوئی تو اس
کی زکوٰۃ ان ہی کو دی جائے اور اگر دوسروں کی زکوٰۃ میں مخلوط ہوگئی تو
وہ بھی دوسروں کی طرح مستحق ہوں گے لیکن بالکل خارج نہ کئے جائیں کیونکہ
اس زکوٰۃ میں ایسا حصہ بھی شامل ہے جس کے یہ لوگ زیادہ
حقدار ہیں۔

عامل زکات سے اختلاف

رب المال کو عامل کے متعلق شک ہو اور اس سے مطالبہ کرے کہ تقسیم میرے سامنے کرو تو ایسا کرنا عامل پر لازمی نہیں کیونکہ رب المال اپنی زکوٰۃ عامل کو دے کہ سبکدوش ہو چکا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر رب المال کو تقسیم کے موقع پر حاضر ہونے کا حکم دے تو اس کو حاضر ہونا ضروری نہیں۔ اگر زکوٰۃ قبل از تقسیم عامل کے ہاتھ سے ضائع ہو جائے تو رب المال کی زکوٰۃ ادا ہو گئی تو عامل بھی بشرطیکہ اس کی طرف سے تعدی نہ ہوئی ہو ضامن نہ ہوگا اگر زکوٰۃ عامل کو دینے سے پہلے رب المال کے ہاتھ میں ضائع ہو جائے تو بری نہ ہوگا۔ اعادہ کرے زکوٰۃ دینے قبل مال تلف ہو جائے تو اگر امکان ادا سے قبل تلف ہو زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اور اگر امکان ادا کے بعد تلف ہو ساقط نہ ہو گی۔ رب المال اگر یہ دعویٰ کرے کہ وجوب زکوٰۃ سے قبل میرا مال تلف ہو گیا تو اس کا قول قبول کیا جائے اگر عامل کو بدگمانی ہو تو تقویت کے لئے اس سے قسم لے سکتا ہے۔ عامل کو ارباب اموال سے رشوت لینا جائز نہیں۔ تحائف بھی قبول نہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے عمال کے تحفے بیڑیاں ہیں۔ رشوت اور تحفے میں فرق یہ ہے کہ رشوت مانگ کر لی جاتی ہے اور تحفہ بلاطلب پیش ہوتا ہے۔

عامل کی خیانت

عامل سے خیانت سرزد ہو تو امام اس پر مقدمہ چلائے خود ارباب اموال کچھ نہ کریں ایسے ہی مستحقین زکوٰۃ بھی خصومت نہیں کر سکتے۔ مگر عام حاجتمنداں کی طرح فریاد کے لئے آسکتے اور عامل کے خلاف ان کی شہادت بدگمانی کی

وجہ سے معتبر نہ ہوگی اور ارباب اموال کی شہادت اگر ان سے زکوٰۃ لینے کی بابت ہو تو غیر مقبول ہے اور اگر غیر محل میں صرف کرنے کی بابت ہو تو مقبول ہے اگر ارباب اموال کا دعویٰ ہو کہ ہم نے زکوٰۃ عامل کو ادا کردی عامل اس سے منکر ہو تو ارباب اموال اپنے دعویٰ پر قسم کھاکر بری ہوجائیں گے اور عامل اپنے پر قسم کھاکر بری ہوجائے گا۔ اگر بعض ارباب اموال بعض کے شاہد ہوں کہ انھوں نے زکوٰۃ عامل کو ادا کردی تو اگر یہ شہادت فریقین کے انکار و تخاصم کے بعد ہو تو غیر مسموع ہے عامل سے تاوان وصول کیا جائے اس شہادت کے بعد اگر عامل یہ دعویٰ کرے کہ میں نے اس کو مستحقین میں تقسیم کر دیا تو مقبول نہ ہوگا کیونکہ سابق انکار سے اس دعویٰ کی تکذیب کر چکا ہے اگر مستحقین زکوٰۃ شہادت دیں کہ ہم وصول کر چکے ہیں تو ان کی شہادت بھی غیر مفید ہوگی وہ اپنے سابق انکار سے ان کی بھی تکذیب کر چکے ہیں۔

عامل زکوٰۃ کی وصولی کا اقرار کرے اور مدعی ہو کہ حصہ داروں میں تقسیم کر چکا ہوں مگر حصہ دار انکار کریں تو عامل کا معتبر ہوگا وہ اس کے متعلق امین مانا گیا ہے اور حصہ داروں کے انکار سے یہ ہوگا کہ وہ مستحقین سے خارج نہ ہوں گے کیونکہ ان کی احتیاج و ضرورت باقی ہے۔ حصہ داران زکوٰۃ میں سے جو شخص فقر کا دعویٰ کرے قبول نہ کیا جائے اور نہ بیّنہ تسلیم کی جائے۔

رب المال عامل کے سامنے مقدار زکوٰۃ کا اقرار کرلے اور اپنے مال کی مقدار ظاہر نہ کرے تو اس کے قول پر اعتماد کر کے زکوٰۃ لینا جائز ہے مال حاضر کرنے پر مجبور نہ کرے۔ عامل سے تقسیم زکوٰۃ میں غلطی ہوجائے

مثلاً غیر مستحقین کو زکوٰۃ دے دے تو اگر مالداروں کو جن کا مال مخفی رہ سکتا ہے زکوٰۃ دی تو ضامن نہ ہو اور اگر ذوی القربیٰ، کفار اور غلاموں کی جن کی حالت مخفی نہیں رہتی زکوٰۃ دے تو ضامن ہونے میں دو قول ہیں اور اگر تقسیم زکوٰۃ میں رب المال نے غلطی کی تو ان کو دینے میں جن کی حالت ظاہر ہوتی ہے جیسے ذوی القربیٰ وغیرہ ضامن ہوگا اور ان کو دینے میں جن کی حالت مخفی ہوتی ہے (جیسے دولتمند) ضمانت کے متعلق دو قول ہیں لیکن ضمان کے ساقط ہونے میں عامل کے لئے قدرے وسعت ہے اس کے مشاغل اور مصروفیت زیادہ ہوتی ہے لہٰذا بصورت غلطی اس کا عذر زیادہ قابل سماعت ہوگا۔

فئی اور غنیمت

فئی اور غنیمت وہ مال ہیں جو مشرکین سے حاصل ہوں یا مشرک ان کے حصول کا سبب ہوئے ہوں ۔ ان دونوں مالوں کا حکم مختلف ہے ۔ اور صدقات سے چار وجوہ میں ممتاز ہیں ۔

(۱) صدقات مسلمانوں سے ان کا مال پاک کرنے کے واسطے لئے جاتے ہیں مال فئی اور غنیمت کفار سے انتقاماً لئے جاتے ہیں ۔

(۲) صدقات کا مصرف منصوص ہے اجتہاد کو اس میں کچھ دخل نہیں اور مال فئی اور غنیمت اجتہاد کے مطابق صرف ہوتے ہیں ۔

(۳) صدقات کو ارباب اموال خود مستحقین میں صرف کر سکتے ہیں اہل فئی اور اہل غنیمت مال کو خود مستحقین میں صرف نہیں کر سکتے بلکہ اہل اجتہاد حکام اپنے اختیار سے صرف کریں گے ۔

(۴) ہم عنقریب تبلائیں گے کہ دونوں کے مصرف جدا جدا ہیں ۔

اتفاق واختلاف | فئی اور غنیمت میں دو امر بہ الاتفاق اور دو ما بہ الاختلاف یہ ہیں ۔

(۱) دونوں کفر کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں۔
(۲) دونوں کے خمس کا مصرف ایک ہے۔ مابہ اختلاف یہ ہیں۔
(۱) مال فیئ برضامندی لیا جاتا ہے مال غنیمت جبراً لیا جاتا ہے۔
(۲) مال فیئ کے چار خمس کا مصرف مال غنیمت کے چار خمس کے مصرف سے جدا ہے ہم اس کو انشاء اللہ آگے چل کر بیان کریں گے۔ اب ہم فیئ کی تفصیل شروع کرتے ہیں جو مال کفار سے بدون قتال اور چڑھائی کے حاصل ہو جیسے مال صلح، جزیہ، ان کی تجارت کا عشر اور جس کے حاصل ہونے کا سبب ان کا ڈر سے ہو جیسے مال خراج اس کا خمس اہل خمس یعنی پانچ حصول پر تقسیم کیا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں فیئ میں خمس نہیں ہے مگر ان کا یہ قول نص قرآنی کے خلاف ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ما افاء اللہ علیٰ رسولہ من اھل القریٰ فللّٰہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل۔

ترجمہ:۔ جو مال اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو اہل قریٰ سے دلائے وہ اللہ رسول، ذوی القربیٰ، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔

خمس کے پانچ حصے

لہٰذا خمس کے پانچ مساوی حصے کئے جائیں ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ کی حیات میں تھا جس میں سے آپ خود پر اپنی بیبیوں پر نیز اپنی اور مسلمانوں کی مصالح میں صرف فرماتے تھے آپ کی وفات کے بعد علماء میں اختلاف ہے جو لوگ میراث انبیاء کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپ کے وارثوں کو دیا جائے۔ ابو ثور کہتے ہیں کہ امام کو ملنا چاہیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ آپ کا قائم مقام ہے امام ابو حنیفہؒ فرماتے

ہیں کہ آپ کی وفات کے بعد ساقط ہو گیا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی مصالح میں صرف کیا جائے جیسے فوج کی تنخواہیں، سواریوں، اور ہتھیاروں کی خرید، قلعوں اور پلوں کی تعمیر، قاضیوں اور اماموں کی تنخواہیں وغیرہ جن میں مسلمانوں کی آسائش و راحت ہو۔ دوسرا حصہ ذوالقربیٰ کا ہے۔ ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اب ان کا حصہ بھی ساقط ہو گیا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک باقی ہے۔ ذوالقربیٰ سے مراد صرف عبد مناف کی اولاد بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب ہے دوسرے قریشی داخل نہیں۔ اس حصے کی تقسیم میں چھوٹے بڑے مالدار مفلس سب برابر ہیں کیونکہ قرابت کے نام سے دیا گیا ہے مگر مرد کا حصہ عورت دوچند ہے ان کے غلاموں اور لڑکیوں کی اولاد کا اس میں کچھ نہیں ہے جو شخص حصول مال کے بعد تقسیم سے قبل مر جائے اس کا حصہ اس کے وارثوں کو دیا جائے۔ تیسرا حصہ ضرورتمندوں یتیموں کا ہے۔ یتیم کے معنی ہیں باپ کا مر جانا اس میں لڑکا اور لڑکی مساوی ہیں بلوغ کے بعد یتیم نہیں کہلاتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لایتم بعد الحلم (بلوغ کے بعد یتیم نہیں ہے) چوتھا حصہ مسکینوں کا ہے وہ اہل فیئی ہیں جن کو بقدر کفایت میسر نہ ہو مساکین فیئی مساکین صدقات کے علاوہ ہیں کیونکہ دونوں کے مصرف میں اختلاف ہے۔ پانچواں حصہ ابن سبیل کا ہے یہ وہ اہل فیئی مسافر ہیں جن کے پاس زادراہ نہ ہو سفر کا آغاز کرنے والے اور دوران والے برابر ہیں۔ خمس کی تقسیم کا حکم ختم ہوا۔

مصالح عامہ

بقیہ چار خمس کی تقسیم میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ وہ صرف لشکر کے لئے ہیں ان سے تنخواہیں جاری کی جائیں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں۔

دوسرا یہ کہ مسلمانوں کی مصالح عامہ فوج کی تنخواہوں اور جو کام مسلمانوں کے لئے ضروری ہوں ان میں صرف کئے جائیں فئی کو اہل صدقات میں اور صدقات کو اہل فئی میں خرچ کرنا جائز نہیں - ہر ایک کو اس کے مستحقین میں صرف کیا جائے - اہل صدقہ وہ ہیں جو نہ مہاجر ہوں نہ مجاہد اور سلطنت کی حمایت کرنے والے اہل فئی وہ ہیں جو مہاجر ہوں اور سلطنت و قوم کے محافظ اور دشمنوں سے جہاد کریں - ابتداءً مہاجر اس کو کہتے ہیں جو اپنا چھوڑ کر اسلام کی طلب میں مدینہ آجاتا اور جو پورا قبیلہ مسلمان ہو کر ہجرت کر جاتا اس کو بررہ کہتے ہیں اور اگر قبیلہ کے بعض لوگ مسلمان ہو کر ہجرت کرتے ان کو خیرہ کہتے تھے یہ دونوں قسم کے مہاجرین پائے جاتے تھے فتح مکہ کے بعد ہجرت کا حکم ساقط ہو گیا اور مسلمانوں کی دو قسمیں ہو گئیں - ایک مہاجرین دوسرے اعراب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اہل صدقہ کو اعراب اور اہل فئی کو مہاجرین کہتے ہیں یہ بات ان کے اشعار سے بھی ثابت ہے (بحر سریع)

قد لفها الليل بعصلبي | اروع خراج من الدوي

مهاجر ليس باعرابي

ترجمہ :- اس اونٹنی سوار بہادر پر رات چھا گئی جو جنگل سے نکلا چلا جا رہا تھا اور مہاجر تھا اعرابی نہ تھا -

چونکہ دونوں فریق مختلف ہیں لہٰذا دونوں کے مال میں بھی امتیاز رکھا جائے - امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دونوں برابر ہیں اس لئے ہر ایک کا مال دوسرے فریق پر صرف کرنا جائز ہے -

امام کا اختیار تمیزی | اگر امام کے نزدیک مسلمانوں کی مصلحت مد نظر

رکھ کر کسی قوم کی ہمدردی حاصل کرنے کی ضرورت ہو (جیسے قاصد اور مولفہ) تو ان کو مال فئی میں سے کچھ دے سکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے روز بعض مولفہ کو عطیات دیئے ہیں چنانچہ عینیہ بن حصین کو سو اونٹ اقرع بن حابس کو سو اونٹ عطا فرمائے اور عباس بن مرداس کو پچاس اونٹ جس پر اس نے آپ سے ناراض ہو کر یہ شعر پڑھے ۔

(بحر متقارب)

کانت نھابا تلاتیتھا ۔۔۔ مکوی علی المھر فی الاجرع

وایقاظی القوم ان یرقدوا ۔۔۔ اذا ھجع القوم لم اھجع

فاصبح نہبی ونھب العبید ۔۔۔ بین عنیۃ والاقرع

وقد کنت فی الحرب ذاقدرۃ ۔۔۔ فلم اعط شیئا ولم امنع

والا افائل اعطیتھا ۔۔۔ عدیہ قوائمھا الاربع

فما کان حصن ولا حابس ۔۔۔ یفوقان مرداس فی مجمع

ولا کنت دون امرئ منھما ۔۔۔ ومن تضع الیوم لا یرفع

ترجمہ :۔ یہ غنیمت آپ کو میری بہادری اور ریگستان میں گھوڑے دوڑنے سے ملی ہے جب لوگ سو جاتے تو میں نہ سوتا تھا بلکہ دوسروں کو جگاتا مگر ثمرہ یہ ملا کر عینیہ اور اقرع کے سامنے مجھے غلاموں کے برابر حصہ دیا گیا لڑائی میں شرکت کا اختیار تھا دینے لینے کی نوبت ہی نہ آتی ۔ اگر میں نہ لڑتا تب بھی چند چوپائے مل جاتے حصن اور حابس کا رتبہ مرداس سے زیادہ تو نہیں اور میں ان سے کم رتبہ ہوں جو آج ذلیل ہوا وہ کبھی عزت نہ پائے گا۔

رسولؐ اور افعل علیؓ

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا جاؤ اس کی زبان کاٹ دو ۔

حضرت علیؓ گئے تو ان سے پوچھا کیا تم میری زبان کاٹو گے؟ آپ نے فرمایا نہیں تجھے اتنا دوں گا کہ تو خوش ہو جائے آپ نے اس کو عطا کیا قطع زبان سے یہی مقصود تھا۔

حضرت عمرؓ کا واقعہ

اگر انعامات کے دینے میں مسلمانوں کی کوئی مصلحت نہ ہو صرف معطی کا نفع ہو تو خود اس کے مال میں سے محبوب ہوں گے کہتے ہیں ایک اعرابی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور یہ شعر پڑھے۔ (بحر سریع)

یا عمر الخیر جزیت الجنۃ　　اکس بُنَیّاتی و امہنہ
وکن لنا من الزمّان جُنّۃ　　اقسم باللہ لتفعلنہ

ترجمہ:۔ اے نیکو کار عمر تجھے جنّت نصیب ہو میری بچیوں اور ان کی ماں کو کپڑے پہنا دے اور زمانے کے حملہ کے وقت تو ہماری ڈھال ہو جا تجھے قسم ہے اللہ کی ایسا ہی کر۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر میں نے نہ کیا تو کیا ہوگا اعرابی نے کہا مصرع

اذا ابا حفص لاذھبنہ

ترجمہ:۔ اے ابو حفص میں چلا جاؤں گا۔

آپ نے پوچھا جب تو چلا جائے گا تو کیا ہوگا۔ اس نے عرض کیا۔

یکون عن حالی لتسأ لنہ　　یوم تکون الاعطیا ھُنہ
والموقف للمسئول بینھنہ　　اما الی نار واما جنہ

ترجمہ:۔ جس روز باز پرس ہو رہی ہوگی اور ہر شخص کا ٹھکانہ دوزخ یا جنت ہوگا تم سے میری بابت سوال ہوگا۔

کہتے ہیں یہ سن کر حضرت عمرؓ اتنے روئے کہ ریش مبارک تر ہو گئی

ریا لڑکے میرا کرتا اس کو دیدو اور یہ اس دن کے خوف سے دیتا ہوں
ں کے شعروں کی وجہ سے نہیں خدا کی قسم میں اس سے زیادہ کا مالک
نہیں ہوں چونکہ اس کی منفعت ان کی ذات تک محدود تھی مصالح عامہ سے
و تعلق نہ تھا اس لئے آپ نے اپنے ہی مال سے عطا فرمایا مسلمانوں کے
ے سے نہیں دیا ۔ یہ اعرابی اہل صدقہ میں داخل ہو سکتا تھا مگر یوں معلوم
ہوتا ہے کہ یا تو حضرت عمرؓ نے اس کے اشعار کی وجہ سے (جنھوں نے اس کو
سوال پر آمادہ کیا) نہیں دیا یا اس لئے کہ صدقہ ہمسایان مال کے صرف کا تھا
اعرابی ان سے خارج تھا ۔ غالباً حضرت عثمانؓ سے لوگوں کے بھڑکنے کی وجہ
یہی تھی کہ انھوں نے ہر قسم کے عطایا مال فئی میں سے دئے اور دونوں
وں میں امتیاز نہ رکھا ۔

امام اور فئے امام اپنی اولاد نرینہ کا فئی میں سے وظیفہ مقرر کر سکتا
ہے کیونکہ وہ اس کے مستحق ہیں اگر بچے ہوں تو بچوں
معاش میں ان کو مقدم رکھا جائے گا ۔) اور بڑے ہوں تو یہ بھی اور
لوگوں کی طرح اس کے مستحق ہوں گے ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ
عبداللہ بن عمرؓ بالغ ہوئے تو اپنے والد عمرؓ بن الخطاب کی خدمت میں
حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا وظیفہ مقرر کر دیجئے آپ نے دو ہزار مقرر
کیا ان کے بعد ایک انصاری لڑکا حاضر ہوا اس نے بھی یہی خواہش کی
آپ نے اس کے لئے تین ہزار مقرر کیا ۔ عبداللہؓ نے عرض کیا امیر المومنین
آپ نے میرے لئے دو ہزار اور اس کے لئے تین ہزار مقرر فرمایا ہے
اس کے باپ نے اسقدر کار نمایاں نہیں کئے جتنے آپ نے کئے
آپ نے فرمایا بیشک میں نے دیکھا کہ تمہارا نانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم

سے لڑتا تھا اور اس کا نانا آپ کے ساتھ مل کر لڑتا تھا اور ماں کا حصّہ ایک ہزار سے زیادہ ہے۔

غلاموں کی وجہ سے آقا کا حصّہ امام کو اپنی لڑکیوں کو مال غنیمت سے دینا جائز نہیں یا اولاد خود اس کی تنخواہ میں شریک ہے غلام خواہ امام کے ہوں یا دوسروں کے اگر شریک جنگ نہ ہوں تو ان کے مصارف ان کے آقا کے ذمہ ہیں اور اگر یہ لوگ شریک جنگ ہوں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کو حصّہ دیتے تھے امام شافعیؒ عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو اختیار کرتے ہوئے غلاموں کو دیتے البتہ ان کی وجہ سے ان کے آقاؤں کا حصّہ لگاتے ہیں کیونکہ متعلقین کے اعتبار سے عطا میں کمی بیشی ہو سکتی ہے اگر آزاد کر دیئے جائیں تو ان کا علیحدہ حصّہ لگانا جائز ہے۔ اہل فیئ کے نقیبوں کو دینا جائز ہے مگر ان کے عمال کو دینا جائز نہیں اس لئے کہ نقیب اہل فیئ میں داخل ہیں اور عمال اپنے کام کی اجرت پاتے ہیں ذوالقربیٰ یعنی ہاشمی یا مطلبی فیئ کا عامل ہو سکتا ہے۔ مگر صدقات کا عامل ہونا یا تنخواہ جائز نہیں۔ بلا تنخواہ کام کرے تو جائز ہے اس لئے کہ صدقات ان پر حرام ہے اور فیئ حرام نہیں۔ عامل فیئ کو وصول شدہ سرمایہ بلا اجازت تقسیم کرنا جائز نہیں۔ اور عامل صدقات جب تک ممانعت نہ کی جائے بلا اجازت تقسیم کر سکتا ہے۔ اس کی وجہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ فیئ کے مصارف اجتہاد امام پر موقوف ہیں اور صدقات کے مصارف نص قرآنی سے معین ہیں عامل فیئ میں امانت و شجاعت کے ساتھ ایک صفت ہونی چاہئیے جو اختلاف ولایت سے بدلتی رہے گی اس صفت کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) یہ ہے کہ اموال فئی کا مقرر کرنا جن جن مقامات پر ضرورت ہو ان پر جزیہ و
خراج قائم کرنا۔ لہٰذا ایسے عامل کے تقرر کی یہ بھی شرط ہے کہ ہر مسلمان
احکام شریعت میں مجتہد اور حساب و مساحت میں ماہر ہو۔

(۲) قسم یہ ہے کہ تمام اموال فئی کی تحصیل و وصولی کے لئے مامور ہو اس کے
تقرر کی تین شرطیں ہیں۔ اسلام، حریت، اور مہارت حساب و مساحت
فقیہ و مجتہد ہونا شرط نہیں اس لئے کہ اس کا کام صرف مقرر شدہ محاصل
کا وصول کرنا ہے۔

) قسم یہ ہے کہ اموال فئی کی کسی خاص نوع کے لئے مامور ہو تو اگر اس کو
ب بنانے کی ضرورت بھی ہو تو اسلام و حریت اور مہارت حساب و مساحت
ی شرط ہے چونکہ اس میں حکومت و ولایت ہوتی ہے اس لئے ذمی یا غلام
رر کرنا جائز نہیں ہاں اگر اس کی نیابت کی ضرورت نہ ہو تو ذمی یا غلام
مقرر کرنا جائز ہے کیونکہ یہ صورت محض قاصدانہ ہے۔ مگر ذمی کے تقرر
رت میں یہ ہے کہ اگر اس کے متعلق ذمیوں کے معاملات ہوں جیسے
اور ان کے مالوں کے عشر کی وصولی تو ذمی کا تقرر جائز ہوگا۔ اور اگر
نوں کے معاملات ہوں جیسے خراجی زمینوں کا جو مسلمان کے قبضہ میں
خراج وصول کرنا تو ذمی کے تقرر میں دونوں امر ہیں (یعنی جواز اور
واز) جب عامل کی حکومت باطل کر دی جائے مگر وصولی سے نہ روکا جائے
ر و لبطلان حکومت کے اگر مال فئی وصول کرے گا تو ادا کرنے والا سبکدوش
ے گا۔ اس لئے کہ لینے والے کو وصولی کی اجازت ہے اگرچہ اس کی
ت نہیں رہی مگر ولی بحیثیت قاصد کے کر سکتا ہے جو شخص اس کی برطرفی
ں کو جانتے ہوئے محصول ادا کرے گا بری نہ ہوگا۔ اور نہ جاننے کی

شکل میں وکیل کی طرح دونوں شکلیں ہیں۔

اقسام واحکام | غنیمت کی اقسام واحکام فئی کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔ غنیمت اصل اور فئی فرع ہے غنیمت عام الحکم ہے اس کی چار قسمیں ہیں۔ اسریٰ۔ سبی۔ اراضی۔ اموال۔ اسریٰ سے مراد وہ لڑنے والے مرد کفار ہیں جن کو مسلمان زندہ گرفتار کرلیں۔ ان کے حکم میں فقہا کا اختلاف ہے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ لوگ کفر پر قائم رہیں تو امام یا نائب امام حسب مصلحت ان چار امور میں سے ایک کو اختیار کرسکتا ہے۔

(۱) قتل کرنا۔

(۲) غلام بنانا۔

(۳) مال یا قیدیوں کے فدیے میں چھوڑنا۔

(۴) بلا فدیہ لئے بطور احسان کے چھوڑنا۔ اگر اسلام قبول کرلیں تو قتل ساقط ہے باقی تین امور میں اختیار ہے امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کو تین امور کا اختیار ہے۔ قتل کرنا۔ غلام بنانا۔ مردوں کے فدیئے میں چھوڑنا عورتوں کے فدیئے میں یا احسان رکھ کر بلا فدیہ چھوڑنے کا اختیار نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ دو امر کا اختیار ہے۔ قتل کرے یا غلام بنائے اور احسان رکھ کر یا مال کے فدیہ پر چھوڑنے کا اختیار نہیں ہے۔ مگر قرآن شریف سے ان ہر دو امر کا اختیار بھی ثابت ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(فاما منًّا بعد واما فداءً حتیٰ تضع الحرب اوزارھا)

ترجمہ:۔ اب احسان یا فدیہ یہاں تک کہ لڑائی اپنے اوزار ڈال دے۔

بدر کی لڑائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوعزہ جمحی کو منت

احسان رکھ کر اس شرط پر چھوڑا تھا کہ پھر نہ لڑے۔ مگر احد کی لڑائی میں پھر شریک ہو کر قید ہوا آپ (صلعم) نے قتل کا حکم دیا اس نے، کہا مجھ پر احسان کر دو آپ نے فرمایا لا یلدغ المومن من جحر مرتین مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا) پھر آپ کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

جب نضر بن الحارث بدر کی جنگ میں شریک ہونے کی وجہ سے مقام صفرا میں قتل کر دیا گیا تو فتح مکہ کے دن اس کی بیٹی قتیلہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے حضورؐ کو یہ شعر پڑھ کر سنائے (بحر کامل)

یا راکبا ان الاثیل منظنة — عن صبح خامسة وانت موفق

ابلغ به میتا فان تحیة — ما ان تزال بها الرکائب تخفق

منی الیه وعبرة مسفوحة — جادت لما تحمها واخری تخفق

امحمد یا خیر ضنئ کریمة — فی قومها والفحل فحل معرق

النصر اقرب من قتلت قرابة — واحقهم ان کان عتق یعتق

ماکان ضرک لو مننت وربما — من الفتی وهو المغیظ المحنق

ترجمہ:۔ اے شتر سوار تو آج سے پانچویں صبح کو خیریت کے ساتھ بویوں کے ٹیلے کے پاس پہنچے گا وہاں جو شخص دفن ہے تو اسے میرا سلام پہنچا نا کیونکہ شتر سوار اکثر یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ میرے اس سلام کے ہمراہ تو میرے آنسو چکیدہ کا بھی تحفہ لیتا جا۔ اے محمد میں تم سے کیونکہ تم ماں اور باپ دونوں جانب سے اشرف ہو کہتی ہوں کہ تمہارے قتل کردہ لوگوں میں نضر تمہارا سب سے عزیز تھا اور اگر غلام کی آزادی کا دستور ہے تو وہ سب سے زیادہ آزادی کا حقدار تھا۔ اگر آپ احسان رکھ کر اسے چھوڑ دیتے تو آپ کا کچھ نہ بگڑ جاتا بلکہ بسا اوقات باوجود غیظ و غضب اور کینہ پروری کے احسان ہی

کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اشعار سن لیتا تو نفر کو قتل نہ کرتا۔ اگر احساناً چھوڑنا ناجائز نہ ہوتا تو آپ (صلعم) ایسا نہ فرماتے آپ کے اقوال شرعی احکام ہوتے ہیں۔

فدیہ

فدیہ کے متعلق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑا ہے ان کے بعد ایک آدمی کو دو کے عوض چھوڑا ہے۔ مذکورہ بالا چار اختیارات کو استعمال کرنے کے لئے امام کو چاہیئے کہ قیدیوں کو حسب ذیل حالات کی تفتیش کر کے اپنی رائے اور اجتہاد سے کام لے جو شخص نہایت قوی ہیکل اور شدت سے لڑتا ہو اور اس کے مسلمان ہونے سے مایوسی ہو نیز یہ خیال ہو اس کا قتل اس قوم کے ضعف کا موجب ہوگا تو اس کو باندھ کر قتل کر دے مثلہ نہ کرے جو شخص قوی مضبوط کام کے قابل ہو اور اس کے متعلق اطمینان ہو کہ یہ نہ خائن ہے نہ خبیث باطن رکھتا ہے تو اس کو مسلمانوں کی اعانت کی غرض سے غلام بنالے جس کے مسلمان ہونے کی امید ہو یا اسی قوم کا سردار ہو جس کے چھوڑنے سے خود اسلام لانے کی یا اس کے قوم کے مانوس ہونے کی امید ہو کہ اس کو احساناً چھوڑ دے تاکہ مسلمانوں کی تیاری اور قوت کا موجب ہو۔ یا اگر اس کے خاندان میں مسلمان مرد یا عورت اسیر ہوں تو ان کے عوض میں چھوڑ دے۔ بہر حال احتیاط و مصلحت کے موافق یہ چاروں اختیارات استعمال کر سکتا ہے۔ فدیہ مالی مال غنیمت ہے اس میں شامل کر دیا جائے قید کرنے والے مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے اسیروں کا فدیہ قید کرنے والوں کو اس آیت کے نزول سے پہلے

دیا تھا جس سے غنیمت کو غانمین میں تقسیم کرنے کا حکم ثابت ہوتا ہے۔

معذور و مجبور ہرم کو پہنچے ہوئے بوڑھے یا لنجے یا تارک الدنیا راہبوں اور گرجا نشینوں کے متعلق یہ ہے کہ اگر لڑنے والوں کے مشوروں سے اعانت کرتے ہوں یا لڑائی پر بھڑکاتے ہوں تو موقع ملنے پر ان کو قتل کرنا جائز ہے اسیر ہونے کے بعد ان کا حکم لڑنے والوں کا ہوگا اور اگر مشورے اور بھڑکانے کا کام نہ کرتے ہوں تو ان کے قتل کے جواز میں دو قول ہیں۔

اسیران جنگ سبیّ سے مراد عورتیں اور بچے ہیں اگر اہل کتاب ہوں تو ان کا قتل جائز نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت فرمائی ہے۔ لونڈی غلام بنا کر مال غنیمت کے ساتھ تقسیم کر دی جائیں عورتیں اگر اہل کتاب کے سوا کسی اور قوم سے ہوں جیسے دہریئے۔ بت پرست اور اسلام نہ لائیں تو امام شافعیؒ کے نزدیک قتل کر دی جائیں مگر ماں اور اس کی اولاد میں جدائی نہ کی جائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا تولہ والدۃ من ولدھا (ماں کو اولاد سے غافل نہ کیا جائے۔

سبی کو فدیہ مال لے کر چھوڑنا جائز ہے یہ تبادلہ بیع کے حکم میں ہے اور ان کا فدیہ بجائے مال غنیمت ہوگا۔ امام کے ذمے یہ ضروری نہیں کہ ان کو چھوڑنے کے بعد غانمین کو مال مصالحت سے روپیہ دے کر خوش کرے اگر مسلمان اسیروں کے فدیے میں ان کو چھوڑے تو غانمین کو مال مصالح سے اس کا معاوضہ دیا جائے۔ اگر بلا فدیہ لیئے رہا کرے تو غانمین کی خوشنودی ضروری ہے یا تو وہ اپنے حقوق معاف کر دیں یا ان کو مالی معاوضہ دیا

جائے۔ اگر یہ رہائی مصلحت عامہ کی وجہ سے کی جائے تو مال مصالحت سے معاوضہ دیا جائے اور اگر اپنی ذاتی ضرورت سے کرے تو اپنے پاس سے معاوضہ دے۔ اگر غانمین میں سے کوئی شخص اپنا حق چھوڑنے پر آمادہ آمادہ نہ ہو تو اس پر جبر نہ کیا جائے مگر امیر کا یہ حکم نہیں ان کو بلا فدیہ چھوڑنے کی صورت میں غانمین کی رضامندی ہونا ضروری نہیں وجہ یہ ہے کہ اسری کا قتل مباح ہے اور سبی کا قتل ممنوع اس لئے سبی مال غنیمت (اور غانمین کا حق) ہے اس بلا خوشنودی دست بر داری ہو سکتی قبیلہ ہوازن کی عورتیں اور بچے جنگ حنین میں گرفتار ہوئے اور جب تمام مال اور سبی تقسیم ہو گئے اس کے بعد ان کے وفود نے آکر مراحم خسروانہ کی درخواست کی اور تعلق رضاعت یاد دلایا حلیمہ رضؓ اسی خاندان سے تھیں۔ ابن اسحٰق بیان کرتے ہیں کہ جب ہوازن کی عورتیں اور بچے گرفتار ہو گئے تو ان کے وفود مسلمان ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ اس وقت جعرانیہ میں تشریف فرما تھے عرض کیا یا رسول اللہ ہم خاندان والے اور شریف ہیں ہماری مصیبت آپ سے مخفی نہیں ہم پر احسان کیجئے اللہ آپ پر احسان فرمائے پھر ان میں ابو صرد زہیر بن صرد نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ان میں آپ کی پھوپھیاں، خالائیں اور گود میں لینے والی اور آپ کی پرورش کرنے والی ہیں۔ اگر ہم حارث بن ابی شمر یا نعمان بن منذر کو پرورش کرتے اور اسی قسم کا واقعہ پیش آتا تو ہمیں امید ہے کہ وہ ہم پر کرم و مہربانی فرماتے مگر آپ ان دونوں سے بہتر ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہیں اپنی عورتیں اور بچے محبوب ہیں یا اپنا مال" انھوں نے عرض کیا آپ نے دونوں میں اختیار

دیا ہے تو ہمارے بچے اور عورتیں واپس دیدیجئے وہ ہمیں زیادہ محبوب ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو میرے اور بنو مطلب کے حصے میں آئے وہ میں نے تمہیں دیدیئے۔ قریش نے کہا ہم نے اپنا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا۔ انصار نے کہا ہم نے اپنا حصہ رسول اللہ (صلعم) کو دیا۔ اقرع بن حابس نے کہا میں بنو تمیم نہیں دیتے۔ عینیہ بن حصن نے کہا میں اور بنو فزارہ نہیں دیتے۔ عباس مرداس سلمی نے کہا میں اور بنو سلیم نہیں دیتے بنو سلیم نہیں دیتے بنو سلیم نے کہا ہم اپنا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے ہیں۔ عباس نے بنو سلیم سے کہا تم نے مجھے ذلیل کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اپنا حق دینا نہیں چاہتا ہم اسے ہر آدمی کے بدلے چھ اونٹ دیں گے۔ لہٰذا ان کے بچے اور عورتیں واپس کر دو چنانچہ سب نے واپس کر دیئے۔ عینیہ کے پاس ہوازن کی ایک بڑھیا تھی اس نے کہا میرے خیال میں یہ قبیلہ میں بڑی ذی نسب ہے اس کا بدلہ زیادہ ملے گا ابو صرد نے کہا اسے چھوڑ دے خدا کی قسم نہ اس کے منہ میں ٹھنڈک ہے نہ پستان اٹھے ہوئے ہیں نہ پیٹ پر بچنے کے قابل ہے نہ اس کا شوہر ایک ہے نہ اس کا دودھ اچھا ہے یہ سن کر اس نے چھ اونٹوں کے عوض میں بڑھیا کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد عینیہ نے اقرع سے ملکر شکایت کی اقرع نے کہا ما اخذ ما بیضاء غریرۃ ولا نصفاً وثیرۃ (وہ خوبصورت نازک اندام اور میانہ عمر کی تازہ تو نہ تھی)

آنحضرت کا ایک واقعہ سبی میں شیما بنت حارث بن عبد عزی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن بھی

موجود تھی اس پر سختی کی گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ کہتی ہوئی آئی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن ہوں آپ کے پاس پہنچکر عرض کیا میں آپ کی بہن ہوں آپ نے فرمایا کیا علامت ہے شیماء نے کہا میں آپ کو گود میں لے رہی تھی آپ نے میرے کاٹ لیا تھا۔ آپ نے علامت سے پہچان لیا اپنی چادر مبارک پھیلادی اور اس پر بٹھایا۔ اور فرمایا تمہیں اختیار ہے عزت کے ساتھ میرے پاس رہو۔ یا بحفاظت اپنی قوم میں چلی جاؤ اس نے اس کو پسند کیا کہ کچھ عرصہ آپ کے پاس رہے اور پھر واپس بھیج دی جائے شیماء کا قصہ وفد کے آنے اور سبی کے واپس ہونے سے پہلے ہو چکا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک اپنا غلام اور ایک لونڈی عطا فرمائی تھی شیماء نے دونوں کا آپس میں نکاح کر دیا اب بھی کچھ لوگ ان کی نسل سے باقی ہیں اس پورے واقعہ میں احکام کے ساتھ سیرۃ نبوی کا نمونہ بھی ہے۔ سلاطین وحکام کو اس کا اتباع کرنا چاہئیے۔ ہم نے اسی غرض سے پورا نقل کیا ہے۔

قیدی عورتیں اگر سبی میں منکوحہ عورتیں ہوں تو قید ہونے سے ان کے نکاح ٹوٹ جاتے ہیں خواہ شوہر بھی ساتھ ہی قید ہوں امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر شوہر بھی ساتھ قید ہوں تو نکاح بحالہ باقی رہیں گے۔ اگر منکوحہ عورت قید ہونے سے پہلے مسلمان ہو جائے تو وہ حرہ ہوگی اور عدت گذرنے پر نکاح باطل ہو جائے گا تقسیم کے بعد سبایا سے تا وقتیکہ استبراء رحم حیض سے یا وضع حمل سے نہ ہو جائے۔ وطی کرنا حرام ہے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ہوازن کی سبایا پر گذرے تو فرمایا خبردار حاملہ وضع حمل سے قبل اور غیر حاملہ سے حیض آنے سے پہلے ہمبستری نہ کی جائے ۔

ایک مسئلہ مسلمان کا جو مال کفار کے قبضے میں چلا جائے وہ اس کے مالک نہیں ہوتے مسلمان مالکوں کی ملکیت باقی رہتی ہے لہٰذا اگر پھر مسلمانوں کے ہاتھ آجائے تو اصل مالکوں کو بلا عوض دیدیا جائے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ غلبہ پانے کے بعد کفار مالک ہوجاتے ہیں لہٰذا اگر کسی باندی کا مسلمان مالک دار الحرب میں جائے تو اس پر اس باندی سے وطی کرنا حرام ہے اور اگر زمین ہو تو غلبہ پانے والے مسلمان ہوجائیں تو وہ احق ہوں گے اور اگر مسلمانوں کا غلبہ ہوجائے تو مالک کی بہ نسبت وہ احق ہوجائیں گے ۔ امام مالکؒ کی رائے ہے کہ اگر مالک کو اس کا مال تقسیم سے پہلے مل گیا تو وہ احق ہے اور اگر تقسیم کے بعد ملا تو قیمتاً مالک احق ہے اور بدون اس کے غانم احق ہے حربیوں کی اولاد کو جس طرح سبی بنانا جائز ہے اسی طرح حربیوں سے خرید نا بھی جائز ہے اہل عہد کی اولاد خریدنی جائز ہے سبی بنانا جائز نہیں ذمیوں کی اولاد حر کا خریدنا اور سبی بنانا دونوں جائز نہیں ۔

خمس غنیمت سے ایک دو شخص کی لائی ہوئی غنیمت میں سے بھی خمس لیا جائے ابوحنیفہؒ اور ان کے صاحبین فرماتے ہیں کہ جب تک سریہ نہ ہو خمس نہ لیا جائے سریہ کے متعلق اختلاف ہے ابوحنیفہؒ اور محمد رحمہما اللہ کے نزدیک سریہ محفوظ اعداد کو کہتے ہیں ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ سریہ ۹ اور اس سے زائد اعداد ہیں اس لئے کہ عبداللہ بن جحش کے سریہ میں ۹ عدد تھے مگر اکثر فقہا کے نزدیک ان اعداد کا اعتبار

نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہا عبداللہ بن انیس کو خالد بن سفیان کی طرف سریہ بنا کر روانہ کیا تھا جس کو انھوں نے قتل کیا۔ نیز آپ نے عمر بن امیہ ضمیری اور ایک اور شخص کو سریہ بنا کر بھیجا تھا۔ والدین میں سے جو مسلمان ہوجائے کمسن اولاد اس کے تابع ہوکر مسلمان ہوگی خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں مگر بالغ اولاد بجز مجنون کے بالتبع مسلمان نہ ہوگی۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں باپ کے مسلمان ہونے سے کمسن اولاد مسلمان ہوجاتی ہے ماں سے نہیں ہوتی۔ بچے خود نہ مسلمان ہوسکتے ہیں نہ مرتد۔ ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں مسلمان بھی ہوسکتے ہیں مرتد بھی بشرطیکہ سمجھ اور تمیز آگئی ہو لیکن بلوغ سے پہلے قتل نہ کئے جائیں۔ ابویوسفؒ فرماتے ہیں مسلمان ہوسکتے ہیں مگر مرتد نہیں ہوسکتے معن کی روایت سے امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ اگر اپنے نفس کو پہچانتا ہو تو اس کا اسلام معتبر ہے ورنہ نہیں۔

تین قسم کی زمینیں زمینیں جس پر مسلمانوں کو استیلا حاصل ہو تین قسم کی ہیں۔

(۱) قسم وہ زمین جو جبراً قہراً قبضے میں آئے اور کفار کو قتل یا قید یا جلاوطن کردیا جائے اس کے حکم میں فقہا کا اختلاف ہے امام شافعیؒ کہتے ہیں دوسرے مالوں کی طرح یہ بھی غنیمت ہے غانمین میں تقسیم کردی جائے اگر وہ بخوشی نہ لینا چاہیں تو مسلمانوں کو مصالح کے لئے وقف کردی جائے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ قبضے میں آنے کے ساتھ ہی عام مسلمانوں کے لئے وقف ہوجائے گی۔ غانمین میں تقسیم کرنا جائز نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں امام کو اختیار ہے خواہ غانمین پر تقسیم کردے اس صورت میں زمین عشری ہوجائے گی خواہ مشرکوں

واپس دیگر خراج قائم کردے تو خراجی زمین ہو جائے گی۔ اور مشرکین ذمی ہو جائیں گے یا تمام مسلمانوں پر وقف کردے بہرحال یہ زمین مسلمانوں کے پاس رہے یا مشرکین پھر آباد کر دیئے جائیں چونکہ مسلمانوں کی مملوک ہے دارالاسلام ہوگی مگر مشرکین کو دے کر اس زمین سے دست بردار ہونا جائز نہیں تاکہ دارالحرب نہ ہو۔

(۲) قسم وہ زمین جو بلا وقت کفار کے بھاگ جانے کی وجہ سے ہاتھ آئے یہ زمین استیلاء کے ساتھ ہی وقف ہو جائے گی بعض کے نزدیک ضروری ہے کہ امام اپنے الفاظ سے وقف کرے۔ نگرانی و حفاظت کے معاوضہ میں اس پر خراج مقرر کیا جائے اور اس کو مسلمان یا معاہد عامل سے جو وہاں مقرر ہو وصول کیا جائے۔ اس زمین سے خراج اور کھیتیوں اور پھلوں کا عشر دونوں لینے جائز ہیں۔ لیکن جو کھجوریں استیلاء کے وقت موجود ہوں ان کی آمدنی سے عشر لینا واجب نہیں امام کو اختیار ہے ان پر خراج قائم کرے یا پھلوں پر مساقات اور بعد میں جو کھجوریں لگائی جائیں ان کی آمدنی سے عشر ساقط ہو جاتا ہے یہ زمین دارالاسلام ہوگی اس کی بیع فروخت اور رہن جائز نہیں جدید پیدا شدہ کھجوروں اور درختوں کی بیع بھی جائز نہیں۔

(۳) قسم کی وہ زمین ہے کہ اس پر مصالحت کے ساتھ بایں شرط استیلاء حاصل ہو کر زمین دشمنوں کے پاس رہے اور وہ اس کا خراج ادا کرتے رہیں اس کی دو قسمیں ہیں (پہلی) اس شرط پر مصالحت ہو کہ زمین پر قبضہ جاری رہے اس صورت میں یہ زمین دارالاسلام کی وقف ہے بیع اور رہن جائز نہیں اس کا خراج کرایہ ہوگا جو ہر حال میں خواہ اس کے باشندے مسلمان ہو جائیں

یا زمین مسلمانوں کے پاس چلی جائے واجب الادا ہوگا۔

اس صلح کے بعد اس کے باشندے معاہد ہوں گے جو اگر جزیہ ادا کریں تو ہمیشہ وہیں آباد رہ سکتے ہیں اور ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو مجبور نہ کیا جائے مگر عام معاہدین کے دستور سے زیادہ وہاں قیام نہ کر سکیں گے اس کی مدت چار ماہ ہے ایک سال کے درمیان مقیم رہنے دینے کے متعلق دو وجوہیں (جواز وعدم جواز)

(دوسری) اس شرط پر مصالحت ہو کہ زمین ان کی ملک ہے اور اس کا خراج ہمیں ادا کرتے رہیں یہ خراج جزیہ کے حکم میں ہوگا جب مسلمان ہو جائیں ساقط ہو جائے گا اس مصالحت سے زمین دارالاسلام نہیں ہوتی دارالعہد ہوتی ہے وہ اس کی بیع اور رہن کر سکیں گے جب کسی مسلمان کی ملکیت میں منتقل ہوگی خراج نہ لیا جائے گا۔ جب تک صلح کے پابند رہیں گے مقیم رہنے دیئے جائیں گے ان سے جزیہ نہ لیا جائے گا۔ کیونکہ دارالاسلام سے خارج ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مصالحت سے یہ زمین دارالاسلام ہوگئی اور باشندے ذمی ہوں گے لہٰذا جزیہ لیا جائے۔

مصالحت کے بعد نقض صلح کریں تو ان کے حکم میں اختلاف ہے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر زمین کی ملکیت ان کو پہلے سے حاصل ہے تو سابقہ حالت کے مطابق اس کا حکم ہوگا اور اگر وہ اس کے مالک نہ تھے تو اب یہ دارالحرب کے حکم میں ہوگی۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر ان کے علاقے میں کوئی مسلمان ہو یا ان کے دارالحرب کے درمیان کوئی مسلمانوں کا شہر ہو تو دارالاسلام ہے اس کے باشندے باغی قرار دیئے جائیں گے اگر ایسا نہ ہو تو دارالحرب ہے امام ابویوسفؒ اور محمدؒ فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں

یہ ان کا علاقہ دارالحرب ہو جاتا ہے۔

اموال منقولہ اموال منقولہ عام غنیمتوں کے حکم میں ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اپنی رائے سے تقسیم فرمایا کرتے تھے بدر کے دن مہاجرین و انصار میں نزاع ہوئی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مالک بنا دیا تاکہ جس طرح چاہیں خرچ فرمائیں ابو امامہ باہلی روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبادہ بن صامت سے انفال کے متعلق دریافت کیا ان کی مراد یہ آیت تھی (یسئلونک عن الانفال قل الانفال للّٰہ والرسول فاتقوا اللّٰہ واصلحوا ذات بینکم)

ترجمہ:۔ تم سے انفال (غنیمتوں) کی بابت پوچھتے ہیں کہہ دو وہ اللہ اور رسول کی ہیں اللہ سے ڈرو اور آپس میں مصالحت کرو۔

عبادہ بن صامت نے کہا۔ یہ آیت جب ہم بدر والوں میں نفل کے لئے اختلاف ہوا نازل ہوئی تھی چونکہ ہماری نیتیں صاف نہ رہیں اللہ تعالیٰ نے ہم سے چھین کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدی آپ نے مساوی طور پر مسلمانوں میں تقسیم فرما دی اور اپنے لئے منبہ بن حجاج کی تلوار مسمیٰ ذوالفقار انتخاب فرمائی اور اپنا حصّہ بھی لیا۔

اس وقت تک خمس نہیں لیا جاتا تھا بدر کے بعد اللہ تعالیٰ کا فرمان نازل ہوا۔ (واعلموا انما غنمتم من شئ فان للّٰہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل)

ترجمہ:۔ اس بات کو جان لو کہ تم نے جو کچھ لوٹا ہے اس کا خمس اللہ، رسول، قرابت داروں۔ مسکینوں اور مسافروں کے واسطے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے صدقات کی طرح غنیمت کی تقسیم بھی خود ہی تجویز فرما دی

اس لئے بدر کے بعد سب سے پہلی غنیمت جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ حصوں میں منقسم فرمایا بنی قینقاع کی غنیمت تھی۔

غنیمتیں جمع ہو جائیں تو لڑائی کو ختم ہونے سے پہلے تقسیم نہ کی جائیں تاکہ مکمل فتح اور ملکیت کا ہونا معلوم ہو جائے مبادا غازی اس میں مصروف ہو کر شکست اٹھائیں۔ لڑائی فتح ہونے کے بعد آیا فوراً دار الحرب میں یا دار الاسلام میں جاکر تقسیم کرے۔ اس کے متعلق امیر لشکر کی رائے معتبر ہے جیسا مناسب ہو عمل میں لائے۔ ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ دار الحرب میں تقسیم کرنا جائز نہیں دار الاسلام میں جانے کے بعد تقسیم کرے تقسیم کرنے کے وقت سب سے پہلے مقتولین کا سلب تقسیم کرے ہر قاتل کو اس کے مقتول کا سلب دے خواہ امام نے اس کی شرط کی ہو یا نہ کی ہو امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر شرط کی ہو تو سلب کے مستحق ہوں گے۔ ورنہ غنیمت ہے جس میں قاتلین سب کے ساتھ حصہ دار ہیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے مال جمع ہونے کے بعد یہ اعلان کیا تھا من قتیلاً فلہ سلبہ (مقتول کا سلب قاتل کی ملک ہے) اور یہ شرط مقدم ہوتی ہے نہ موخر۔ اس موقع پر آپ نے ابو قتادہ کو ان کے بیس مقتولوں کا سلب عنایت فرمایا تھا۔ سلب مقتول کے بدن کے لباس، ہتھیاروں اور اس کے گھوڑے کو کہتے ہیں۔ جس پر وہ سوار ہو لشکر گاہ میں جو اس کا سامان موجود ہو وہ سلب نہیں اس کی جیبوں کے مال اور سامنے کے گھوڑے کے سلب ہونے کے متعلق دو قول ہیں۔ سلب سے خمس نہ نکالا جائے امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ محققین خمس کے لئے خمس نکالا جائے سلب کی تقسیم سے فارغ ہونے کے بعد صحیح قول یہ ہے کہ مال غنیمت میں سے خمس نکال کر حسب ارشاد خداوندی (واعلموا انما غنمتم من شیٔ فان للہ خمسہ

وللرسول الخ) مستحقین خمس میں تقسیم کرے ابوحنیفہؒ وابو یوسفؒ و محمد اور مالک رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ خمس کے تین حصے کئے جائیں۔

(۱) یتیموں کے لئے۔

(۲) مساکین کے لئے۔

(۳) مسافروں کے لئے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں خمس کے چھ حصے کئے جائیں ایک حصہ اللہ تعالیٰ کا کعبے کی ضروریات میں صرف کیا جائے۔

خمس کے مستحقین خمس غنیمت کے مستحقین وہی ہیں جو خمس فئی کے۔ لہٰذا ایک خمس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ کے بعد مصالح عامہ میں صرف کیا جائے۔ دوسرا حصہ ذوالقربیٰ ابنو ہاشم بنو عبدالمطلب کا تیسرا یتیموں کا چوتھا حصہ مسکینوں کا۔ پانچواں حصہ مسافروں کا خمس کی تقسیم سے فراغت پانے کے بعد اہل رضخ کو (مثلاً غلام عورتیں بچے لنجے) جن کا غنیمت میں حصہ نہیں ہے اور لڑائی میں شریک ہیں کچھ عطا کرے ذمیوں کو بھی بقدر محنت و مشقت غنیمت سے عطیہ دے مگر کسی کو عطیہ کی مقدار سوار یا پیدل کے حصہ کے برابر نہ ہونے پائے اگر لڑائی کے وقت اہل رضخ کا نقص زائل ہو جائے مثلاً غلام آزاد لڑکا بالغ کافر مسلمان ہو جائے تو اگر لڑائی ختم کے قبل ہو تو حصہ دیا جائے عطایا اور انعامات نہ دیئے جائیں اور لڑائی ختم ہونے کے بعد ہو تو ان کا حصہ نہ لگایا جائے صرف انعام دیا جائے۔

خمس وانعامات کی تقسیم کے بعد اہل جہاد کو غنیمت تقسیم کرے اہل جہاد سے مراد حر مسلمان تندرست مرد ہیں، اس میں لڑنے والے اور نہ لڑنے والے

دونوں شریک ہیں کیونکہ لڑنے والے نہ لڑنے والوں کے معاون اور بوقت
ضرورت سہارا ہوتے ہیں آیت وقیل لھم تعالوا قاتلوا فی سبیل اللہ او
ادفعوا - ترجمہ :- ان سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا کم از کم دشمن کو روکو۔
میں علماء دو تاویلیں کرتے ہیں ایک یہ کہ تکثیر سواد مراد ہے یہ قول ابن جریج
اور سدی کا ہے دوسری یہ کہ جنگ کے لئے گھوڑے باندھنا اور پرورش کرنا
مراد ہے یہ قول ابن عون کا ہے ۔تقسیم غنیمت واجب ہے تقسیم کنندہ یا امیر
لشکر کے اختیار میں نہیں ہے ۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مال غنیمت امام
کی رائے پر موقوف ہے خواہ غانمین میں برابر یا کم وبیش تقسیم کرے خواہ جو لڑائی
میں موجود ہوں ان کو بھی شریک کرے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد
الغنیمۃ لمن شھد الوقعۃ سے غنیمت شرکائے جنگ کے لئے ہے اس
مذہب کی تردید ہوتی ہے ۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ غنیمت موجودین جنگ کے
لئے مخصوص ہے تو واجب ہے کہ سوار کا حصہ زیادتی مشقت کی وجہ سے پیدل
سے زائد رکھا جائے زائد کی مقدار میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہؒ فرماتے
ہیں کہ سوار کے دو حصے پیدل کا ایک حصہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ سوار کے
تین حصے پیدل کا ایک حصہ ۔سوار کا حصہ صرف گھوڑے سوار کو دیا جائے
خچر، گدھے، اونٹ ، اور ہاتھی کے سواروں کو پیدل کا حصہ دیا جائے۔ اصیل
غیر اصیل گھوڑے برابر ہیں ۔ سلیمان بن ربیع کہتے ہیں کہ صرف اصیل پیشرو
گھوڑوں کا حصہ لگایا جائے ۔گھوڑے کو جنگ میں ساتھ لانے ہی سے اس کا
حصہ لگایا جائے اس پر سوار ہو کر جنگ کرنا ضروری نہیں ۔مگر لشکر میں پیچھے چھوڑ
دے تو حصہ نہ لگایا جائے ۔ اگر کوئی شخص لڑائی میں چند گھوڑے لائے تو صرف
ایک گھوڑے کا حصہ دیا جائے ۔ یہی قول ابو حنیفہؒ اور محمدؒ کا ہے ابو یوسف

رماتے ہیں کہ دو گھوڑوں کے حصے دیئے جائیں - یہی قول اوزاعی کا ہے اور ابن
عینیہ کہتے ہیں کہ جتنے کام آئیں ان کا حصہ لگایا جائے - باقی کا نہ لگایا جائے جس کا
گھوڑا لڑائی میں شریک ہو کر مرجائے اس کا حصہ لگایا جائے اور پہلے مرجائے تو نہ
لگایا جائے یہی مسئلہ خود سوار کی موت کی صورت میں ہے - امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں
اگر دارالحرب میں داخل ہو کر سوار یا اس کا گھوڑا مرجائے تو حصہ لگایا جائے لڑائی کے
ختم ہونے سے قبل مدد آجائے تو وہ بھی غنیمت میں شریک ہے لڑائی ختم ہونے
کے بعد پہنچے تو شریک نہیں امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں لڑائی ختم ہونے کے قبل
اگر دارالحرب میں داخل ہو جائے تو غنیمت میں شریک کی جائے - غنیمت میں
تنخواہ دار و غیر تنخواہ دار دونوں موجود ہوں تو مساوی حصے دیئے جائیں - بلا اذن امام
اگر کوئی جماعت جہاد کرے تو اس کی غنیمت سے بھی خمس لیا جائے امام ابوحنیفہؒ
فرماتے ہیں خمس نہ لیا جائے - حسن فرماتے ہیں ان کی غنیمت پر ملکیت حاصل
نہیں ہوتی اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں امان لے کر جائے یا ان میں اسیر تھا
انہوں نے رہا کر دیا تو اس کو ان کا جان و مال تلف کرنا جائز نہیں - ان کو امن
یا اس کے ذمہ ضروری ہے - داؤد فرماتے ہیں کہ تلف کر سکتا ہے ہاں اگر وہ
اس سے اسی طرح طالب امن ہو جس طرح اس کو امن دیا ہے تو مصالحت
پر رہنا اس پر لازم اور تلف کرنا حرام ہے اگر سپاہیوں میں سے کسی نے جان
پر کر ایسی کوشش کی ہو کہ اس کی بہادری اور پیش قدمی کا سکہ بیٹھ گیا تو غنیمت کے
ان حصے کے علاوہ مصالح عامہ کے حصے سے اس کو مناسب انعام دیا جائے
ان لوگوں کا حق نظر انداز نہ کرنا چاہیئے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب
سے پہلا جھنڈا اپنے عم حضرت حمزہؓ کے بعد ربیع اول ۲ھ میں جلیدہ بن حارث
کو دیا تھا ان کے ہمراہ سعد بن وقاص بھی حجاز میں ادنیٰ ما کی طرف روانہ ہوئے

مشرکین کا سردار عکرمہ بن ابی جہل تھا۔ سعد نے تیر چلایا جو نشانے پر لگا سب سے پہلا تیر اللہ کے راستے میں سعد ہی نے چلایا تھا چنانچہ کہتے ہیں (بحر وافر)

الا ھل اتی رسول اللہ انی … حمیت صحابتی بصدر نبلی
اذود بھا اوائلھم ذیادا … بکل حزونۃ وبکل سھل
فما یعتد رام فی عدو … بسھم یا رسول اللہ قبلی
وذلک ان دینک دین صدق … وذو حق اتیت بہ وعدل

ترجمہ:۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات آگئی کہ میں نے تیر ان کے سینوں سے اپنے ساتھیوں کی حمایت کی اور بڑھتے ہوئے دشمنوں کو سخت نرم زمین میں سے دفع کر دیا۔ اے اللہ کے رسول مجھ سے پہلے کسی نے دشمن پر تیر نہیں چلائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا دین سچا ہے اور آپ حق و انصاف لے کر آئے ہیں۔

اس کے صلے میں جب سعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان کے پچھلے قصور معاف کر دیئے۔

احکام مختلفہ

اسلامی ممالک کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) حرم

(۲) حجاز۔ ان دونوں کے ماسوا۔

(۳) حرم سے مراد مکہ اور اس کے گرد کا وہ علاقہ جو نصب کے اندر واقع ہے
دراصل مکہ کی عظمت خدا کے گھر کی وجہ سے ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی تعمیر
کرا اور اس کو لوگوں کی عبادت کے لئے قبلہ بنا کر اس بستی کا نام ام القریٰ رکھا
رشاد ہے (لتنذر ام القریٰ ومن حولھا)

ترجمہ:۔ تاکہ آپ ام القریٰ اور اس کے گرد والوں کو ڈرائیں۔

غلاف کعبہ کے متعلق ابوہریرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے
کہ سب سے پہلے سعد یمانی نے کعبے پر غلاف چڑھایا اس کے بعد رسول اللہ
لی اللہ علیہ وسلم نے یمنی کپڑے کا غلاف چڑھایا آپ کے بعد عمر ابن الخطاب
عثمان رضی اللہ عنہ نے قباطی کپڑا چڑھایا پھر یزید بن معاویہ نے دیباج
رانی چڑھایا محارب بن دثار کا بیان ہے کہ سب سے پہلے دیباج خالد بن جعفر
لاب نے چڑھایا اس نے ایک تجارتی قافلہ لوٹا تھا اس میں دیباج کے تھان
ن کو اس نے کعبہ پر چڑھا دیا اس کے بعد زبیر اور زبیر اور حجاج نے دیباج
یا پھر کچھ دنوں بنو امیہ نے اہل نجران کے حلے جو جنگ کی وجہ سے وہ ادا

کرتے تھے چڑھائے متوکل نے اپنے عہد میں کعبے کی دیواروں پر سنگ مرمر لگایا اور ان میں چاندی کا جوڑ دیا اور تمام چھت، دیواروں، اور ستونوں پر سونا چڑھا کر ستونوں کو دیباج سے آراستہ کیا پھر دولت عباسیہ میں ہمیشہ دیباج چڑھایا جاتا رہا۔

مسجد حرام | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد تک کعبہ کا صحن کسی دیوار سے گھرا ہوا نہیں تھا عہد فاروق میں لوگوں کی کثرت ہوگئی تو مسجد کو وسیع کیا گیا۔ قریب کے مکانات خرید لئے گئے اور گرا کر مسجد میں شامل کر دیئے گئے بعض لوگوں نے بیچنے سے انکار کیا تو قیمتیں بڑھا کر خرید کئے گئے چاروں طرف ایک قامت سے کم اونچی دیوار بنائی گئی اس پر چراغ رکھے جاتے اور سب سے پہلے حضرت عمرؓ ہی نے مسجد حرام کی چار دیواری بنوائی جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بھی مکانات خریدے اور مسجد کو اور وسیع کیا لوگوں سے ان کے گھر لے لئے اور انھیں ان کی قیمتیں دینی چاہیں تو سب نے بیت اللہ کے پاس جمع ہو کر دادیلا اور شور کیا حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میرے حکم نے تم کو جری بنا دیا حضرت عمرؓ نے یہی کیا تھا تو تم سب کو قید کر دیا اور عبداللہ بن خالد بن اسد کی سفارش پر چھوڑ دیا اور مسجد کو وسیع کرنے کے ساتھ اس پر برج بھی بنوائے مسجد پر برج سب سے پہلے حضرت عثمان ہی بنوائے۔ ولید بن عبدالملک نے زیادتی اور تعمیر کی اس کے بعد مہدی نے اور بڑھایا اب ہمارے وقت تک اسی کی تعمیر موجود ہے۔

حرم کیا ہے | حرم مکہ کے چاروں طرف کا علاقہ ہے اس کی حد مدینہ کے راستے میں تنعیم سے ورے بنی نفار کے مکانات کے پاس تین میل اور عراق کے راستے سے پہاڑ کی گھاٹی کے موڑ تک سات میل جعرانہ

کے راستے میں آل عبداللہ بن خالد کی گھاٹیوں تک نو میل طائف کے راستے میں بطن نمرہ کے عرفہ تک سات میل جدہ کے راستے میں طریق عشائر تک دس میل ہے اس محدود علاقہ کو حق تعالیٰ نے اس کی خصوصی عظمت کی وجہ سے حرم قرار دیا ہے اس کا حکم دوسرے تمام شہروں سے مغائر ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :- (اذقال ابراھیم رب اجعل ھذا بلدا آمنًا)

ترجمہ :- جس وقت ابراہیمؑ نے دعا کی اے میرے رب اس کو باامن شہر بنا دے۔

یعنی مکہ اور اس کے حرم کو (وارزق اھلہ من الثمرات)

ترجمہ :- اس کے باشندوں کو پھل عطا فرما۔

چونکہ یہ وادی زراعت سے بالکل خالی تھی اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اس کے باشندوں کو امن اور فراخ سالی مرحمت فرما حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ایسا باامن حرم کر دیا کہ لوگ اس میں چاروں طرف سے کھچکر آنے لگے اور ہر قسم و ہر شہر کی پھل پھلاری اس میں دستیاب ہونے لگی اس میں اختلاف ہے کہ مکہ اور اس کے گرد کا علاقہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے حرم کیا گیا یا ہمیشہ سے حرم تھا ایک قول یہ ہے کہ آپ سے پہلے ہی جابر حاکموں، متغلبوں، خسوف اور زلزلوں سے محفوظ اور حرم امن تھا اور ابراہیمؑ کی دعا سے یہ ہوا کہ خشک سالی، قحط سے مامون ہو گیا۔ باشندوں کو پھل پھلاری میسر آنے لگی کیونکہ سعید بن ابی سعید ابو شریح خزاعی سے سنکر بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے آسمان و زمین کی خلقت کے ساتھ ہی مکہ کو حرم کر دیا تھا اور قیامت حرم رہے گا کسی شخص کو جس کا اللہ اور آخرت پر ایمان ہے

یہ جائز نہیں کہ یہاں کسی کا خون بہائے یا درخت کاٹے۔ میرے بعد یہ مقام کسی کے لئے حلال نہ ہوگا میرے لئے صرف اسی ساعت اس لئے حلال ہُوا ہے کہ اس کے باشندوں کو سرکشی کی سزا دی جائے مگر اب پھر حسب سابق حرم اور جائے امن ہوگیا ہے خبردار جو لوگ یہاں موجود ہوں وہ دوسروں کو بھی مطلع کردیں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے اس میں قتل کیا ہے تو اسے جواب دیدو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے لئے تھوڑی دیر کے لئے حلال کیا تھا۔ تمہارے لئے حلال نہیں کیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ پہلے مکہ بھی اور بلاد کی طرح حلال تھا ابراہیم ؑ کی دعا سے حرم بنایا گیا ہے جیسے مدینہ پہلے حلال تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے حرم ہوگیا اس کی تائید ابوہریرہؓ کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے خلیل تھے میں بھی اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں انھوں نے مکہ کو حرم کیا میں مدینہ کو دونوں پتھریلی وادیوں کے درمیان سے حرم قرار دیتا ہوں نہ درخت کاٹا جائے نہ شکار کیا جائے اور نہ قتال کیا جائے۔ اونٹ کے چارے کی اجازت ہے۔ حرم کے خصوصی احکام پانچ ہیں۔

(۱) کوئی بیرونی شخص بلا احرام حج یا عمرہ باندھے داخل نہ ہو صرف احرام باندھکر حرم میں آسکے گا۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر کسی آنے والے نے حج یا عمرہ کا ارادہ نہیں کیا ہے تو اس کے لئے بلا احرام حرم میں داخل ہونا جائز ہے۔ مگر فتح مکہ کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بغیر احرام داخل ہونا اور یہ فرمانا کہ میرے لئے تھوڑی دیر کو حلال کیا ہے میرے بعد کسی کے لئے حلال نہیں اس پر دلالت کرتا ہے کہ باہر سے آنے پر احرام واجب ہے لیکن بکثرت آمد و رفت رکھنے

والے مثلاً لکڑ ہارے اور پانی لانے والے اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کو صبح و شام آنے جانے کی ضرورت ہوتی ہے اگر ان پر احرام واجب ہو تو مشقت زیادہ ہوگی ہر علماء مکہ ان لوگوں کو بغیر احرام داخل ہونے سے نہیں روکتے اس وجہ سے ان میں اور دوسرے لوگوں میں فرق ہو گیا۔

بلا احرام داخلہ اگر کوئی شخص بلا احرام داخل ہوا تو گنہگار ہوگا قضا یا قربانی واجب نہ ہوگی قضا میں یہ دشواری ہے کہ جب قضا کا احرام باندھنے کے لئے باہر جاکر پھر داخل ہوگا۔ یہ احرام اس دوسرے دخول کا ہوگا نہ کہ پہلے کا اس لئے قضا ساقط ہے اور قربانی کسی کوتاہی پورا کرنے کے لئے۔

(۲) باشندگان حرم سے محاربہ نہ کیا جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دیا ہے اور اگر اہل حق سے بغاوت کر بیٹھیں تو بعض کے نزدیک تب بھی قتال حرام ہے البتہ ان پر اس قدر تنگی کی جائے کہ بغاوت سے رجوع کر کے اہل حق میں داخل ہو جائیں مگر اکثر فقہا کی رائے ہے کہ اگر قتال کے سوا چارہ نہ ہو تو کیا کیا جائے کیونکہ باغیوں کا قتال حقوق اللہ میں سے ہے جن کو ضائع کرنا جائز نہیں بلکہ حرم میں اور جگہوں کی بہ نسبت حقوق اللہ کی حفاظت زیادہ ہونی چاہئے حدود جاری کرنے کے بارے میں امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ جاری کی جائیں حرم اس سے مانع نہیں عام اس سے کہ ارتکاب جرم حرم میں کیا ہو یا بیرون حرم مرتکب ہو کر حرم میں پناہ گزیں ہوا ہو۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص حرم میں مرتکب اس پر حرم میں حد جاری کی جائے اور جو باہر جرم کر کے حرم میں پناہ گزیں ہوا ہو اس پر حرم میں جاری نہ کی جائے اس کو حرم سے نکلنے پر مجبور کیا جائے اور نکلنے کے بعد حد جاری کی جائے۔

(۳) حرم کے جانوروں کا شکار (خواہ وہاں کے ہوں یا حل سے آ گئے ہوں)

محرم اور غیر محرم دونوں پر حرام ہے اگر کسی جانور کو پکڑے تو اس کو چھوڑ نا واجب ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں تلف ہو جائے تو حرم کی طرح اس کی ضمانت ادا کرے اگر حرم میں کھڑا ہو کر حل (بیرون حرم) کے جانور کا شکار کرے تو ضامن ہوگا کیونکہ یہ قاتل حرم میں ہے۔ اسی طرح حل میں کھڑے ہو کر حرم کے جانور کا شکار کرنے سے ضمان واجب ہوتا ہے کیونکہ مقتول حرم میں ہے۔ اگر حل میں شکار کر کے حرم میں لے آئے تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس کو کھا سکتا ہے اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس پر اس کا کھانا حرام ہے۔ موذی حشرات الارض اور درندوں کا مارنا حرام نہیں۔

(۴) خودرو درختوں کا قطع کرنا حرام ہے آدمیوں کے لگائے ہوئے درختوں کا قطع کرنا حرام نہیں۔ ممنوع درختوں کے قطع کرنے سے ضمان واجب ہوتا ہے بڑے درخت سے گائے واجب ہوتی ہے چھوٹے درخت سے بکری واجب ہوتی ہے بڑے یا چھوٹے درخت کی شاخ کاٹ دینے سے ضمان عائد نہیں ہوتا۔ مگر تنے کے قطع کے بعد جو باقی رہجائے اس کے قطع کر دینے سے ضمان ساقط نہیں ہوگا۔

(۵) غیر مسلم ذمی ہو یا معاہد حرم میں داخل نہیں ہو سکتا نہ رہنے کے لئے نہ گزرنے کے لئے یہ مذہب امام شافعیؒ کا ہے۔ ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں اگر وطن نہ بنائیں تو داخل ہونا جائز ہے لیکن حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا اس میں صراحت دال ہے کہ ان کا داخلہ ممنوع ہے۔ لہٰذا اگر کوئی مشرک بلا اذن داخل ہو تو اس کو سزا دی جائے قتل کرنا مباح نہیں اور باذن داخل ہو تو اس کو سزا نہ دی جائے مگر اذن دینے والے سے بازپرس کی جائے بلکہ ضرورت ہو تو اس کو سزا بھی دی جائے اور مشرک کو امن و حفاظت کے ساتھ نکال دیا جائے

مشرک اسلام لانے کے لیئے داخل ہونا چاہے اس کو بھی روک دیاجائے پہلے اسلام لائے اور پھر داخل ہو۔ اگر کوئی مشرک حرم میں مر جائے تو اس کو حرم میں دفن کرنا حرام ہے حل میں دفن کیا جائے اگر حرم میں دفن کردیا جائے تو نکال کر حل میں منتقل کر دیں البتہ اگر گل سڑ گیا ہو تو جیسے جاہلیت کے مردے حرم میں چھوڑ دیئے گئے اس کو بھی چھوڑ دیا جائے اور دوسری مساجد میں اگر سونے اور کھانے سے سمجھ کی بیحرمتی نہ کریں تو داخلہ کی اجازت دی جائے ورنہ روک دیا جائے امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ کسی حالت میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔

حجاز

حجاز۔ اصمعی کا قول ہے کو اس کو حجاز اس لئے کہتے ہیں کہ یہ نجد و تہامہ کے درمیان حاجز (مانع) ہے کلبی کہتے ہیں۔ حجاز اس لئے کہتے ہیں کہ یہ پہاڑوں میں متحجز (رکا ہوا) ہے حرم کے علاوہ اور بلاد سے اس کو چار قسم کی خصوصیت ہے۔

(۱) کوئی مشرک ذمی یا معاہد حجاز کو وطن نہیں بنا سکتا امام ابو حنیفہؒ جائز فرماتے ہیں عبید اللہ بن عتبہ بن مسعودؒ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے راوی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت یہ ہے کہ جزیرۃ العرب میں دو مذہب جمع نہ ہوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذمیوں کو حجاز سے خارج کر دیا تھا اور تاجروں اور صناعوں کے لیے تین دن تک ٹھہرنے کی مدت مقرر کی تھی اس کے بعد نکال دیئے جاتے تھے۔ آپ کے بعد اس پر عملدرآمد رہا اور قانون قرار دیا گیا لہٰذا کوئی ذمی وطن نہ بنائے اور نہ ایک جگہ تین روز سے زائد قیام کرے یہ جائز ہے کہ ایک جگہ تین روز رہ کر دوسری جگہ تین روز رہے۔ بلاعذر تین روز سے زیادہ قیام کرے تو سزا دی جائے۔

(۲) ان کے مردے یہاں دفن نہ کئے جائیں اگر دفن کر دیں تو دوسری جگہ منتقل

کئے جائیں کیونکہ دفن دائمی ہے لہٰذا اس سے وطن کے مثل ہو جائے گا۔ اگر مسافت اتنی زیادہ ہے کہ دوسری جگہ لے جانے میں نعش متغیر ہو جائے گی تو بعذورت دفن کی اجازت ہے۔

(۳) حجاز میں مدینۃ الرسول (صلعم) کو دونوں پتھریلی وادیوں کے اندر حرم مکہ کی طرح حرم قرار دیا گیا ہے وہاں کے شکار کو چھیڑنا درخت کاٹنا ممنوع ہے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مباح ہے وہ مدینہ کو دوسرے شہروں کی طرح کہتے ہیں ابو ہریرہؓ کی حدیث جو پہلے آچکی ہے اس پر دلیل ہے کہ مدینہ بھی محفوظ حرم ہے اگر کوئی شخص وہاں کے جانور کا شکار کرے یا درخت قطع کرے اس کی جزا بقول بعض تو یہ ہے کہ اس کے کپڑے چھین لئے جائیں اور بقول بعض اس کو تعزیر کی جائے۔

(۴) ارض حجاز کی حضور اکرم (صلعم) کے فتح کرنے کی خصوصیت سے دو قسمیں ہیں
ایک قسم صدقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو آپ نے اپنے دو حق کی بنا پر لئے ایک حق فیئ و غنائم کے خمس کا خمس۔

دوسرا حق اس فیئ کے چار خمس جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بغیر مسلمانوں کے حملے اور چڑھائی کے مرحمت فرمائے آپ نے ان دونوں حقوق میں سے کچھ تو اپنے صحابہ کو عطا فرمایا تھا اور باقی کو اپنے اخراجات و تحائف اور مصالح مسلمین میں خرچ کرتے تھے آپ کی وفات کے بعد اس کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک میراث ہے وارثوں میں تقسیم کر کے ان کو مالک بنا دیا جائے۔ اور بعض کی رائے ہے آپ کے قائم مقام امام کا حق ہے جو حفاظت سلطنت اور جہاد میں صرف کرے اور جمہور فقہا کا مذہب یہ ہے کہ یہ تمام اراضی محفوظ اور مخصوص المنافع ہیں لہٰذا ان کی آمدنی کو مصالح عامہ میں صرف کیا جائے۔

عشری علاقہ | آپ کے صدقات کے ماسوا تمام علاقہ عشری ہے خراج نہ لیا جائے

کیونکہ اس کا بعض حصہ تو مال غنیمت ہے جو اہل غنیمت کا ملک ہو گیا تھا اور بعض حصے کے لوگ وہاں رہتے ہوئے مسلمان ہو گئے تھے۔ ہر دو صورت عشر لازم ہوتا ہے خراج مقرر نہیں ہو سکتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقات آپ کے قبضہ فرمانے کی وجہ سے محصور و متعین ہیں اور حسب ذیل آٹھ ہیں۔

(۱) سب سے پہلی زمین جو آپ کی ملکیت میں داخل ہوئی مخیریق یہودی کی وصیت ہے واقدی نے بیان کیا ہے کہ مُخَیریق یہودی بنو نضیر میں ایک متبحر عالم تھا غزوۂ احد کے دن آپ ایمان لایا اس کے پاس سات زمینیں تھیں جن کے نام یہ ہیں بیت مانیہ، دلال - حسنی - برقہ - اعراف - مشربہ اس نے مسلمان ہونے کے بعد ان زمینوں کی آپ (صلعم) کے لئے وصیت کر دی اور احد کی لڑائی میں آپ کے ساتھ شریک ہو کر شہید ہو گیا۔ رحمتہ اللہ

(۲) مدینہ کی زمین جو بنو نضیر سے حاصل ہوئی یہ سب سے پہلا مال فئی تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو مرحمت فرمایا آپ نے بنو نضیر کو وہاں سے جلا وطن کر دیا ان کو ... کرنے کی ممانعت کر دی اور حکم دیدیا کہ بجز ہتھیار کے اور جو سامان اونٹوں پر لاد کر لے جا سکیں اس کی اجازت ہے یہ لوگ اپنا سامان لاد کر خیبر اور ... میں جا بسے تھے۔

بنو نضیر کے جانے کے بعد ان کی تمام زمین آپ کے قبضے میں آ گئی صرف یامین بن عمیر اور ابو سعد بن وہب کا تمام مال و جائداد میں چونکہ یہ دونوں فتح سے پہلے مسلمان ہو گئے تھے ان کے پاس رہیں - اراضی کے ماسوا باقی تمام مال آپ نے مہاجرین میں تقسیم کر دیا انصار میں سے بجز سہل بن حنیف اور ابو دجانہ

... میں اس طرح ہے اور مطبوعہ میں المعت والحسنی ہے۔

سماک بن خرشہ کے کسی کو نہیں دیا ان دونوں صاحبوں نے اپنا افلاس بیان کیا اس لئے ان کو بھی عنایت فرمایا۔ اور اراضی اپنے قبضہ میں رکھیں جو آپ کے صدقات میں سے قرار دی گئیں آپ ان کی آمدنی حسب منشا خرچ فرماتے ازواج مطہرات کو اخراجات دیتے تھے آپ کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ان اراضی کا متولی کر دیا تاکہ ان کے مصرف میں خرچ کریں۔

خیبر تیسرا، چوتھا، پانچواں صدقہ خیبر کے تین قلعے ہیں کل خیبر آٹھ قلعوں پر مشتمل تھا۔

(۱) ناعم
(۲) قموص
(۳) شق
(۴) النطاۃ
(۵) الکتیبہ
(۶) الوطیح
(۷) السلالم
(۸) صعب بن معاذ کا قلعہ۔ سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ناعم کو فتح فرمایا محمود بن مسلمہ کا بھائی اسی وقت مقتول ہوا اس کے بعد قموص کو فتح فرمایا۔ یہ ابن ابی حقیق کا قلعہ تھا اس کی سبایا میں سے آپ نے صفیہ بنت حیی بن اخطب کو انتخاب فرمایا پہلے کنانہ بن ربیع بن ابی حقیق کے پاس تھیں آپ نے آزاد کر کے اپنے نکاح میں لے لیا اور آزادی کی مہر قرار دیا اس کے بعد صعب بن معاذ کا قلعہ فتح فرمایا یہ خیبر کا سب

بڑا قلعہ ہے اس میں مال، دولت، پیداوار اور مواشی بکثرت تھے۔ اس کے بعد شق۔ نطاۃ کتیبہ کو فتح کیا۔ یہ چھ قلعہ تو بزور فتح ہوئے ان کے بعد وطیح و سلالم خیبر کی آخری فتوح ہیں جو مصالحت سے ہوئیں آپ نے کچھ روز تک ان کا محاصرہ رکھا باشندوں نے درخواست کی کہ ہمیں سلامتی و حفاظت کے ساتھ یہاں سے جانے دیجئے آپ نے منظور فرما لیا۔ ان آٹھوں میں سے تین قلعے کتیبہ، وطیح سلالم آپ نے اپنی ملکیت میں رکھے کتیبہ کو بحیثیت خمس لیا اور وطیح و سلالم اللہ تعالیٰ نے صلحاً فتح ہونے کی وجہ سے آپ کو بطور فئے مرحمت فرمائے۔ بہر حال یہ تینوں قلعے فئے و خمس کے استحقاق سے خالص آپ کے ہوئے اور آپ کے صدقات میں داخل ہوئے اور پانچ قلعے اور ان کے ساتھ وادی خیبر وادی سریر اور وادی حاضر کو غانمین میں اٹھارہ سہام پر تقسیم کیا مقسوم علیہم کی تعداد ایکہزار چار سو تھی یعنی کل اہل حدیبیہ عام اس سے کہ خیبر میں شریک ہوئے یا نہیں ہوئے۔ شریک نہ ہونے والے صرف جابر بن عبداللہ تھے ان کو شرکاء خیبر کے برابر حصہ دیا گیا ان میں دو سو سوار تھے جن کو چھ سو حصے دیئے گئے کل حصے ایکہزار آٹھ سو ہوئے گویا فی صد ایک سہام دیا گیا۔ اور اس طرح کل سہام اٹھارہ ہوئے۔ آپ کا چھٹا صدقہ نصف فدک تھا خیبر کی فتح کے بعد اہل فدک آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور محیصہ بن مسعود کی سفارت سے اس شرط پر مصالحت کر لی کہ نصف اراضی فدک اور اس کے کھجور کہ آپ اس کا مقاسمہ کرا لیا کریں۔ آپ کے اور نصف اہل فدک کے حضرت عمر رض نے اپنے عہد میں جب ذمیوں کو حجاز سے جلا وطن کیا تو فدک سے ان کو بھی نکال دیا اور فدک کی قیمت لگا کر آدھی یعنی ساٹھ ہزار درہم ان کے حوالے کر دیئے قیمت لگانے والے مالک بن تیہان سہل ابن حشمہ اور زید بن ثابت

تھے اس کے بعد آدھا فدک تو آپ کے صدقات کا رہا اور آدھا عامۃ المسلمین کے لئے ہوگیا مگر اب ہر دو نصف کا مصرف ایک ہے ساتواں صدقہ وادی القری کا ثلث ہے اس وادی کا ایک ثلث بنو عذرہ کا تھا اور دو ثلث یہودیوں کے تھے یہودیوں سے آپ نے نصف پر مصالحت کرلی جس سے اس کے تین حصے ہوگئے ایک ثلث آپ کے صدقات کا ۔ دوسرا یہودیوں کا تیسرا بنو عذرہ کا حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو جلاوطن کردیا اور قیمت لگا کر جو ۹۰ ہزار دینار ہوتی تھی ان کے حوالے کی اور بنو عذرہ سے کہا کہ تم چاہو تو جو قیمت ہم نے ادا کی ہے اس کا نصف ہمیں دو آدھی تمہیں دیدیں گے انھوں نے منظور کرکے ۹۰ ہزار کے نصف پینتالیس ہزار دینار ادا کردیئے حضرت عمرؓ نے آدھی وادی ان کو دیدی اور آدھی میں کل کا ایک ثلث حضور کے صدقات کا اور ایک سدس عامۃ المسلمین کا رہا اب اس پورے نصف کا مصرف ایک ہے ۔ آٹھواں صدقہ مدینہ میں بازار مہرذر کا مقام ہے جس کو مروان نے حضرت عثمانؓ سے بطور جاگیر لے لیا تھا ۔ جس سے لوگوں میں برہمی پھیل گئی مگر ممکن ہے آپ نے یہ جاگیر بطور کفالت کے دی ہو تملیک نہ ہو اس سے جواز کی صورت نکل آتی ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان آٹھوں صدقات کو اہل سیر اور بڑے بڑے رویان مغازی نے بیان کیا ہے ۔ صحت کو اللہ جانتا ہے ان کے علاوہ آپ کے اور مال کے متعلق واقدی کا بیان ہے کہ آپ کو اپنے والد عبداللہ کی میراث میں ام ایمن حبشیہ برکت نامی ، پانچ اونٹ کچھ بکریاں ملی تھیں کہا جاتا ہے کہ آپ کا سولی شقران اور ایمن کا بیٹا صالح بھی جو بدر میں شریک ہوا تھا ملے تھے اور اپنی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہب زہریہ کی میراث سے ان کا مکان واقعہ شعب بنی علی ملا تھا جس میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی تھی اور اپنی زوجہ خدیجہ بنت خویلدؓ

کی میراث سے ان کا مکان جو صفا و مروہ کے درمیان سوق عطارین کے پیچھے
واقع تھا اور مختلف مال ملا۔ حکیم بن خزام نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لئے
سوق عکاظ سے زید بن حارثہ رضی کو چار سو درہم میں خریدا تھا پھر خود رسول اللہ صلعم نے
زید کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے مانگ لیا اور آپ نے آزاد کر کے ام ایمن سے
نکاح کر دیا ام ایمن کے بطن سے اسامہ بن زید آپ کو نبوت ملنے کے بعد پیدا
ہوئے۔

ہجرت کے بعد

آپ کی ہجرت کے بعد آپ کے دونوں مکان عقیل
بن ابی طالب نے فروخت کر دیئے حجۃ الوداع کے
موقع پر جب مکہ تشریف لائے تو لوگوں نے دریافت کیا کہ حضور اکرم آپ کون
سے مکان میں قیام فرمائیں گے آپؐ نے فرمایا کیا عقیل نے ہمارا کوئی گھر چھوڑا
ہے عقیل کے فروخت کردہ مکانوں کو آپؐ نے پھر نہیں لیا کیونکہ عقیل کے
بیع کے وقت مکہ دار الحرب تھا لہٰذا مکانات تلف شدہ مال کے حکم میں
ہو کر آپ کے صدقات سے خارج ہو گئے اور آپؐ کی ازدواج یعنی
امہات المومنین کے مکانات کی بابت یہ ہے کہ اگر آپ نے ہر ایک کے مسکونہ
مکان کو اس کے لئے وصیت فرما دی ہے اور ملک کر دیا ہے تو اس صورت میں
آپ کے صدقات سے خارج ہیں اور اگر محض رہنے کا حق دیا ہے تو آپ کے
صدقات میں داخل ہیں مگر اب تمام مکانات مسجد میں آ گئے میرا خیال ہے
اس سے خارج نہیں رہا۔ آپ کے کجاوے اور اسلحہ کے متعلق ہشام بن
عروہ بن حکم سے راوی ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی تلوار۔ سواری اور نعلین علی کرم اللہ وجہہ کو دے دیئے اور یہ کہا کہ
علاوہ صدقہ ہے اسود عائشہ رضی اللہ عنہا سے راوی ہیں کہ جب آپ

کی وفات ہوئی آپ کی زرہ تیس صاع جو میں ایک یہودی کے پاس رہن تھی اگر یہ زرہ وہی ہے جو بتر اُ کے نام سے مشہور تھی تو بیان یہ کیا جاتا ہے کہ حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی شہادت کے وقت ان کے بدن پر تھی اور عبید اللہ بن زیاد نے لے لی جب مختار نے عبید اللہ بن زیاد کو قتل کر دیا تو وہ عباد بن حصین حنظلی کے ہاتھ آئی عباد سے خالد بن عبد اللہ بن خالد بن اسید امیر بصرہ نے مانگی عباد نے انکار کیا تو سو ضرب کوڑے لگائے عبد الملک بن مروان نے لکھ کر بھیجا کر عباد جیسے کو مارنا نہ چاہیے تھا قتل کر دیتے یا معاف کر دیتے۔ اس کے بعد زرہ کا کچھ حال معلوم نہیں۔ ردائے مبارک کے متعلق اختلاف ہے ابان بن ثعلب کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن زہیر کو ہبہ فرما دی تھی ان سے معاویہ رضی اللہ عنہ نے خرید لی اسی کو خلفا اوڑھتے رہتے ہیں۔

ادائے نبوی بطور امان

ضمرہ بن ربیعہ کہتے ہیں کہ یہ چادر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایلہ کو بطور امان کے مرحمت فرمائی تھی ان سے سعید بن خالد بن ابی ادنی نے جو ان پر مروان بن محمد کی طرف سے عامل مقرر تھا لیکر مروان کے پاس بھیج دی اس کے خزانے میں رہی اور پھر اس کے قتل کے بعد لے لی گئی۔ بعض کا قول ہے کہ ابو العباس سفاح نے تین سو دینار میں خرید لی۔ عصائے مبارک بھی آپ کے ترکہ میں موجود تھا جو صدقہ قرار دیا گیا ردائے مبارک اور عصا دونوں شعار خلافت ہوگئے خاتم مبارک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر رضی اللہ پھر عمرؓ پھر عثمان رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے پہنا حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے کنوئیں میں گر گئی اور پھر نہ ملی۔ رسول اللہ صلعم کے صدقہ اور ترکہ کا بیان ختم ہوا۔

دوسرے علاقے اور ان کی قسمیں حرم و حجاز کے سوا دوسرے علاقوں کی چار قسمیں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں

(۱) قسم یہ ہے اس کے باشندے مسلمان ہوجائیں۔ یہ عشری زمین ہے۔

(۲) قسم یہ ہے کہ اس کو مسلمان آباد کریں یہ بھی عشری ہے۔

(۳) قسم یہ ہے کہ مسلمان بزور شمشیر اس پر قبضہ کرلیں یہ بھی عشری ہے۔

(۴) قسم یہ ہے اس کے باشندوں سے مصالحت ہوجائے یہ فئے ہوتی ہے اور اس پر خراج مقرر کیا جاتا ہے۔

اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) وہ جس کی بابت اس شرط پر مصالحت ہو کہ زمین ان کی ملک نہ رہے نہ بیع و رہن کرسکیں اس پر خراج بطور کرایہ زمین مقرر ہوتا ہے جو اسلام لانے سے بھی ساقط نہیں ہوتا یہ خراج اس زمین کے مسلم و ذمی باشندوں سے بھی لیا جاتا ہے۔

(۲) وہ جس کی بابت اس شرط پر مصالحت ہو کہ زمین ان کی ملک رہے ان کو بیع و رہن کے اختیارات ہوں اس کا خراج جزیہ کے حکم میں ہوگا جو اسلام کے لانے سے ساقط ہوجاتا ہے ذمیوں سے لیا جاتا ہے۔ مسلمانوں سے نہ لیا جائے۔ تقسیم بلاد سے فارغ ہونے کے بعد ہم ارض سواد کے احکام تشریح کرتے ہیں کیونکہ اس میں فقہا کے احکام اصول اصولی حیثیت رکھتے ہیں جن پر اور نظائر کو قیاس کیا جاسکتا ہے اس سواد سے مراد سواد عراق ہے جس کو مسلمانوں نے عمرؓ کے عہد خلافت میں عراق کے علاقے میں فتح کیا تھا۔ اس زمین کو سواد باغوں اور کھیتوں کی سواد کی وجہ سے کہتے ہیں چونکہ جزیرۃ العرب خشک علاقہ ہے جس میں زراعت اور باغات

کا نام نہیں جب عرب اپنے گھروں سے باہر نکلے تو کھیتوں اور باغوں کی سبزی نظر آئی سبزی اور سیاہی کو یہ لوگ ایک نام سے موسوم کرتے تھے۔

سواد کا علاقہ سواد طول میں موصل جدید سے عبادان تک اور عرض میں عذیب قادسیہ سے حلوان تک ہے یعنی طول ۱۶۰ فرسخ اور عرض ۸۰ فرسخ ہے۔ اور عراق عرض میں سواد کے عرض کو شتمل ہے اور طول میں سواد کے طول سے کسی قدر کم ہے کیونکہ دجلہ کی شرقی جانب علث سے اور غربی جانب حربی سے شروع ہو کر بصرہ کے آخری علاقے جزیرہ عبادان تک پھیلا ہوا ہے لہٰذا طول ۱۲۵ فرسخ یعنی سواد کے طول سے ۳۵ فرسخ کم ہے اور عرض سواد کی طرح ۸۰ فرسخ ہے۔ قدامتہ بن جعفر کا بیان ہے کہ اس کا رقبہ دس ہزار فرسخ ہے فرسخ کی لمبائی ذراع مرسلہ سے بارہ ہزار ذراع اور ذراع مساحت یعنی ذراع ہاشمیہ سے نو ہزار ذراع ہے تکسیر کے قاعدہ سے اسی عدد میں ضرب دینے سے ایک ربع فرسخ بائیس ہزار پانچسو جریب کا ہوتا ہے اس کو دس ہزار فرسخ میں ضرب دی جائے تو بائیس کروڑ پچاس لاکھ جریب رقبہ ہوتا ہے اس میں سے ٹیلو شور زمینوں، قلعوں، پک ڈنڈیوں، راستوں نہروں، شہروں، بستیوں، پن چکیوں ڈاکخانوں، پلوں، بندرگاہوں فواروں نیستانوں اور اینٹ کی بھٹیوں وغیرہ کا رقبہ تخمیناً سات کروڑ پچاس لاکھ جریب نکال کر پندرہ کروڑ جریب رقبہ باقی رقبہ رہتا ہے اس میں سے نصف نکال دیا دیا جائے تو نصف کاشت کا رقبہ ہے اس کے ساتھ ہی کل رقبہ کی کھجور، انگور اور دوسرے درختوں کی پیداوار مزید ہے جب قدامہ کی بیان کردہ پیمائش سواد کا بقیہ حصہ یعنی پینتیس فرسخ اور ملایا جائے تو تقریباً ایک ربع کی زیادتی ہوتی اور یہ مجموعہ سواد کی زمین سے زراعت و باغات کے قابل رقبہ نکلتا ہے زراعت

زراعت کی پوری پوری مقدار معلوم کرنا مشکل ہے بسا اوقات آفات ارضی وسماوی سے بیشمار حصہ برباد ہوجاتا ہے کہتے ہیں کہ کسری قباذ کے عہد میں سواد کا رقبہ پندرہ کروڑ جریب تھا اور کل آمدنی اٹھائیس کروڑ ستر لاکھ درہم (بوزن سبعہ) تھی کیونکہ وہ فی جریب ایک درہم اور ایک فقیز قیمتی تین درہم (بوزن مثقال) لیتا تھا، حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں کاشت کا رقبہ تین کروڑ بیس لاکھ سے تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب تک تھا۔ سواد کی فتح اور اس کے حکم میں فقہا کا اختلاف ہے اہل عراق کا مذہب یہ ہے کہ بزور شمشیر فتح ہوا لیکن عمرؓ نے غانمین کی ملک کر دیا بعد کو آپ کے کہنے سے سب دست بردار ہو گئے جن پر لوگوں کو معاوضہ مال دینا پڑا اور جب مسلمانوں سے لے لیا تب اس پر خراج مقرر کیا۔ سواد کے حکم میں اصحاب شافعی مختلف ہیں۔ ابو سعید اصطخری کا مذہب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کو عامۃ المسلمین پر وقف کر کے اصل باشندوں کے پاس رہنے دیا اور بطور اجرت کے زمین پر سالانہ خراج مقرر کر دیا اور مصلحت عامہ کے خیال سے اس کی مدت معین نہیں فرمائی وقف کرنے سے یہ اُن اراضی میں شامل ہو گیا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو بطور فئے مرحمت فرمائی تھیں جیسے خیبر، عوالی اور بنو نضیر کی جائدادیں۔ اس کی آمدنی مصالح عامہ میں صرف کی جائے خمس نہ لیا جائے۔ کیونکہ پہلے لیا جا چکا ہے۔ نہ مصارف لشکر کے لئے مخصوص کی جائے عام مسلمانوں کا حق ہے لہٰذا لشکر کے مصارف چھاؤنیوں کا استحکام۔ جمعہ پڑھنے کی مساجد۔ پل نہروں کی کھدائی، قاضیوں۔ گواہوں، فقہا۔ قاریوں، اماموں اور موذنوں کی تنخواہوں وغیرہ میں صرف کی جائے اسی وجہ سے اس کی بیع ممنوع ہے صرف منافع زمین اور عمال قبضہ پر معاوضہ ہوتا ہے۔ ثبوت ملک پر نہیں ہوتا ہاں اس زمین پر

جو درخت اور مکانات ہوں ان کی بیع کر سکتے ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ سواد کو حضرت عمرؓ نے علی ابن ابی طالب اور معاذ بن
جبل رضی اللہ عنہما کی رائے سے وقف کیا تھا اور ابوالعباس بن سریج اور چند
شافعی حضرت یہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے سواد سے غانمین کو دست بردار
کرا کر وہاں کے چودھریوں کے ہاتھ سالانہ خراج کے عوض فروخت کر دیا تھا
گویا خراج بمنزلۂ قیمت کے تھا۔

یہ صورت مصالح عمومی میں جائز ہے جیسا کہ اجارہ میں اس کو جائز کیا
گیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ سواد کی زمین فروخت کرنا جائز ہے اس سے تملیک
ثابت ہو جائے گی۔

مقرر کردہ خراج کی مقدار کے متعلق عمرو بن میمون کا بیان ہے کہ جب عمرؓ
نے سواد سے دست برداری حاصل کر لی تو حذیفہ کو دجلہ کے اس پار اور
عثمان بن حنیف کو اس پار بھیجا شعبی کا قول ہے کہ عثمان بن حنیف نے سواد کی
پیمائش کی تو تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب پر ایک درہم اور ایک قفیز خراج مقرر کیا
قاسم کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ قفیز ان لوگوں کا ایک پیمانہ ہے جس
شابرقان کہتے تھے یحیٰ ابن آدم کہتے ہیں کہ یہ وہی حجاجی مہر شدہ ہے۔

اُفتادہ اراضی اور آبپاشی

جو شخص بیکار زمین کو باذن امام یا بلا اذن آباد کرے اس کا مالک ہوجاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رح فرماتے ہیں کہ بلا اذن آباد کرنا جائز نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر شخص کا وہی کام درست ہے جو اس کے امام کی مرضی سے ہو۔ اور آپ (صلعم) کے اس ارشاد سے کہ ہر شخص مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اس کا مالک ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملکیت کے لئے اذن ضروری نہیں۔ امام شافعی رح کے نزدیک اموات سے مردہ زمین مراد ہے جس میں آبادی نہ ہو آبادی سے متعلق ہو اور متصل ہونے میں کچھ حرج نہیں امام ابوحنیفہ رح فرماتے ہیں کہ اموات جو زمین آبادی سے بعید ہو اور اس کے پاس پانی نہ پہنچتا ہو۔ امام ابویوسف رح فرماتے ہیں کہ موات وہ زمین ہے کہ اس کے سرے پر جو آباد زمین سے قریب ہے اگر کوئی شخص کھڑا ہو کر آواز دے تو آواز میں میں کنارے پر کھڑے ہونے والے آدمی نہ سن سکیں اور دونوں قول پر آبادی سے متصل زمین موات سے خارج رہے گی آباد کرنے والا شخص اس زمین سے قریب تر رہتا ہو یا دور دونوں مساوی۔ امام مالک رح کے نزدیک قریب رہنے والا بعید والے سے احق ہے آباد کرنے کی صورت عرف پر موقوف ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے مطلق ذکر فرمایا ہے اور کیفیت کو عرف پر چھوڑ دیا پس اگر سکونت کی نیت سے آباد کرے تو کوئی مکان بنانا اور اس پر چھت ڈالنا شرط ہے اس لئے کہ یہ تعمیر کی بالکل ابتدائی حالت ہے جس سے سکونت کا استفادہ ممکن ہوتا ہے اور اگر درخت لگانے یا کاشت کرنے کے لئے آباد کرے تو تین شرطیں ہیں۔

(۱) اس کے چاروں طرف مٹی جمع کر کے ڈول بنانا تاکہ حد فاصل بن جائے۔

(۲) اگر زمین خشک ہو تو پانی لانا اور زیر آب ہو تو پانی کو روکنا کیونکہ ان کو آباد کرنے کی یہی صورت ہے تاکہ زراعت اور باغ لگانا ممکن ہو۔

(۳) تمام زمین میں ہل وغیرہ چلا کر اونچ نیچ درست کرنا ان تینوں شرطوں کی تکمیل کے بعد زمین آباد سمجھی جائے گی۔ آباد کنندہ اس کا مالک ہو جائے گا بعض اصحاب شافعیؒ کا یہ قول ہے کہ زراعت کرنے یا درخت لگانے سے قبل مالک نہیں ہوتا" غلط ہے زراعت کرنا سکونت کے مثل ہے جبکہ مکان بنا کر آباد کرنے کی صورت میں سکونت شرط ملکیت نہیں تو زراعت بھی شرط ملکیت نہیں ہو سکتی۔

کاشت کار اگر آباد کر کے کسی کو کاشت کاری کے لئے دیدے تو آباد کنندہ زمین کا اور مثیر (ہل چلانے والا) عمارت کا مالک ہوگا لہٰذا مالک زمین زمین کو فروخت کرے تو جائز ہے اور مالک عمارت کو بیع کرے تو اس میں اختلاف ہے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر اثارت اس کی ہو تو بیع جائز ہے ورنہ نہیں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ہر حال میں جائز ہے وہ کاشت کار کو عمارت کی وجہ سے زمین میں شریک قرار دیتے ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس عمارت کا فروخت کرنا بالکل جائز نہیں۔ البتہ اگر اس کی اشیائے عینیہ مثلاً زراعت یا درخت وغیرہ اس میں کھڑے ہوں تو ان کو فروخت کر سکتا ہے اثارت کو فروخت نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص موات کے گرد باڑ قائم کر دے تو دوسرے

کی بہ نسبت یہ شخص آباد کرنے کا زیادہ حقدار ہوگا اور اگر کوئی اس پر تغلب کر کے آباد کرے تو وہ باڑ لگانے والے سے زیادہ احق ہو جائے گا۔

اگر باڑ لگانے والا زمین کو آباد کرنے سے پہلے فروخت کرنا چاہے تو بظاہر امام شافعیؒ کے نزدیک ناجائز ہے مگر ان کے اکثر اصحاب جائز کہتے ہیں کیونکہ جب باڑ لگانے سے اس کا حق زیادہ ہو گیا تو املاک کی طرح اس کی بیع بھی جائز ہونی چاہیئے۔ پس اگر بیع کرنے کے بعد کسی نے مشتری کے ہاتھ سے تغلب کر کے زمین کو آباد کر لیا تو شافعیہ میں سے ابن ابی ہریرہ کا خیال ہے کہ مشتری کے ذمے اس کی قیمت واجب الادا ہے کیونکہ اس کے قبضے میں آنے کے بعد ضائع ہوئی ہے اور دوسرے شافعیہ جو جواز بیع کے قائل ہیں یہ کہتے ہیں کہ اس سے قیمت ساقط ہو جائے گی کیونکہ ہنوز اس کا قبضہ مکمل نہیں ہوا اور بالفرض باڑ لگا کر پانی پہنچا دیا مگر کھیتی شروع نہیں کی تو پانی کا اور جس بیکار زمین میں پانی ... کر آئے مع اس کی بٹی کے مالک ہو جائے گا اس کے علاوہ زمین کا مالک ... ہو گا مگر احق ضرور ہو گا لہٰذا جتنی زمین میں پانی چل رہا ہو اس کو بیع کر سکتا ہے ... اس کے سوا باڑ لگی ہوئی کے فروخت کرنے میں وہی دو صورتیں ہیں ... اوپر بیان ہو چکیں۔ بیکار زمین کو آباد کرنے کے بعد عشر لیا جائے خراج لینا ... نہیں خواہ عشر کے پانی سے سیراب ہو یا خراج کے امام ابو حنیفہؒ وابو ... ؒ فرماتے ہیں کہ عشری پانی سے سیراب ہو تو عشر اور خراجی پانی سے ... اب ہو تو خراج لیا جائے امام محمد بن حسنؒ فرماتے ہیں کہ اگر عجمیوں کی ... ی ہوئی نہر سے آباد کی جائے تو خراج لیا جائے اور قدرتی نہر (مثلاً ... و فرات) سے سیراب ہو تو عشر لیا جائے۔

علمائے عراق اس پر متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص بصرہ

کی مردہ اور تر اراضی کو آباد کرے تو وہ عشری ہوں گی محمد بن حسن کے قول پر تو اس لئے کہ بصرہ کا دجلہ قدرتی نہروں میں سے ہے اور دوسری نہریں بعد کے مسلمانوں کی بنوائی ہوئی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے قول پر ان کے متبعین میں اختلاف ہے بعض یہ علت بیان کرتے ہیں کہ خراج کا پانی دجلۂ بصرہ اور اس کے جزر (جوار) میں آکر خشک ہو جاتا ہے اور بصرہ کی اراضیات مد سے سیراب ہوتی ہیں اور مد سمندر میں ہوتا ہے دجلہ وفرات میں نہیں ہوتا مگر یہ علت فاسد ہے کیونکہ مد سے صرف شیریں پانی بڑھتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ سمندر کا پانی اس میں مل جاتا ہو یا اس سے زمین سیراب ہوتی ہو۔ چاہیئے سمندر دجلہ اور فرات کو سیراب کرے مگر زمین کی سیرابی صرف دجلہ اور فرات کے پانی سے کی جاتی ہے اور بعض حنفیہ جن میں طلحہ بن آدم بھی ہیں کہتے ہیں کہ اس کی علت یہ ہے کہ دجلہ وفرات کا پانی وادیوں میں رک کر اس کے حکم سے نکل جاتا ہے حتیٰ کہ اس سے انتفاع بھی نہیں ہو سکتا اور پھر دجلہ بصرہ میں بہہ کر آتا ہے لہٰذا خراجی پانی نہ ہو کیونکہ وادیاں خراج کی نہریں نہیں ہیں یہ علت بھی فاسد ہے کیونکہ عراق کی وادیاں اسلام سے پہلے کی ہیں لہٰذا زمین کا حکم بدل گیا اور موات کے حکم میں ہو گئی۔ اور پانی کے حکم کا اعتبار نہیں کیا گیا مورخین نے اس کا یہ سبب بیان کیا ہے کہ پہلے دجلہ کا پانی اس دجلہ میں حل کر جو عوزر کے نام سے مشہور ہے مدائن کے پاس دجلہ بصرہ تک پہنچتا تھا۔ اور وہاں سے سیدھی اور محفوظ نہروں سے گذرتا تھا۔ موجودہ وادیوں کی جگہ پہلے کھیتیاں اور بڑی بڑی آبادیاں تھیں بادشاہ قباد بن فیروز کے زمانہ میں کسکر کے نیچے بے خبری میں بڑی ٹوٹ گئی تھی پانی چڑھ آیا اور اکثر عمارتیں تباہ ہو گئیں۔ جب اس کا بیٹا نوشیرواں تخت نشین ہوا تو اس نے پانی نکالنے کا حکم دیا اور بڑے بڑے انعامات مقرر کئے

اس زمین کا بہت سا حصہ پھر آباد ہو گیا ۶ھ ہجری تک یہی کیفیت رہی اسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدا بن حذافہ کو کسری کے پاس قاصد بنا کر بھیجا تھا یہ کسریٰ پرویز تھا۔ اور دجلہ و فرات میں غیر معمولی طغیانی آئی جو پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ پٹڑی جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی پرویز نے اس کے بند لگانے میں انتہائی کوشش صرف کی ایک دن میں ستر جگہ سے درستی ہوئی اور بے دریغ روپیہ صرف کیا مگر پانی روکنے کے لئے کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اتنے میں عراق پر مسلمانوں کے حملے ہوئے اہل فارس لڑائیوں میں مصروف ہو گئے پٹڑیاں دھڑا دھڑ ٹوٹتی رہیں اور کوئی توجہ نہ ہو سکی اہل دیہات نے لاکھ بند کرنے کی سعی کی مگر کچھ کام نہ چلا بالآخر ایک بہت بڑی جھیل بن گئی۔

امیر معاویہ کا واقعہ جب معاویہؓ نے اپنے مولی عبداللہ بن دراج کو عراق کا عامل بنا کر بھیجا تو اس نے بہت کچھ علاقہ ل کر آباد کیا جس کی آمدنی پچاس لاکھ درہم ہوئی اس کے بعد حسان نبطی نے ید بن عبدالملک کے عہد میں اور علاقہ نکالا پھر ہشام کے عہد میں اور علاقہ ہوا اب ہمارے زمانہ میں اس حالت پر ہے بلکہ خشک علاقہ جھیل کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہو گیا علماء حنفیہ کی بیان کردہ یہ علت رہ بالا تفصیل کے دیکھتے ہوئے گویا صحابہ کے اس اجماع کا عذر ہے رہ اور تمام آباد کردہ آراضی عشری ہیں مگر دراصل اس کی (عشری ہونے کی) صرف بیکار زمین کا آباد کرنا ہے۔

آباد کردہ زمین کا حریم (متعلقہ میدان) امام شافعیؒ کے نزدیک وہ ہے کہ جس کے بدون کام نہ چل سکے۔ مثلاً راستہ۔ صحن اور پانی کی جگہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ زراعت کی زمین کا حریم وہ ہے

جواس سے اتنے فاصلہ پر ہو کہ اس کا پانی اس تک نہ پہنچ سکے امام ابو یوسفؒ
کہتے ہیں اس کا حریم وہاں تک ہے جہاں تک اس کی حدود پر کھڑے ہو کر
پکارنیوالے کی آواز پہچان سکے۔ ان دونوں قول کا مقتضایہ ہے کہ دو عمارتیں
یا دو مکان ایک دوسرے سے قطعًا متصل نہیں ہو سکتے صحابہ رضوان اللہ
علیہم اجمعین نے عہدِ فاروقی میں بصرہ آباد کرنے کے جب مکانات کے
خطوط کھینچے اور ہر قبیلہ کا الگ محلہ تجویز کیا تو شارع اعظم جو مربد (اونٹ
باندھنے کی جگہ) کے کام بھی آتا تھا ساٹھ ہاتھ چوڑا رکھا اس کے علاوہ اور راستوں
کا عرض بیس بیس ہاتھ کوچوں کا عرض سات سات ہاتھ رکھا ہر محلہ کے وسط میں
ایک بڑا چوک متقابلا اور اونٹ باندھنے کے لئے رکھا تمام مکانات متصل
رکھے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اتفاق رائے سے ہوا تھا لہٰذا اس کے خلاف
کرنا جائز نہیں ہے بشیر بن کعب ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب لوگوں میں راستہ پر جھگڑا ہو تو سات ہاتھ مقرر
کرو۔

پانی کی قسمیں پانی کی تین قسمیں ہیں۔ نہری۔ کنویں کا۔ نہروں کا کی
تین قسمیں ہیں۔

(۱) قدرتی بڑے دریا جن کو آدمیوں نے نہ بنایا ہو جیسے دجلہ فرات
ان کو رافدین کہتے ہیں ان کے پانی سے زراعت اور پینے کی تمام
ضرورتیں پوری ہوتی ہیں ناکافی ہونے کا احتمال ہی نہیں ان میں
جھگڑے اور نزاع کی صورت پیش نہ آئے گی ہر شخص حسب ضرورت
اس کے پانی سے کھیتی کو پانی دے یا تالاب میں جمع کرے۔ جائز
ہے کسی کو ممانعت نہیں ہے۔

(۲) قدرتی چھوٹی نہریں ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن میں بغیر روکے
نی بکثرت اور تمام باشندوں کے لئے کافی ہو اس سے ہر زمین والا
قت ضرورت اپنی زمین سیراب کرنے کا مجاز ہے کوئی تعرض نہیں کر
ر بعض لوگ اس میں سے دوسری نہر نکالنا چاہیں تو اگر اس نہر والوں کے لئے مضر
ہو تو نکالنے سے روک دیا جائے ورنہ نہیں۔ دوسری وہ جن میں پانی کم ہو روکنے
ے بلند ہوتا ہو اس کا حکم یہ ہے کہ جو شخص نہر کے اوپر سب سے اول ہو پہلے
سیراب کرے۔ وہ فارغ ہو جائے تو جو اس سے متصل ہو وہ پانی روک کر
نی زمین سیراب کرے۔ عبادہ بن صامت راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ
یہ وسلم نے کھجوروں کو سیلاب سے سیراب کرنے میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اوپر
پہلے سیراب کرے اور وہ اپنے سے نیچے والے کے لئے پانی چھوڑ دے
ں تک کہ آخر میں سب سے نیچی زمین والے کے پاس پانی پہنچ جائے

ی کا رکنا

پانی رکنے کی مقدار کے متعلق محمد بن اسحاق ابو مالک
بن ثعلبہ اور وہ اپنے والد سے راوی ہیں کہ رسول اللہ
لی اللہ علیہ وسلم نے وادی مہزور میں یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ پانی کو زمین میں
ں تک آنے دیا جائے اس کے بعد دوسرے کے لئے چھوڑ دیا جائے
ں کہتے ہیں کہ بطحان کے سیلاب میں بھی یہی فیصلہ فرمایا تھا یہ فیصلہ
ر قرا اور زمانے کے لئے عام نہیں ہے بلکہ ضرورت کے اعتبار سے
ف ہے۔ اختلاف کی پانچ صورتیں ہیں۔
زمینیں مختلف ہوں یعنی بعض تھوڑے پانی سے اور بعض زیادہ سے
سیراب ہوں۔
کاشت مختلف ہو کیونکہ کھیتی کو سیراب کرنے کی مقدار اور ہے اور

کھجوروں اور درختوں کو سیراب کرنے کی اور
(۳) گرمی اور سردی سے اختلاف ہو۔ کیونکہ دونوں زمانوں میں سیراب کرنے کی مقدار بدل جاتی ہے۔
(۴) زراعت کو اس کے وقت اور وقت سے پہلے سیراب کرنے سے بھی سیرابی مختلف ہوتی ہے۔
(۵) کہیں پانی دائمی ہوتا ہے اور کہیں وقتی جس کو آئندہ ضرورت کے لئے جمع کرنا ضروری ہے اور دائمی میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان پانچ مختلف حالات سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ معین نہ تھا بلکہ عرف وضرورت کے لحاظ سے تھا اگر کوئی شخص اپنی زمین کو سیراب کرلے اور پانی بہہ کر ہمسائے کی زمین کو غرق کردے تو یہ ضامن نہیں کیونکہ اپنی ملکیت میں مباح تصرف کر رہا تھا۔ اگر اس غرق شدہ زمین میں مچھلیاں پیدا ہو جائیں تو شکار کا حق ثانی کو ہے کیونکہ اس کی زمین میں پیدا ہوئیں اول کو نہیں۔

نہریں تیسری قسم کی وہ نہریں ہیں جن کو آدمی اپنی اراضی سیراب کرنے کے لئے کھودیں تو ایسی نہر کھودنے والوں کی مشترک ملکیت ہے جیسے گذرنے کا کوچہ کہ کوئی خاص شخص اس کا مالک نہیں ہوتا اگر ایسی نہر بصرہ میں ہو اور اس میں سمندر کے چڑھاؤ کا پانی آتا ہو تو تمام باشندوں کے لئے نزاع کی یا پانی روکنے کی نوبت نہ آئے گی پانی بکثرت اور چڑھاؤ کی وجہ سے خود بلند ہوگا پھر سیرابی کے بعد اتار کے زمانے میں روک دیا جائے اور اگر ایسی نہر بصرہ کے سوا ایسے علاقے میں ہو جس میں مد وجزر نہ ہو تو نہر کھودنے والوں کی ملک ہے دوسرے لوگ نہ اس

سے سیراب کر سکتے ہیں نہ اس کا پانی جمع کر سکتے اور نہ اس کے حصہ داروں
میں سے کوئی شخص بغیر دوسروں کی مرضی کے سیراب کرنے یا پانی بلند کرنے
یا پن چکی لگانے کا مجاز ہے کیونکہ پانی میں سب شریک ہیں جیسا کہ گلیوں میں
بلا سب کی رضا مندی کے کسی کو دروازہ کھولنے یا چھجہ لگانے کا حق نہیں۔
اس نہر سے سیراب کرنے کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) تھوڑے آدمی ہوں تو دونوں سے نوبت مقرر کر لیں زیادہ ہوں تو گھنٹے
مقرر کر لیں اور ترتیب میں نزاع ہو تو قرعہ اندازی سے فیصلہ کر لیں ہر
شخص اپنی اپنی نوبت میں سیراب کریں دوسرا شریک نہ ہو۔

(۲) یہ ہے کہ نہر کا دھانہ عرضاً ایک تختہ سے بند کر دیا جائے اور تختے میں
اپنے اپنے حق کے موافق سوراخ کھود لیئے جائیں اور ہر شخص اپنے
سوراخ کا پانی اپنی زمین کی طرف لے جائے۔

(۳) صورت یہ ہے کہ اتفاق رائے سے یا پیمائش اراضی کے اعتبار
سے ہر شخص اپنی اپنی زمین طرف گول کھود دے تاکہ ہر ایک شریک اپنے اپنے
حق کے موافق پانی لے سکے اس صورت میں تمام شرکاء اس کے ساتھ مساوی
حق دار ہوں گے یہ اور اس کے شرکاء میں سے کوئی شخص کسی کے حصے کو کم و
بیش کرنے کا مجاز نہیں اور نہ یہ حق ہے کہ مقدم شرب (پانی کا راستہ) کو موخر کر لے
جیسے گلی میں موخر دروازے کو مقدم کرنا درست نہیں اور نہ یہ حق ہے کہ موخر شرب
کو مقدم کرے اگرچہ موخر دروازہ کو مقدم کرنا جائز ہے کیونکہ موخر دروازہ کو مقدم
کرنے میں کسی قدر اپنا حق چھوٹتا ہے اور شرب مقدم کرنے میں حق سے زیادہ
لینا لازم آتا ہے۔

اس بنائی ہوئی نہر کا حریم امام شافعیؒ کے نزدیک عرف عام پر ہے

ایسے ہی قنات کے لئے کیونکہ قنات پوشیدہ نہر ہے ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس کا حریم وہ ہے جس پر اس کی مٹی ڈالی جائے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ قنات کا حریم وہاں تک ہے جہاں تک پانی نہ پھیلے اور اس میں پانی جمع ہے یہ قول بہتر ہے۔

کنویں کنویں۔ کنواں بنانے کی تین حالتیں ہیں۔

(۱) یہ کہ راہگیروں کے لیے اس کا پانی مشترک ہو اور بنانے والا ان میں کا ایک فرد ہو حضرت عثمانؓ نے بئر رومہ کو وقف کر دیا تھا اور لوگوں کی طرح آپ بھی اپنا ڈول ڈالتے تھے۔ اگر پانی کافی ہو تو جانور اور کھیتیاں دونوں سیرابی کی حقدار ہیں اور ناکافی ہو تو جانور احق ہیں جن میں آدمی اور بہائم دونوں شریک ہیں اس سے ناکافی ہو تو آدمی احق ہیں۔

(۲) حالت یہ ہے کہ کنواں کھود کر تا اقامت اس سے منفعت حاصل کی جائے جیسے خانہ بدوش لوگ کرتے ہیں تو جب تک وہ وہاں مقیم ہیں اس سے خود سیراب ہوں اور اپنے جانوروں کو سیراب کریں اور زائد ہو تو صرف پیاسوں کو پلانا واجب ہے اور جب وہاں سے چلے جائیں تو کنواں عام راہگیروں کے لئے ہو جائے گا اگر پھر واپس آئیں تو ان کا اور دوسروں کا حق برابر ہے جو سابق آئے گا وہی احق ہو گا۔

(۳) حالت یہ ہے کہ کنواں صرف اپنی ضرورت کے لئے کھودے جبتک کہ اس میں پانی برآمد نہ ہو اس کی ملکیت قائم نہ ہوگی اور پانی نکلنے پر چونکہ زمین کا احیا "آبادی" مکمل ہو جاتا ہے لہٰذا کنویں کا اور اس کے حریم کا مالک ہو گیا حریم کی مقدار میں اختلاف ہے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ رواج پر ہے۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ناضح (کھیتی سیراب کرنے کے) کنویں کا حریم پچاس
ہاتھ ہے ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ ستر ہاتھ ہے اور رسّی اس سے زیادہ ہو تو
حریم اُسی قدر ہے اور فرماتے ہیں کہ بئرالعطن (اونٹوں کو سیراب کرنے کا کنواں)
کا حریم چالیس ہاتھ ہے یہ سب مقداریں نص سے ثابت ہوتی ہیں اگر کوئی
نص موجود ہو تو اس پر عمل ضروری ہے ورنہ علت وسبب کے لحاظ سے مختلف
ہوں گی رسی کے برابر حریم کی وسعت قرار دینا مناسب اور عرف میں داخل
معلوم ہوتا ہے جب اس کو کنویں اور اس کے حریم پر ملکیت حاصل ہو جائے
پانی کا زیادہ حقدار ہو جاتا ہے۔ اور کنویں سے سیرابی کرنے اور اس کا
احاطہ بنانے سے قبل پانی کا مالک ہوتا ہے یا نہیں؟ اس میں علماء شافعیہ
مختلف ہیں ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ وہ مالک ہو جاتا ہے جیسے اگر کوئی
شخص کان کا مالک ہو تو کان کے اندر کی چیز کا بھی لینے سے پہلے مالک ہو جاتا
ہے لہٰذا پانی نکالنے سے قبل پانی کو فروخت کر سکتا ہے اگر کوئی شخص بلا
اس کی اجازت کے سیراب کرے تو اس سے قیمت وصول کرے اور دوسری
جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس سے پہلے مالک نہیں ہوتا لہٰذا اگر کوئی شخص
بلا اجازت اپنی زمین سیراب کرے تو اس کو قیمت دینا ضروری نہیں کیونکہ
پانی اصل میں مباح شے ہے ہاں اس کو حق ہے کہ اس سے اپنی زمین کو
پانی دے کر دوسروں کے تصرف سے بچالے۔ جب اس شخص کو کنوئیں
کی ملکیت اور پانی کا خصوصی استحقاق حاصل ہو جائے تو اس کا اپنی زراعت
باغات اور مواشی کو سیراب کرنا بالکل درست ہو جاتا ہے اگر پانی اس کی
ضرورت سے زیادہ نہ ہو تو کسی کو دینا اس کے ذمے واجب نہیں البتہ
پیاس سے ہلاک ہونیوالے کو دینا ضروری ہے حسن رحمۃ اللہ راوی ہیں۔

کہ ایک پیاسے نے ایک قوم سے آکر پانی مانگا انھوں نے نہ دیا وہ غریب پیاس سے مرگیا تو حضرت عمرؓ نے ان سے خونبہا لیا اور اگر ضرورت سے زیادہ ہو تو امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے آدمیوں اور جانوروں کو پلانا واجب ہے دوسروں کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرنا واجب نہیں امام یوسف کے تلامذہ میں سے ابو عبیدہ بن جرثومہ کا قول یہ ہے کہ زائد پانی کسی کو پلانا خواہ جانور ہوں یا زراعت اس کے ذمہ واجب نہیں اور دوسرے شافعیہ یہ کہتے ہیں کہ حیوان کے لئے خرچ کرنا اس پر واجب ہے کھیتی کے لئے نہیں۔ اس بارے میں امام شافعیؒ کا مذہب درست ہے ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص زائد گھاس بچانے کے لئے زائد پانی روکے گا اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے دن زائد رحمت روک لے گا۔ زائد پانی کو خرچ کرنے کی چار شرطیں ہیں۔

(۱) یہ کہ کنوئیں پر آکر پانی مطلوب ہو کسی کے لئے دوسری جگہ پانی پہنچانا اس پر لازم نہیں۔

(۲) یہ کہ کنواں چراگاہ سے قریب ہو۔ ورنہ پانی دینا اس کے ذمہ نہیں ہے۔

(۳) یہ کہ مواشی کو دوسری جگہ پانی پینے کے لئے نہ ملے اگر کوئی دوسری مباح جگہ موجود ہو تو اس پر واجب نہیں ہوتا دہیں لیجاکر پانی پلایا جائے۔ اور اگر دوسری جگہ بھی مملوک پانی ہو تو ان دونوں مالکوں پر واجب ہے کہ زائد پانی آنے والے پیاسے جانداروں کے لئے ان میں سے ایک جگہ کا زائد پانی کافی ہو جائے تو دوسرے سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔

(۴) شرط یہ ہے کہ اس کے پانی پر جانوروں کے آنے سے اس کی کھیتی یا جانوروں کو ضرر پہنچتا ہو ورنہ بصورت ضرر چرواہوں کو جائز نہ ہوگا کہ اس کے پانی سے اپنے مویشی سیراب کریں ان کو ممانعت کر دی جائے۔ اگر چاروں شرطیں موجود ہوں تو زائد از ضرورت پانی پلانا مالک پر واجب اور اس پر قیمت لینا حرام ہے۔ اور اگر کوئی ایک شرط پوری نہ ہو تو قیمت ے سکتا ہے بشرطیکہ پیمانہ سے یا وزن سے فروخت کرے اندازاً جانور یا کھیتی کی سیرابی پر فروخت کرنا جائز نہیں اگر کسی شخص نے کنواں کھدوایا یا مع حریم اس کی ملکیت میں آگیا پھر کسی اور شخص نے اس کے کنوئیں کے حریم پر کنواں کھودا اور پہلے کنوئیں کا پانی اس کی طرف متوجہ ہو گیا یا خشک ہو گیا تو دوسرا کنواں برقرار رکھا جائے یہی حکم اس وقت ہے جبکہ پاک کرنے کے لیے کھودا اور اس کی وجہ سے پہلے کنوئیں کا پانی متغیر ہو گیا اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو تو دوسرے کنوئیں کو بند کرا دیا جائے۔

چشمے اور ان کی قسمیں

چشموں کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) قدرتی جن کو آدمیوں نے نہ بنایا ہو اس کا حکم وہی ہے جو قدرتی نہروں کا جو شخص اس کے پانی سے زمین آباد کرے اس کو بقدر ضرورت پانی لینے کا حق ہے اگر کمی کی وجہ سے اس میں نزاع ہو تو ان اراضی کی رعایت کی جائے جو اس کے پانی سے آباد کی گئی ہوں اگر ان میں سے بعض نے بعض سے پہلے آباد کی ہو تو سبقت کرنے والے مقدم ہوں گے اگر کمی واقع ہو تو آخر والوں کے لئے ہو گی اور اگر سب نے ایک ساتھ آباد کی ہوں اور کوئی کسی

سے مقدم نہ ہو تو پانی کو تقسیم کرلیں یا باری مقرر کرلیں۔

(۲) وہ چشمے جن کو آدمی بنائیں وہ بنانے والے کی ملک ہوتے ہیں ان کے ساتھ ان کا حریم بھی ملک ہوتا ہے جس کی مقدار مذہب شافعی میں عرف اور ضرورت پر ہے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ چشمے کا حریم پانچسو ہاتھ ہے چشمے والا جہاں چاہے اپنا چشمہ لے جائے چشمے کی زمین اور اس کا حریم اس کی ملک ہے۔

(۳) قسم وہ ہے جس کو مالک اپنی ملکیت میں نکالے اس کے پانی کا مستحق مالک ہے اگر اس کی ضرورت کے موافق ہو تو کسی دوسرے کا بجز مجبور پیاسے کے اس میں حق نہیں۔ اور اگر اس کی ضرورت سے زیادہ ہو اور اس سے بیکار زمین آباد کرنا چاہے تو اس کا حق دار ہے اور دوسری زمین آباد نہ کرے تو باقی ماندہ پانی اہل مواشی کو ضرور دے۔ کھیتوں کے لئے دینا ضروری نہیں جیسے کنوئیں کا زائد پانی کھیتوں کے لئے دینا ضروری نہیں۔ ہاں یہ اجرت کھیتوں کو پانی دے تو جائز ہے اگر کسی نے جنگل میں کنواں کھود یا چشمہ نکالا تو اس کو فروخت کرسکتا ہے۔ اس کی قیمت اس پر حرام نہیں ہے۔

(۴) سعد بن مسیب اور ابن ابی ذئب کہتے ہیں کہ بیع جائز نہیں اس کی قیمت اس پر حرام ہے عمرؓ بن عبدالعزیز برادر ابوالزناد فرماتے ہیں کہ اگر رغبت کے لئے فروخت کرے تو جائز ہے اور خلا کے لئے جائز نہیں۔ جو شخص مالک سے زیادہ قریب ہو وہ بلا قیمت احق ہے اور اگر خالی رجوع کرے

تو وہ زیادہ مالک ہے۔

چراگاہ اور پڑاؤ

حمیٰ (چراگاہ) اور ارفاق (پڑاؤ) کے بیان میں

زمین کے جو قطعات اس غرض سے آباد نہ کرنے دیئے جائیں کہ ان میں گھانس اور چارہ اگے اور جانوروں کے چرنے کے لئے مباح ہو ان کو حمیٰ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں ایسا کیا ہے آپ بقیع میں ایک پہاڑی پر چڑھے۔ ابو عبیدہ کا قول ہے کہ یہ لفظ نون سے نقیع ہے آپ نے میدان کی طرف جس کی مقدار ۶/۱×۱ میل تھی اشارہ کر کے فرمایا یہ میری حمیٰ (چراگاہ) ہے اس کو آپ نے مہاجرین و انصار کے گھوڑوں کے چرنے کے لئے روک دیا تھا آپ کے بعد اور ائمہ کے حمیٰ بنانے کے متعلق یہ ہے کہ اگر وہ تمام موات یا اکثر کو خاص لوگوں یا مالداروں کے لئے حمیٰ بنائیں تو جائز نہیں اور اگر عام مسلمانوں یا فقراء و مساکین کے لئے بنائیں تو اس کے جواز میں دو قول ہیں۔

(۱) یہ کہ ناجائز ہے کیونکہ حمیٰ کا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا صعب بن جثامہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بقیع کو

حمیٰ بناتے وقت یہ فرمایا تھا کہ حمیٰ صرف اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے۔

(۲) قول یہ ہے کہ آپ کے بعد ائمہ کا حمیٰ بنانا جائز ہے کیونکہ آپ کو مسلمانوں کی مصلحت مدنظر تھی نہ ذاتی منفعت یہی آپ کے قائم مقام کرتے ہیں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ربذہ میں اہل صدقہ کے لئے حمیٰ تجویز کی اور اس پر اپنے مولیٰ ابوسلامہ کو عامل بنایا اسی طرح عمر رضی اللہ عنہ نے سرف میں حمیٰ مقرر کر کے اس پر اپنے مولیٰ ہنی نامی کو عامل بنایا اسی طرح عمر رضی اللہ عنہ نے سرف میں حمیٰ مقرر کر کے اس پر اپنے مولیٰ ہنی نامی کو عامل بنایا اور نصیحت کی کہ اے ہنی لوگوں پر دست درازی نہ کر مظلوم کی بددعا سے ڈر اس کی بددعا قبول ہوتی ہے اونٹ اور بھیڑ بکری کے چرواہوں کو داخل ہونے دے ابن عفان اور ابن عوف کے چوپایوں کو نہ چھیڑ اگر ان کے جانور ہلاک ہونے لگے تو کھجوروں اور کھیتوں کی طرف متوجہ ہوں گے اور اونٹ اور بھیڑ بکری کے چرواہے اپنے عیال کے ساتھ میرے پاس آکر کہیں گے اے امیرالمومنین آپ نے یہ کیا کیا! کیا میں ان کو یونہی پریشان چھوڑ دوں گا مجھے درہم و دینار سے گھانس دینا سہل ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں جان ہے کہ اگر میں ان سے فی سبیل اللہ مال نہ لیتا تو ان کی بالشت بھر زمین بھی حمیٰ نہ بناتا اور آپ کے ارشاد کہ ”حمیٰ صرف اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے“ یہ مطلب ہے کہ حمیٰ صرف اسی طرح ہے جس طرح اللہ اور رسول نے فقرا اور مساکین اور عام مسلمانوں کی ضروریات کے لئے بنائی نہ زمانہ جاہلیت کی طرح کہ لوگ زور و قوت سے اپنے لئے مخصوص کر لیتے تھے جیسے کلیب بن وائل

کا طریقہ تھا کہ کسی جگہ کتے کو باندھ دیتا اور جہاں تک اس کے بھونکنے کی آواز
جاتی اس کو چاروں طرف سے اپنی حمٰی مخصوص قرار دیتا اور دوسری چراگاہ
میں لوگوں کا شریک رہتا اس کے قتل کا سبب یہی اس کی زیادتی تھی

زمین کی آباد کاری

جب زمین کو حمٰی بنادیا جائے اور آباد کر
کی ممانعت ہوجائے تو پھر حمٰی کا حکم نافذ ہو
ہے اگر سب کے لئے ہو تو امیر غریب مسلم ذمی سب کو چرانے کا حق
اگر مسلمانوں کے لئے خاص ہو تو اس میں سب امیر و غریب کو حق ہے
کو ممانعت ہے اور یہ صورت کہ امیروں کے لئے خاص ہو تو دوسروں کو
شریک ہونے کا حق نہیں آئندہ حمٰی کا حکم اسی عمومیت یا خصوصیت پر
البتہ اگر مخصوص حمٰی کو وسیع کر کے سب کے لئے عام کر دیا جائے تو در
ہے کہ ان مخصوصین کا کوئی نقصان نہیں ہے اگر عام حمٰی سب کے لئے
ناکافی ہو تو اس کو امراء کے لئے خاص کرنا جائز نہیں اور فقرا کے
خاص کرنے میں دو صورتیں ہیں (جواز اور عدم جواز)

کسی قطعۂ زمین کو حمٰی قرار دینے کے بعد اگر کوئی شخص اس میں سے کچھ
آباد کرلے جس سے حمٰی کم ہوجائے تو اگر وہ حمٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی تجویز کردہ ہو تو بحالہ حمٰی رہے گی اور آباد کرنا باطل ہے آباد کنندہ کو سز
دیجائے۔ خصوصاً جبکہ حمٰی کا سبب موجود ہو کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے حکم سے معارضہ کرنا کسی حالت میں جائز نہیں اور اگر آپ کے بعد ائمہ
تجویز کردہ ہو تو کھیتی باقی رکھنے کے متعلق دو قول ہیں۔

(۱) یہ کہ آباد نہ رکھی جائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمٰی کے مثل ا
بھی حکم ہے کیونکہ صحیح طور پر نافذ شدہ حکم سے حمٰی قرار دی گئی ہے۔

یہ ہے کہ آباد رہنے دی جائے کیونکہ آپ کا بالتصریح ارشاد ہے کہ جو شخص
یر زمین کو آباد کرے وہ اس کی ملک ہے۔

کسی حاکم کو یہ جائز نہیں کہ حمیٰ یا بیکار زمینوں میں جانور چرانے پر لوگوں
ے معاوضہ لے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ تین چیزوں میں
تاب مسلمان شریک ہیں۔ پانی۔ آگ۔ چارا۔

ڑاؤ کی تعریف | ارفاق۔ اس سے مراد وہ کھلے مقامات ہیں
جن لوگوں کے بازار لگانے یا راستوں، چوک
ہروں کی فرد گاہ یا سفر کی منزلوں کے لئے تجویز کیا جائے اس کی تین قسمیں
کیں۔

قسم وہ ہے جس کی منفعت جنگل اور بیرونی میدانوں سے مخصوص ہو۔
قسم وہ ہے جو لوگوں کے مکانوں اور زمینوں سے متعلق ہو۔
قسم جو شارع عام اور راستوں سے متعلق ہو۔ پہلی قسم جیسے سفر کی منزلوں
پانی پر اترنے کے میدان اس کی دو قسمیں ہیں۔
وہ جو قافلوں کے گذرنے اور مسافروں کے آرام لینے کے لئے ہو دور
ہوتے اور قافلوں کی ضرورت کی وجہ سے سلطان اس میں کوئی تصرف
نہ کرے صرف اس کی نگرانی اور پانی کی حفاظت کرے اور لوگوں
کو وہاں ٹھہرنے دے جو قافلہ پہلے آکر اتر جانے تک وہی ٹھہرنے
کا مستحق ہے پیچھے آنے والے کا حق اس کے بعد ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم فرماتے ہیں منیٰ اس کا پڑاؤ ہے جو پہلے پہنچ جائے اگر اس کے
ساتھ آکر اتریں اور آپس میں جھگڑیں تو نزاع کو مٹانے کا انتظام
کیا جائے۔ یہی حکم خانہ بدوش لوگوں کا ہے جو گھانس وچارے پانی پر

ٹھہرتے پھرتے ہیں کہ ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

(۲۱) وہ زمین جس میں لوگ وطن بنانے کی غرض سے آکر ٹھہریں اس میں سلطان کا یہ فرض ہے کہ اگر ان کے یہاں رہنے سے مسافروں کے لئے تکلیف و دقت ہو تو ان لوگوں کو اترنے سے قبل و بعد ہر حال میں روک دے اور اگر مسافروں کے لئے تکلیف دہ نہ ہو تو جو مناسب صورت ہو اس کو اختیار کرے خواہ ان کو اجازت دے دے یا منع کر دے یا بجائے ان کے دوسروں کو بسا دے جیسے حضرت عمرؓ نے بصرہ اور کوفہ کو آباد کرنے کے وقت کیا تھا کہ دونوں شہروں میں مصلحت کے لحاظ سے مناسب لوگوں کو آباد کیا تھا کیونکہ اس کے بدون آپس میں لڑنے اور خونریزی کرنے کا خطرہ ہے اور جیسے موات کا حکم ہے کہ جس کو مناسب خیال کرے اجازت دے اور جس کو مناسب نہ ہو اجازت نہ دے اگر بلا اجازت آکر آباد ہو جائیں تو منع نہ کرے جیسے موات کو بلا اذن آباد کرنے کے بعد منع نہ کیا جاتا لیکن ان کو مصالح کے موافق انتظامات کر دے اور زیادہ کو بلا اجازت تصرف میں لانے کی ممانعت کر دے کثیر بن عبداللہ کے دادا راوی ہیں کہ ہم عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ۱۷ھ میں عمرہ کرنے کے لئے چلے تو راستہ میں تالاب والوں نے آپ سے مکہ اور مدینہ کے درمیان مکانات بنانے کی اجازت چاہی کیونکہ اس سے پہلے وہاں مکانات نہ بنے تھے تو آپ نے اجازت دے دی اور شرط یہ کہ مسافر پانی اور سائے کے زیادہ مستحق ہوں گے۔

میدان دوسری قسم وہ میدان جو لوگوں کے مکانوں اور زمینوں سے متعلق ہوں ان کا حکم یہ ہے کہ اگر ارباب ملک کے لئے

دہاں لوگوں کا ٹھہرانا مضر ہو توان کو منع کر دیا جائے اور باوجود مضرت کے وہ اجازت دیں تو ٹھہرنے دیا جائے ۔ اور مضر نہ ہو تو بلا اجازت منفعت حاصل کرنے کے جواز میں دو قول ہیں ۔

(۱) یہ کہ حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ حریم کی منفعت کا حکم یہ ہے کہ جب حقداروں کو ان کا حق پہنچ جائے تو مابقی میں سب لوگ شریک ہوتے ہیں ۔

(۲) یہ کہ بلا اجازت ان کے حریم سے استفادہ جائز نہیں اس لئے کہ وہ ان کی املاک کے تابع ہے لہٰذا جملہ حقوق و تصرفات انھیں کو حاصل ہونگے جامع مسجد اور دوسری مساجد . . . . کے حریم سے استفادہ کرنا اگر اہل مساجد کے لئے مضر ہو تو ممنوع ہے سلطان کو اجازت دینے کا حق نہیں نمازی زیادہ مستحق ہیں اور ان کے لئے مضر نہ ہو تو استفادہ جائز ہے اس صورت میں آیا سلطانی اجازت ضروری ہے یا نہیں؟ اس میں ارباب ملک کے حریم کی طرح دو قول ہیں ۔

شارع عام تیسری قسم وہ جو کہ شارع عام اور راستوں سے متعلق ہو یہ سلطان کے انتظام پر موقوف ہے سلطانی انتظام کی دو صورتیں ہیں ۔

(۱) یہ کہ لوگوں کو اس میں تعدی و ایذارسانی سے روکے اگر وہاں لوگوں میں کوئی نزاع و فساد ہو تو اس کو رفع کرے مگر یہ حق نہیں کہ بیٹھے ہوئے کو کھڑا یا مقدم کو موخر کرے ۔ کیونکہ پہلے آنے والا بعد والے سے احق ہے ۔

(۲) صورت یہ ہے کہ اس کا تمام انتظام سلطان اپنے اجتہاد سے کرے حسب مصلحت کسی بیٹھنے دے یا نہ بیٹھنے دے جس کو

چاہے مقدم کر دے پہلے آنے والا احق نہیں ہوتا۔ یعنی جس طرح بیت المال اور جاگیروں میں سلطان الاختیار ہے اس میں بھی ہے لیکن دونوں صورتوں میں لوگوں سے اُجرت اور معاوضہ لینا جائز نہیں اور اگر لوگوں کی منشاء پر چھوڑ دے تو پہلے آنے والا زیادہ مستحق ہوگا اگر وہ جگہ چھوڑ کر چلا جائے تو اگلے روز اس کا حق نہ ہوگا اس میں بھی پہلے آنے والا زیادہ حقدار ہوگا۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کی جگہ مشہور ہو جائے تو نزاع وفساد رد کرنے کے لئے یہی ضروری ہے کہ اسی کو حقدار قرار دیا جائے لیکن یہ حکم اگرچہ مصلحت پر مبنی ہے مگر اس سے ایک شے کا اباحت کے حکم سے نکل کر ملک کے حکم میں داخل ہونا لازم آتا ہے۔

درس وتدریس

علماء اور فقہا جامع مسجد یا دوسری مساجد میں بیٹھ کر مشاغل علمیہ درس وتدریس اور فتاوے میں مصروف ہوں تو ان کی بابت یہ ہے کہ نا اہل کو ہرگز یہ کام نہ کرنا چاہیے ورنہ رشد وہدایت کے طلبہ کو گمراہ کرے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں جو شخص فتوے دینے کی زیادہ جرات کرتا ہے وہی زیادہ جہنم کے کیڑوں کے عذاب میں مبتلا ہوگا ان کے متعلق سلطان کو اختیار ہے جس کو چاہے باقی رکھے جس کو چاہے ممانعت کر دے اگر کوئی اہل علم تدریس یا فتوے کے لئے کسی مسجد میں بیٹھنا چاہے تو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ مسجد سلطانی انتظام میں داخل نہ ہو تو اس کو سلطان سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں جیسے اس قسم کی مساجد میں امامت کے لئے سلطانی اجازت ضروری نہیں۔ اور اگر

سلطانی انتظام میں داخل ہو تو عرف ورواج کا اعتبار ہے اگر اس کام کے لئے اجازت لی جاتی ہو تو اس کو بھی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ تاکہ شاہی انتظامات کے خلاف نہ ہو اور اگر رواج اس کی اجازت نہ لی جاتی ہو اس پر بھی اجازت لینا واجب نہیں۔ اور علماء کی طرح یہ بھی اپنا کام شروع کردے۔ کام شروع کرنے کے بعد امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہ جگہ اس کی مشہور ہو جائے تو وہی احق ہوگا۔ اور جمہور فقہا کا مذہب یہ ہے کہ اس کا دارومدار رواج پر ہے کوئی مسجد کسی کا حق مشروع نہیں۔ جب وہ وہاں سے اٹھ جاتا ہے اس کا حق بھی زائل ہو جاتا ہے اور پہلے آنے والا احق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

سواء العاکف فیہ والباد۔

ترجمہ:۔ اس میں رہنے والے اور باہر سے آنیوالے سب مساوی ہیں۔ لوگوں کو مساجد میں فقہا و قراء کے حلقوں سے گزرنے کی ممانعت کردی جائے تاکہ ان کی بے ادبی نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حمی صرف تین چیزوں کی ہے ثلتہ البئر۔ طول فرس۔ حلقۃ القوم۔ ثلتہ البئر سے مراد کنوئیں کا پورا حریم۔ طول فرس سے مراد اس کی رسی کی لمبائی جس میں بندھنے کے بعد گھومے۔ حلقۃ القوم سے مراد وہ جگہ جس میں بیٹھ کر وہ مشورہ یا باتیں کریں۔

اگر مختلف مذاہب کے علماء میں اجتہادی مسائل پر مناظرہ ہو تو ممانعت نہ کی جائے بشرطیکہ تنافر نہ پیدا ہو ورنہ ممانعت کردی اور اگر کوئی شخص ایسے مسئلے میں نزاع کرے جس میں اجتہاد کو دخل نہیں تو رد کردیا جائے اگر اس پر اڑے اور لوگوں کو گمراہ کرے تو سلطان پر واجب ہے

کہ حاکمانہ تہدید کو استعمال کر کے اس کی بدعت کا ازالہ کرے اور شرعی دلائل سے اس کی بات کی تردید کرے ورنہ ہر بدعت کے سننے والے اور ہر گمراہی کو اختیار کرنے والے موجود ہوتے ہیں اگر کوئی اپنے ضمیر کے خلاف اچھی بات کی طرف دعوت دے تو کچھ نہ کہا جائے۔ اور کوئی جاہل علمیت جتلائے تو روک دیا جائے کیونکہ ایسی صلاح کی طرف داعی جو خود اس میں موجود نہیں مصلح ہے اور ایسے علم کی طرف داعی جو اس میں نہ ہو مضل (گمراہ کن) ہے۔

جاگیر

سلطان لوگوں کو انھیں علاقوں کی اقطاع (جاگیریں) دے سکتا ہے جن میں اس کا تصرف اور احکام نافذ ہوں جن کے مالک معین اور مستحقین معلوم ہوں وہ کسی کو بطور جاگیر نہیں دے سکتا۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) اقطاع تملیک (مملوکہ جاگیرات)

(۲) اقطاع استغلال (وظائف)

اقطاع تملیک تین قسم کی زمینوں میں ہو سکتی ہے موات (غیر آباد) ہیں عامر (آباد) ہیں۔ معادن (کانوں) میں موات کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) وہ جو ہمیشہ سے موات ہو نہ کبھی آباد ہوئی نہ کسی کی ملک میں داخل ہوئی اس میں سلطان کو حق ہے کہ کسی کو آباد کرنے کے لئے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ شرط ہے کہ سلطان نے جاگیر دی ہو کیونکہ ان کے مذہب پر بلا اذن امام آباد کرنا جائز نہیں اور امام شافعیؒ کے نزدیک جاگیر ملنے سے آباد کرنے کا حق زیادہ ہو جاتا ہے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نقیع کی موات میں سے زبیرؓ

عوام کوان کے گھوڑے کی ایک دوڑ کے برابر جاگیر عطا فرمائی تھی انھوں نے اپنا گھوڑا دوڑایا۔ اور آخیر میں زیادتی کے خیال سے اپنا کوڑا پھینک دیا آپ نے فرمایا اس کے کوڑے کی انتہا تک اس کو دیدو۔

دوسری قسم موات کی یہ ہے کہ پہلے آباد تھی پھر برباد ہوئی۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) عہد جاہلیت کی یعنی عاد و ثمود کی زمینوں کی طرح ہو یہ قدیمی موات کے حکم میں ہے اس میں سے جاگیر دینا جائز ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے عادی (قوم عاد کی) زمینیں اللہ اور رسول کی ہیں پھر میری طرف سے تمہاری ہیں۔

(۲) اسلامی جو مسلمانوں کی ملک رہ کر پھر بیکار اور برباد ہوئی سو اس کے بارے میں فقہاء کی تین مختلف رائے ہیں امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ آباد کرنے سے ملکیت حاصل نہ ہوگی۔ خواہ اصل مالک معلوم ہوں یا نہ ہوں امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ بہر دو صورت آباد کرنے سے آباد کنندہ کو ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگر اس کے مالک معلوم ہیں تو آباد کرنے سے بھی وہ زمین آباد کار کی ملکیت نہیں ہو سکتی البتہ اگر مالک غیر معلوم ہیں تو آباد کرنے سے اس کی ملکیت ہوگی اگرچہ امام موصوف کے مذہب کی بنا پر جاگیروں کے علاوہ اور زمین آباد کرنے سے کسی کی ملکیت نہیں بن سکتی، مالکوں کو معلوم ہونے کی شکل میں سلطان کے لئے ایسی زمینوں کو جاگیر دینا جائز نہیں ہے اور وہ اصلی مالک ہی اس زمین کو بیع کرنے یا آباد کرنے کے زیادہ مستحق ہوں گے اور اگر معلوم نہ ہوں تو اس وقت جاگیر دینا

جائز؛ اس تفصیل کے بعد جاننا چاہیئے کہ جب کسی کو سلطان جاگیر دے تو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حقدار ہو جائے گا مگر اس کی ملکیت آباد کرنے سے پہلے قائم نہ ہوگی مکمل آباد کرنے کے بعد مالک ہو گا اگر آباد کرنے میں توقف کیا تو احق ہو گا مالک نہ ہو گا توقف کو دیکھا جائے اگر ظاہری عذر کی وجہ سے ہو تو قابل اعتراض نہیں زوال عذر تک اس کے قبضے میں رہنے دی جائے اور عذر نہ ہو تو امام ابوحنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ تین سال سے پہلے کچھ تعرض نہ کیا جائے ان کے اندر اندر آباد کرلے تو فبہا ورنہ جاگیر کا حکم باطل ہو جائے گا۔ دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جاگیروں کی مدت تین سال مقرر کی تھی امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ مدت مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف آباد کرنے کی قدرت کا اعتبار ہے اگر اتنا عرصہ گذر گیا ہے جس میں آسانی سے وہ زمین آباد ہو سکتی تھی تو اب اس سے کہا جائے کہ یا تو اسے آباد کرو تو یہ تمہارے قبضہ میں رہے گی ورنہ تم سے لے لیجائے گی تاکہ وہ زمین جاگیر میں دیئے جانے سے پہلے جس حال میں تھی پھر اسی حالت اور اسی حکم میں آجائے اور حضرت عمرؓ کا مدت مقرر کرنا ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے ممکن ہے کوئی خاص وجہ یا مصلحت وقت داعی ہو۔

اگر اس قسم کی جاگیر کوئی متغلب آباد کرے تو اس کے حکم میں علماء کے تین مذہب ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جاگیر والے سے آباد کنندہ زیادہ مستحق ہے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر تین سال کے اندر آباد کرے تو جاگیر والے کی ملک ہے اس کے بعد آباد کرلے تو آباد کنندہ کی ملک ہے امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر جاگیر ہونے کا علم

رکھتے ہوئے آباد کرے تو جاگیر والے کی ملک ہے اور یہ علم نہ ہو تو جاگیر والے کو اختیار دیا جائے گا کہ یا تو اپنی جاگیر لیکر آباد کرے کا خرچہ آباد کنندہ کو دے یا زمین آباد کنندہ کو دے کر غیر آباد ہونے کے وقت کی قیمت اس سے وصول کرے ۔

عامر کی قسمیں عامر (آباد) کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک یہ کہ اس کا مالک معلوم ہو اس میں سلطان کو تصرف کرنے کا حق نہیں ہاں اگر دار الاسلام میں ہو تو خواہ مسلم کی ملک یا ذمی کی بیت المال کے حقوق وصول کر سکتا ہے اور مسلمانوں کے ہاتھ سے باہر دار الحرب میں ہو تو بشرط فتح جاگیر دے سکتا ہے تمیم داری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتح سے پہلے یہ درخواست کی کہ شام کے چشمے مجھے عنایت فرما دیجئے آپ نے دیدیئے ابو ثعلبہ خشنی نے ایک جاگیر رومی سلطنت میں مانگی ۔ آپ کو تعجب ہوا صحابہ سے فرمایا سنتے ہو یہ کیا کہتا ہے اس نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو مبعوث فرمایا ہے یہ علاقے ضرور آپ کے لئے فتح ہوں گے ۔ آپ نے اس کو تحریری اجازت نامہ دیدیا ۔ علیٰ ہذا القیاس اگر امام سے کوئی ایسی شے مانگی جائے جو بالفعل دار الحرب میں کفار کی ملک ہو یا ان کے بچے یا عورتیں ہبۃً چاہے تاکہ فتح کے بعد ان کا حقدار ہو جائے جائز ہے یہ عطیہ باوجود جہالت کے امور عامہ سے متعلق ہونے کی وجہ سے صحیح ہے شعبی کی روایت ہے کہ حریم بن اوس بن حارثہ طائی نے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اگر اللہ تعالیٰ حیرۃ فتح کرا دے تو آپ مجھے بنت نضیلہ مرحمت فرما دیں ۔ جب خالد رض

نے حیرۃ سے مصالحت کا ارادہ کیا تو حریم نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنت نفیلہ مجھے مرحمت فرمائی ہے اس کو صلح سے مستثنیٰ کر دو اور گواہی میں بشیر بن سعد اور محمد بن مسلمہ کو پیش کیا تو خالد نے بنت نفیلہ کو مستثنیٰ کر حریم کے حوالے کر دیا حریم سے ایک ہزار درہم میں خرید لی گئی بڑھیا تھی جوانی کا دور گذر چکا تھا کسی نے حریم سے کہا کمبخت تو نے سستی دیدی۔ اس کے رشتہ دار تجھے اس سے دو گنا دینا چاہتے تھے حریم نے کہا مجھے یہ خبر نہ تھی کہ ہزار سے اوپر بھی کوئی عدد ہے۔ اگر اس طرح کسی کی جاگیر یا تملیک دی جائے تو فتح کی بابت یہ کہا جائے کہ اگر صلحاً ہوئی تو جاگیر کی زمین صلح سے خارج ہے سابق وعدے کی وعدے کی وجہ سے جاگیر والے کو دی جائے اور اگر فتح بزورِ شمشیر ہو تو جاگیر کا حقدار جاگیر والا ہے غانمین کی نہیں ہے اور غانمین کے متعلق یہ ہے کہ اگر انھیں اس کے جاگیر یاب ہونے کا فتح سے پہلے علم ہو تو اس کے معاوضے کا مطالبہ نہیں کر سکتے اور علم نہ ہو تو امام کو چاہیے کہ ان کے معاوضے دے تاکہ اور غنیموں کی طرح اس سے بھی ان کے دل خوش ہو جائیں امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر غانمین سے غنیمت لینا مقتضائے مصلحت ہو تو ان کو معاوضہ دے کر خوش کرنے کی ضرورت نہیں۔

ملکیت کی عدم تخصیص دوسری قسم عامر کی یہ ہے کہ اس کے مالک مخصوص متعین نہ ہوں۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ بلاد فتح کرنے کے بعد اس کو امام بیت المال کے لئے انتخاب کرے یا تو اہل خمس کے استحقاق میں۔ یا غانمین کی رضامندی سے کیونکہ حضرت عمرؓ نے سواد کی زمین سے کسریٰ اور اس کے خاندان کا مال اور جس کے مالک بھاگ گئے یا ہلاک ہو گئے تھے انتخاب کر لیا تھا اس کی آمدنی نوّے لاکھ

تھی جو مصالح عامہ میں صرف کی جاتی ۔ آپ نے اس میں سے کسی کو جاگیر نہیں دی ۔ حضرت عثمان رضؓ نے اس مصلحت سے کہ جاگیرات دینے سے اس کی آمدنی بڑھ جائے گی اس کو جاگیرات میں دیا اور یہ شرط کر لی کہ اس کا حق فیٔ ادا کریں گویا آپ نے لبطور اجارے کے دی تھیں ۔ مملوکہ جاگیرات نہ تھیں چنانچہ ان کی آمدنی بڑھ کر پچاس کروڑ ہو گئی ۔ حضرت عثمان رضؓ نے اس میں سے انعامات اور عطیات دیتے تھے آپ کے بعد اور خلفاء میں منتقل ہوتی رہی جماجم کے سال ۸۲ھ میں ابن اشعث کا فتنہ ہوا حسابات کے دفتر جل گئے جو زمین جس کے ہاتھ آئی اس نے قبضہ کر لیا اس قسم کی عامر زمین میں سے جاگیرات دینا جائز نہیں کیونکہ یہ انتخاب کرنے کی وجہ سے بیت المال سے متعلق اور عام مسلمانوں کی ملک ہو گئی اور اوقات دائمی کے حکم میں ہوئی جس کی آمدنی مستحقین وقف میں صرف ہونی ضروری ہے اس کے انتظام میں سلطان کو اختیار ہے خواہ وہ اس کی آمدنی براہ راست بیت المال کے لئے رکھے جیسا حضرت عمر رضؓ نے کیا خواہ زمین کو ہوشیار زمینداروں کے حوالے کر کے ان سے کم و بیش پیداوار کے لحاظ سے معین خراج وصول کرے جیسا کہ حضرت عثمان رضؓ نے کیا تھا ۔

یہ خراج زمین کی اجرت ہوگا جو مسلمانوں کے مصالح میں صرف کیا جائے البتہ اگر اہل خمس کا حق ہو تو ان پر خرچ کیا جائے اور اگر یہ خراج پھلوں اور زراعتوں کی تقسیم کے اعتبار سے مقرر ہو تو کھجوروں میں جائز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر سے نصف کھجوروں پر معاملہ فرمایا تھا اور زراعتوں میں اس کا جواز فقہا کے اس اختلاف پر ہے کہ آیا مخابرت جائز ہے یا نہیں ۔ جن کے نزدیک مخابرت (یعنی حصے پر زراعت کرنا) جائز ہے

ان کے نزدیک یہ خراج بھی جائز ہے اور جن کے نزدیک مخابرت جائز نہیں خراج بھی جائز نہیں اور ایک قول یہ ہے کہ اگرچہ مخابرت جائز نہیں مگر یہ خراج جائز ہے کیونکہ عموم مصالح کے حکم میں عقود خاصہ کی بہ نسبت زیادہ وسعت ہوتی ہے اور عشر صرف زراعت سے لیا جائے پھلوں سے نہ لیا جائے۔ کیونکہ زراعت مزارعین کی ملک ہوتی ہے اور پھل عام مسلمانوں کے لئے ہیں جو ان کی مصالح میں صرف ہونی چاہیں۔

عامر کی دوسری قسم خراجی زمین ہے اس میں سے جاگیرات تملیک دینا جائز نہیں کیونکہ دو نوع زمین نوع اول یہ کہ اصل زمین وقف ہو اور اس کا خراج اجرت ہو اس میں سے اقطاع تملیک صحیح نہیں نہ اس کی بیع و ہبہ جائز ہے نوع ثانی یہ ہے کہ زمین ملک ہو اور اس کا خراج جزیہ ہو تو جس زمین کے مالک معین ہوں اس کو بھی جاگیر میں دینا صحیح نہیں اور اس کے خراج میں سے وظائف مقرر ہونے کے متعلق ہم اقطاع استغلال میں ذکر کریں گے۔

بیت المال کی ملکیت

تیسری قسم یہ ہے کہ اس کے مالک مر گئے ہوں نہ کوئی ذوی الفروض میں سے وارث موجود ہو نہ عصبات میں سے اس کو بیت المال میں داخل کر کے عام مسلمانوں کی میراث کر دینا چاہیئے اور آمدنی کو ان کی مصالح میں صرف کرنا چاہیئے اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کی میراث صرف فقراء میں میت کی طرف سے بطور صدقہ کے خرچ کرنی چاہیئے اور امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا مصرف عامۃ المسلمین کے مصالح ہیں کیونکہ پہلے املاک خاصہ میں سے تھی اب بیت المال میں منتقل ہو کر املاک عامہ میں سے ہو گئی بیت المال کی طرف منتقل ہونے والے مالوں کے

متعلق علمائے شافعیہ میں اختلاف ہے کہ آیا نفس انتقال سے بیت المال پر وقف ہو جاتے ہیں؟ ایک رائے تو یہ ہے وقف ہو جاتے ہیں اس لئے کہ اس کا مصرف کسی طرح خاص نہیں عام ہے اس رائے پر ان کی بیع ہبہ اور جاگیر دینا جائز نہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ جب تک امام وقف نہ کرے وقف نہیں ہوتے اس رائے پر ان کی بیع اگر بیت المال کے لئے مفید ہو درست ہے ان کی قیمت کو مصالح عامہ حاجتمند اہل فئی و اہل صدقات پر صرف کیا جائے اور جاگیر میں دینے کے متعلق ایک قول جواز کا ہے کیونکہ جب بیع کرنا اور قیمت حاجتمندوں میں صرف کرنا جائز ہے تو جاگیر دینا جائز اور اس کی تملیک قیمت کی تملیک کی طرح ہو گی۔

دوسرا قول عدم جواز کا ہے اگرچہ بیع جائز ہے کیونکہ بیع میں معاوضہ ہوتا ہے اور جاگیر عطیہ ہوتی ہے اور قیمتیں جب وصول ہو جائیں تو ان کا حکم عطایا کے حکم کے ایسا ہی خلاف ہوتا ہے جیسا کہ اصول ثانیہ کا حکم اگرچہ ان دونوں میں فرق ضعیف ہے۔ یہ اقطاع تملیک کا بیان تھا۔

وظائف اقطاع استغلال (وظائف) اس کی دو قسمیں ہیں عشر۔ خراج عشر میں سے وظائف مقرر کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ زکوٰۃ ہے جو خاص صفت کے مستحقین میں صرف ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ اہل وظائف دینے کے وقت اس کے مستحق ہوں تو یہ وہ عشر ہو گا جو صاحب عشر پر مستحق کے لئے واجب تھا مستحق کا فرض نہ ہو گا کیونکہ قبضہ کرنے سے پہلے مستحق اس کا مالک نہیں ہے پس اگر صاحب عشر اپنے میں سے ... ے تو مستحق اس سے مقدمہ لڑ کر وصول نہیں کر سکتا۔ خراج کے وظائف کا حکم وظیفہ خوار کی حالت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے اس کی تین حالتیں

ہو سکتی ہیں۔

(۱) یا تو اہل صدقات سے ہو کہ خراج میں سے دینا جائز نہیں کیونکہ خراج فیئی ہے اہل صدقات اس کے مستحق نہیں ہوتے جیسے اہل فیئی صدقہ کے مستحق نہیں ہوتے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دینا جائز ہے کیونکہ فیئی کو اہل صدقہ کے لئے جائز سمجھتے ہیں۔

(۲) یا اہل مصالح میں سے ہو جن کی کوئی تنخواہ نہیں ہوتی اس کے لئے بھی علی الاعلان وظیفہ مقرر نہیں ہو سکتا اگرچہ بطور انعام دینا جائز ہے کیونکہ وہ اہل فیئی کے نفل میں سے ہے اس کے فرض میں سے نہیں جو کچھ اسے دیا جاتا ہے وہ انعامات اہل مصالح سے ہوتا ہے اور اگر اس کو خراج سے کچھ دیا گیا تو اس پر حوالہ اور تسبب کا حکم جاری ہو گا۔ وظیفہ نہ ہو گا۔ اس لئے اس کی دو شرطیں ہیں۔

(۱) یہ کہ مال کی مقدار معین اور اس کی استباحت کا سبب موجود ہو

(۲) یہ کہ مال خراج ثابت اور واجب ہو جائے تاکہ اس پر تسبب اور حوالہ صحیح ہو۔ ان دونوں شرطوں کی وجہ سے وظائف کے حکم سے خارج ہو گیا

تیسری حالت یہ ہے کہ تنخواہ دار اہل فیئی یعنی فوجی ہو۔ فوجیوں کو قطاع دینا خصوصیت سے جائز ہے ان کی معین تنخواہیں اس استحقاق دی جاتی ہیں کہ وہ قوم و مذہب کی حمایت کے لئے اپنی جانیں پیش کرتے ہیں پس جب ان کا اہل اقطاع میں سے ہونا درست ہو تو مال خراج کو دیکھا جائے یا تو جزیہ ہو گا یا اجرت جزیہ ہونے کی شکل میں تو یہ ہے کہ وہ دائمی برقرار نہیں ہوتا جب تک کفر رہے لیا جائے اور اسلام لانے سے ساقط

ہوجائے گا اس میں سے ایک سال سے زیادہ کا وظیفہ نہیں دیا جاسکتا کیونکہ ایک سال کے بعد تک جزیئے کا استحقاق ناقابل اعتماد ہے اور استحقاق کے بعد اگر ایک سال کے لئے وظیفہ مقرر کرنا صحیح اور استحقاق جزیہ سے قبل ایک سال کے لئے مقرر کیا جائے تو اس کے جواز میں دو وجہیں

(۱) یہ کہ جائز ہے یہ اس قول پر کہ جزیہ کا سال شرط ادا ہے۔

(۲) یہ کہ ناجائز ہے یہ اس قول پر کہ جزیہ کا سال شرط وجوب ہے۔

بطور اجرت اور خراج بطور اجرت ہو تو چونکہ وہ دائمی ہوتا ہے اس میں سے دو سال تک وظیفے دینا بھی صحیح ہے جزیئے کی طرح صرف ایک سال کے لئے جاری کرنا ضروری نہیں کیونکہ دونوں میں عارضی وغیر عارضی ہونے کا فرق ہے اس وظیفے کے جاری کرنے کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) یہ کہ چند معین سال کے لئے اجرا ہو مثلاً دس سال کے لئے اس کی دلو شرطیں ہیں۔

(۱) یہ کہ وظیفہ خوار کی تنخواہ کی مقدار وظیفہ دہندہ کو معلوم ہو۔ ورنہ وظیفہ دینا صحیح نہیں۔

(۲) یہ کہ وظیفہ خوار اور وظیفہ دہندہ دونوں کو خراج کی مقدار معلوم ہو اگر کوئی ایک ناواقف ہو تو صحیح نہیں ہوتا اس کے بعد یہ بھی لحاظ رہے کہ یا تو خراج مقاسمۃً لیا جاتا ہو یا پیمائش پر۔ مقاسمۃً کی صورت جن فقہاء کے نزدیک جائز ہے وہ اس کو معلوم المقدار رکھ کر اس میں سے وظیفہ مقرر کرنا جائز رکھتے ہیں اور جن کے نزدیک خراج علی المقاسمۃ درست نہیں وہ اس کو مجہول المقدار رکھ کر اس میں سے وظیفہ دینا ناجائز کہتے ہیں

بہ طورِ پیمائش اور اگر خراج پیمائش پر ہو تو اس کی دو نوع ہیں ایک یہ کہ کاشت کے اختلاف سے خراج مختلف نہ ہو اس کی مقدار معین ہوتی ہے وظیفہ مقرر کرنا صحیح ہے۔

دوسری یہ کہ مختلف ہو تو اگر وظیفہ خوار کا وظیفہ دونوں خراجوں سے اعلیٰ کے مقابلے میں ہو تو مقرر کرنا درست ہے کیونکہ کمی صورت میں وہ نقصان پر راضی ہے۔ اور اقل کے مقابلے میں ہو تو مقرر کرنا درست نہیں کیونکہ اگر کبھی زیادتی ہو تو وہ اس کا مستحق نہ ہوگا۔ جب اس قسم کا وظیفہ جاری کرنا درست ہو جائے تو وظیفہ خوار کی تین حالتیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی حالت یہ کہ وظیفہ کی مدت معین ہو تو یا تو وظیفہ کی مدت کے ختم تک زندہ و سلامت رہے تب تو آخر تک وظیفہ کا حقدار ہے۔ یا انقضائے مدت سے قبل فوت ہو جائے تو باقی موت کا وظیفہ باطل ہو جائے گا۔ اگر اس کے بال بچے ہو تو ان کو درازی کے حق سے ملے گا زوج کے حق سے کچھ نہ ملے گا اور وہ سبب ہو گا وظیفہ نہ ہو گا۔ یا انقضائے مدت سے قبل اپاہج ہو جائے اور باقی حیات بیماری میں کاٹے تو اس کے وظیفہ کو جاری رکھنے میں دو قول ہیں۔

(۱) قول یہ ہے کہ انقضائے مدت تک اس کا وظیفہ جاری رہے یہ قول اس پر مبنی ہے کہ اپاہج ہونے سے اس کی تنخواہ ساقط ہو گی۔

(۲) حالت یہ کہ وظیفہ تاحیات اور مرنے کے بعد اولاد ورثاء کے لئے ہو یہ وظیفہ باطل ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مال بیت المال کا حق نہیں بلکہ ماموروث ہے لیکن اس کے باطل ہوتے ہوئے اگر اس نے وظیفہ وصول کیا تو عقد فاسد کے لحاظ سے وہ ماذون فیہ ہے

اہل خراج اس کو دے کر بری الذمہ ہو جائیں گے اور یہ اس کی تنخواہ میں محسوب ہوگا اگر تنخواہ سے زیادہ ہو تو زیادہ کو واپس لے لیا جائے اور کم ہو تو مابقی وصول کرے اور سلطان کو چاہیئے کہ اس کے فساد کا اعلان کردے تاکہ لینے اور دینے والے دونوں رک جائیں۔ اگر اعلان کے بعد بھی اہل خراج نے اس کو دیا تو بری نہ ہوں گے۔

(۳) یہ ہے کہ تاحیات وظیفہ مقرر کیا جائے اس کی صحت میں دو قول ہیں

(۱) یہ کہ صحیح ہے اگر یہ کہا جائے کہ اپاہج ہونے سے تنخواہ ساقط نہیں ہوتی۔

(۲) یہ کہ باطل ہے یہ اس پر مبنی ہے کہ اپاہج ہونے سے تنخواہ ساقط ہو جاتی ہے۔

وظیفہ جاری کرنے کے بعد سلطان کو سال رواں کے بعد اگلے سال سے بند کرنے کا اختیار ہے اس کی تنخواہ دیوان عطایا سے جاری کردے اور سال رواں میں بند کردے تو اگر اس کے وظیفہ کا وقت خراج کے وقت سے پہلے آگیا تو بند کرنا درست نہیں کیونکہ خراج میں اس کا حق ثابت ہو چکا ہے اور اگر خراج کا وقت وظیفہ کے وقت سے پہلے آگیا تو بند کر دینا جائز ہے کیونکہ مؤجل کی تعجیل جائز تو ہے واجب نہیں۔

فوجیوں کے علاوہ دوسرے کارکنوں کے وظائف اگر اخراج سے دیے جائیں تو ان کی تین قسمیں ہیں۔

پہلی یہ کہ ان کی تنخواہ عارضی کام کے لئے ہو جیسے عمال مصالح۔ محصلین خراج۔ تو ان کا وظیفہ مقرر کرنا صحیح نہیں ان کو جو کچھ ماوجب دیا جائے گا تو وہ تسبب اور حوالہ ہوگا۔

دوسری یہ کہ دائمی کام کے تنخواہ دار ہوں اور ہمیشہ بطور مزدوری تنخواہ پاتے ہوں یہ ان دینی کاموں کے انجام دینے والے ہیں جو بلا تنخواہ بھی ہو سکتے ہیں جیسے موذنین۔ ائمہ ان کی تنخواہیں بھی خراج میں سے بطور تسبب اور حوالہ کے دی جائیں یہ وظیفہ نہ ہوں گی۔

تیسری قسم یہ ہے کہ ان کی کارگذاری دوامی ہو اور تنخواہ بطور اجرت ملتی ہو یہ وہ کارکن ہیں کہ جن کی کارگذاری بدون ان کے تقرر کے صحیح نہیں ہوتی جیسے قاضی حکام محاسب ان کی تنخواہیں خراج میں سے ایک سال کے لئے جاری کی جا سکتی ہیں ایک سال سے زائد کے لئے ایک قول تو یہ ہے کہ جائز ہے لشکر پر قیاس کر کے دوسرا یہ ہے کہ ناجائز ہے کیونکہ ان کا تبادلہ اور تقرر کا احتمال رہتا ہے۔

دھاتیں اور جواہر وغیرہ | اقطاع معادن۔ اس سے زمین کے وہ ٹکڑے مراد ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے دھاتیں جواہر اور دوسری قسم کی اشیاء پیدا کی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

ایک ظاہرۃ دوسری باطنہ ظاہرہ سے مراد وہ ہیں جن کی چیز ظاہر اور کھلی ہوئی ہوں جیسے سرمہ۔ نمک، قار۔ لفظ ان کا حکم پانی کے مثل ہے جو کسی بطور جاگیر دیا جا سکتا سب آدمی برابر فائدہ اٹھائیں۔

ثابت بن سعید اپنے دادا کی روایت بیان کرتے ہیں کہ ابیض بن حمال نے مارب کے نمک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور جاگیر مانگا آپ نے دیدیا اقرع بن حابس تمیمی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اس نمک کو جاہلیت میں دیکھا ہے کہ وہاں اور کچھ نہیں ہے لوگ آتے ہیں اور پانی کی طرح جاتے ہیں آپ نے ابیض سے واپس کرنے کو

فرمایا تو اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ میں اس شرط پر واپس کرتا ہوں کہ آپ اس کو میری طرف سے صدقہ فرما دیں آپ نے فرمایا یہ تمہاری طرف سے صدقہ ہے اور مائے عد کی طرح ہر شخص کے لئے عام ہے ابوعبیدہ کا قول ہے کہ مائے عد سے مراد وہ پانی ہے جس میں انقطاع نہ ہو جیسے چشمے۔ کنویں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مائے عد سے مراد وہ پانی ہے جو معتد و مجتمع ہو بہر حال اس قسم کی چیزوں کو جاگیر میں دینا درست نہیں۔ اگر دے دی جائیں تو نا قابل اعتبار ہے۔ جاگیردار اور دوسرے لوگ سب مساوی الحقوق ہیں۔ اگر وہ ان کو منع کرے تو یہ اس کی زیادتی ہے جتنی مقدار لے گا اس کا مالک ہو گا کیونکہ منع کرنا تعدی ہے لینا تعدی نہیں البتہ اس کو ہمیشہ لینے سے روک دیا جائے تاکہ جاگیر کے حقوق اور ملکیت کی صورت ثابت نہ ہو۔

معادن باطنہ سے مراد وہ کانیں ہیں جن کے اشیاء پوشیدہ ہیں جیسے سونے چاندی، پیتل، لوہے وغیرہ کی کانیں عام اس سے کہ ان میں سے نکلے ہوئے مادے کو پگھلا کر صاف کرنے کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ ان کی جاگیریں دینے میں دو قول ہیں۔

پہلا یہ کہ ناجائز ہے معادن ظاہرہ کی طرح یہ بھی سب کے لئے عام ہیں

دوسرا یہ کہ جائز ہے کیونکہ ابن عوف اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث کو معادن قبطیہ کی جلسی اور غوری قدس کی ناقابل زراعت زمینیں جو اب تک کسی مسلمان کو نہیں دی گئی تھیں مرحمت فرمائیں جلسی اور غوری بلند و پست زمینیں ہیں۔

(۱) بلند و پست یہ قول عبداللہ بن وہب کا ہے۔

(۲) جلسی نجد کا علاقہ غوری تھامہ کا علاقہ یہ قول ابوعبیدہ کا ہے۔
شماخ کا قول ہے (بحر طویل)

فمرت علی ماء العذیب وعینها   کوقب الحصی قد تغور احبیها

ترجمہ:- وہ عذیب کے چشمۂ آب پر آئی جس کے دونوں بلند کنارے پتھریلے جوہر کی طرح سے گھرے ہو گئے تھے۔

اس قول پر جاگیر دار کو حق جاگیر حاصل اور دوسرے کو منع کرنا صحیح ہوگا اس کے حکم میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اقطاع تملیک ہے جاگیر دار ان کان کا اپنے اور اموال کی طرح مالک ہوتا ہے اپنی زندگی میں بیع کر سکتا ہے اور مرنے کے بعد وراثت جاری ہوگی۔ دوسرا یہ کہ اقطاع الارفاق (جاگیر منافع) ہے کان کا مالک نہیں ہوتا جب تک قابض رہے مستفید ہو کوئی شخص تعرض نہیں کر سکتا اور جب دست بردار ہو جائے جاگیر کے حکم سے خارج ہو کر حسب سابق سب کے لئے مباح ہو جائے گی۔

اگر کسی شخص نے زمین آباد کی خواہ جاگیر میں لے کر یا اس کے بدون اور اس میں ظاہری یا باطنی معدن نکلی تو آباد کنندہ ہمیشہ کے لئے مالک ہوگا جیسے چشموں اور کنوں کا کھودنے والا مالک ہو جاتا ہے۔

جرائم کے قوانین

جرائم شرعاً ممنوع ہیں اللہ تعالیٰ نے ان سے روکنے کے لئے حدود اور تعزیرات مقرر فرمائی ہیں جرائم کے تین حال ہیں۔

(۱) حال استبرار جو بوقت تہمت با قتضائے سیاست دینا ہوتا ہے۔

(۲) حال استعفاء جو جرائم کے ثبوت وصحت کے وقت بحکم شرعی ہوتا۔

(۳) حال بین بین یعنی تہمت کے بعد اور ثبوت وصحت سے قبل کے متعلق یہ ہے کہ اس کا اعتبار ناظر جرائم کے حال پر ہے اگر ناظر جرائم صرف حاکم ہو اور اس کے اجلاس میں متہم بالسرقہ یا بالزنا کو پیش کیا جائے اور اس کے سامنے یہ تہمت غیر موثر ہے تفتیش یا استبراء کے لئے متہم کو حبس کرنے کا مجاز نہیں نہ ایسے ذرائع استعمال کرائے کہ وہ اقرار جرم پر مجبور ہو اس کے خلاف دعویٰ سرقہ کی سماعت صرف صاحب حق مدعی سے کرے اور متہم کے اقرار یا انکار کا اعتبار کرے اور دعویٰ زنا کی سماعت اس وقت کرے جبکہ اس عورت کا تذکرہ کیا جائے جس کے ساتھ زنا کیا اور ایسا فعل بیان کیا جائے جو زنا ہو اور موجب حد ہو اگر ملزم اقرار کرلے تو اس کے اقرار کے بموجب

حد جاری کرے اگر انکار کرے اور بینہ موجود ہو تو اس کی سماعت کرے بینہ نہ ہو تو اگر مدعی چاہے تو حقوق العباد کے نہ حقوق اللہ کے لئے اس کو حلف دے اور اگر ناظر جرائم جس کے اجلاس میں مرافعہ کیا گیا امیر یا احداث و معاون کی اولاد ہو تو اس کو اس متہم کے متعلق تفتیش و استبراء کے ایسے اختیارات ہیں جو قاضیوں اور حکام کو نہیں ہیں ان دونوں کے اختیارات کو ممتاز کرنے والی نو چیزیں ہیں

متہم کے خلاف دعویٰ (۱) یہ کہ امیر کو جائز نہیں کہ متہم کے بلا تحقیق دعویٰ اعوان امارت کی تہمت سنے البتہ ان سے متہم کے حالات کہ آیا وہ مشتبہ لوگوں میں سے ہے یا اس طرح کی قابل تہمت باتوں میں مشہور ہے یا نہیں دریافت کرے اگر وہ اس کی براءت بیان کرے تو تہمت ضعیف ہو کر ساقط ہو جائیگی فوراً چھوڑ دیا جائے اور اگر اس جیسے کاموں متہم کریں تو تہمت شدید و قوی ہو جائے گی۔ لہٰذا التفتیش کی وہ صورت اختیار کی جائے جو عنقریب بیان کریں گے اور قاضیوں کو اس کا اختیا نہیں۔

تہمت کی قوت وضعف (۲) امیر کو اختیار ہے کہ تہمت کی قوت وضعت معلوم کرنے کے لئے متہم کے اوصاف اور شواہد حال کا لحاظ رکھے پس متہم بالزنا اور وہ عورتوں کا گرویدہ ان سے ہنسی مذاق کرتا ہو تو تہمت قوی ہو جائے گی اور اس کے خلاف ہو تو ضعیف ہو جائے گی اور اگر متہم بالسرقہ ہو اور چالباز آدمی ہو بدن پر مار پیٹ کے نشانات ہوں یا گرفتاری کے وقت اس کے ہاتھ میں آلہ نقب ہو تو تہمت قوی ہو جائے گی اور اس

کے خلاف ہو تو ضعیف ہو جائے گی قاضیوں کو یہ اختیار نہیں ہے۔

تفتیش استبراء

(۳) امیر کو اختیار ہے کہ متہم کو تفتیش اور استبراء کے لئے فوراً حوالات کر دے اس کی مدت میں اختلاف ہے عبداللہ زبیری شافعیؒ کہتے ہیں کہ ایک ماہ سے زیادہ حوالات کرنے کا اختیار نہیں۔ اور دوسرے علماء کہتے ہیں کہ مدت متعین نہیں۔ امام کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہے یہ رائے زیادہ مناسب ہے اور قاضی بلا حق واجب کسی کو قید کرنے کے مجاز نہیں۔

قرب تعزیر

(۴) اگر تہمت قوی ہو تو امیر مجاز ہے کہ متہم تعزیر دے نہ ضرب حد تاکہ تہمت کے متعلق سچ سچ بیان دے۔ اگر پیٹتے ہوئے اقرار کرے تو یہ دیکھا جائے کہ کس امر کے لئے پیٹا گیا ہے اگر اقرار کرانے کے لئے پیٹا گیا ہے تو پٹنے کے وقت کا اقرار غیر معتبر ہے اور اگر اس لئے پیٹا گیا ہے کہ صحیح صحیح حال بیان کرے اور پٹنے کے وقت اقرار کرے۔ تو ضرب موقوف کر دی جائے اور اقرار کا اعادہ کر دیا جائے اگر اعادہ کرے تو دوسرے اقرار سے ماخوذ ہوگا۔ پہلے سے نہ ہوگا۔ اور اگر پہلے اقرار پر اکتفا کی جائے دوبارہ نہ کرایا جائے تو امیر کو اختیار ہے کہ پہلے اقرار پر عمل کرے اگرچہ ہم اس کو مکروہ سمجھتے ہیں۔

عادی مجرم

(۵) اگر کسی مجرم کے جرائم بڑھ جائیں۔ بار بار کی سزا سے بھی باز نہ آئے۔ اور لوگوں کو اس سے مضرت پہنچے تو امیر اس کو تا موت حبس دائمی کی سزا دے سکتا ہے اس کے کھانے پینے کا خرچ بیت المال سے مقرر کر دے۔ قاضیوں کو یہ

اختیار نہیں ہے۔

امیر کا اختیار (۶) امیر کو جائز ہے کہ تہمت کو حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے خفیف یا شدید بنانے اور حالات کو منکشف کرنے کے لئے متہم کو حلف دے اور اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ خدا کی قسم کی طرح جو بیعت سلطانی میں ہوتی ہے طلاق یا عتاق یا صدقہ کی قسم دے مگر قاضی کسی کو بلا استحقاق قسم نہیں دے سکتے نہ خدا کے سوا طلاق و عتاق کی قسم دے سکتے ہے۔

جرائم پیشہ (۷) امیر کو اختیار ہے کہ جرائم پیشہ سے جراً اور دھمکیاں دیکر توبہ کرائے اس کے لئے قتل کی دھمکی بھی دے سکتا ہے۔ اگرچہ قتل کا مستوجب نہ ہو کیونکہ محض ڈرانا ہے اس لئے یہ دھمکی جھوٹ سے خارج اور تعزیر کے حکم میں داخل ہے۔ مگر واقعتہً قتل کرنا جائز نہیں ورنہ قتل لازم آئے گا۔

غیر مذاہب والوں کی شہادت (۸) امیر کو جائز ہے کہ دوسرے اہل مذہب اور راجن کی شہادت [illegible]نیوں کو سننا جائز نہیں اجب زیادہ ہو جائیں تو ان کی شہادت بھی سنے۔

(۹) امیر کے ذمے ایسی مار پیٹ کا انتظام بھی ہے جو موجب تاوان اور حد نہ ہوں اگر [illegible]کی کے بدن پر نشان نہ ہو تو اس کا دعوی لے جو دائر کرنے میں سبقت کرے [illegible]ور ایک کے بدن پر نشان ہو تو بعض علماء کی رائے ہے کہ صاحب نشان [illegible]دعوی پہلے سنے سبقت کا اعتبار نہ کرے اور اکثر فقہا کا مذہب یہ ہے [illegible]سبقت کرنے والے کا سنے ان میں پہل کرنے والا زیادہ مجرم اور شدید

سزا کا مستوجب ہے۔ ان کی تادیب میں دو لحاظ سے فرق کرنا جائز ہے۔ ایک بحیثیت اس کے کہ تعدی اور ارتکاب جرم میں مختلف ہوں دوسرے باعتبار اس کے کہ عزت و آبرو میں مختلف ہوں اگر امیر کے نزدیک کمینوں کو جرائم سے باز رکھنے کے لئے تمام شہر میں مشہور کرنا مناسب ہو تو اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے یہ وہ امور ہیں جن سے حال استبرا اور قبل ثبوت کے بین امیر اور قاضی کے اختیارات کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ امیر کو سیاست کی ضرورت ہے اور قاضی صرف احکام کا نفاذ کرتا ہے۔

ثبوت جرائم

ثبوت جرائم کے بعد حدود قائم کرنے میں امیر اور قاضی کے اختیارات مساوی ہیں ثبوت جرائم کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) اقرار سے

(۲) بینہ سے ہر ایک کے احکام اپنے اپنے مقام پر بیان ہونگے حدود زواجر ہیں حق تعالیٰ نے ان کو ارتکاب ممنوعات اور ترک مامورات سے باز رکھنے کے لئے وضع فرمایا ہے چونکہ انسانی طبیعت میں ایسے شہوانی جذبات موجود ہیں جو دہ لذات میں مصروف کرکے انسان کو آخرت کی وعید سے غافل کر دیتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے حدود تجویز فرمائیں تاکہ درد الم کے خوف اور رسوائی و فضیحت کے اندیشے سے اس جاہلانہ فعل کا مرتکب نہ ہو اور صلاحیت عامہ اور انسان بدرجۂ اتم مکلف ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ

الا رحمۃ للعالمین ۔

ترجمہ:۔ ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کے بھیجا ہے یعنی لوگوں کو جہالت و گمراہی سے نکال کر ہدایت پھیلانے اور معاصی چھڑا کر اطاعت کا خوگر کرنے کے لئے بھیجا ہے ۔ زواجر کی دو قسمیں ہیں ۔

(۱) حدود ۔

(۲) تعزیرات ۔ حدود کی دو قسمیں ہیں

(۱) حقوق اللہ سے متعلق ۔

(۲) حقوق العباد سے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے ان کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک وہ جو ترک فرائض سے لازم ہوں جیسے فرض نماز کا ترک یہاں تک کہ وقت نکل جائے ۔ اس سے سبب ترک دریافت کیا جائے اگر یہ کہے کہ بھول گیا تو یاد آنے کے ساتھ ہی قضا پڑھنے کا حکم دیا جائے ۔ اس جیسی نماز کے وقت کا انتظار نہ کیا جائے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص نماز پڑھنی بھول جائے یا سو جائے اس کو چاہیئے کہ یاد آنے اور بیدار ہونے پر فوراً ادا کرے اس کا بھی وقت ہے اس کے علاوہ نماز کا اور کچھ کفارہ نہیں ہے ۔ اگر بیماری کی وجہ سے ترک کی ہو تو بیٹھ کر لیٹ کر جس طرح طاقت ہو ادا کرے ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا ۔

ترجمہ :۔ اللہ تعالیٰ کسی کو وسعت سے زیادہ مکلف نہیں فرماتا اور اگر منکر وجوب ہو کر ترک کرے تو کافر اور بحکم مرتد ہے ۔ اگر تائب

نہ ہو تو ارتداد جرم میں قتل کر دیا ئے۔

تارک صیام گو باجماع فقہا قتل نہ کیا جائے۔ بلکہ پورے رمضان اس کا کھانا پینا بند کر دیا جائے اور تادیباً تعزیر بھی کی جائے اگر روزے رکھنے پر آمادہ ہو تو چھوڑ دیں اور اس معاملہ کو اسی کے ایمان وامانت کے تفویض کر دیں۔ اگر پھر کھاتا پیتا نظر آئے تو تعزیر کی جائے۔ قتل نہ کیا جائے

تارک زکوٰۃ کا قتل نہ کیا جائے

ترک زکوٰۃ سے بھی قتل نہ کریں جبراً اس کے مال میں سے وصول کریں اگر بلاشبہ زکوٰۃ کو پوشیدہ کرنا ہو تو سزا دی جائے ماگر اس کے نہ دینے کی وجہ سے وصول کرنا دشوار ہو تو لڑکر وصول کی جائے اگرچہ لڑائی سے قتل تک نوبت پہنچے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے زکات سے انکار کرنے والوں سے لڑائی کی تھی۔

حج کی فرضیت امام شافعیؒ کے نزدیک علی التراخی استطاعت حج اور موت کے بین بین ہے۔ لہٰذا ان کے مذہب پر حج اپنے وقت سے موخر نہیں ہوتا اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک علی الفور ہے اس لئے ان کے مذہب پر وقت سے تاخیر ہو سکتی ہے لیکن وہ اس کی وجہ سے قتل یا تعزیر کا حکم نہیں دیتے کیونکہ وقت کے بعد بھی وہ ادا قرار دیتے ہیں۔ قضا نہیں کہتے۔ اگر ادائے حج سے قبل مرجائے تو اس کے مال سے حج بدل کرایا جائے۔

جو شخص آدمیوں کے حقوق قرض وغیرہ ادا نہ کرے اس سے اگر ممکن ہو جبراً وصول کرائے جائیں۔ ورنہ قید کر دیا جائے اور اگر

مفلس ہو تو مہلت دی جائے۔ یہ ترک معروضات کا حکم تھا۔ امتناع ممنوعات سے جو امور واجب ہوتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ایک حقوق اللہ سے متعلق یہ چار ہیں۔

(۱) حدِّ زنا۔
(۲) حدِ خمر
(۳) حدِ سرقہ
(۴) حدِ محاربہ

دوسری حقوق الناس سے متعلق یہ دو ہیں۔

(۱) حد قذف بالزنا۔
(۲) قذف فی الجنایات۔ ہم ان کو بالتفصیل بیان کرتے ہیں۔

زنا کی سزا زنا کی تعریف یہ ہے کہ عاقل بالغ کے ذکر کا حشفہ قبل یا دبر میں غائب ہوا اور دونوں آپس میں باعصمت نہ ہوں۔ نہ صورت شبہ ہو۔ امام ابوحنیفہؒ زنا کو قبل سے مخصوص فرماتے ہیں۔ حدِّ زنا زانی اور زانیہ دونوں کے لئے یکساں ہے۔ بکر (غیر شادی شدہ) اور محصن (شادی شدہ) بکر وہ جیسے نکاح کر لئے اپنی بیوی سے جماع نہیں کیا یہ اگر حر ہو تو اس کی حد سو تازیانے ہیں جو تمام بدن کے متفرق حصّوں پر لگائے جائیں۔ چہرے کو اور ان اعضا کو جن پر ضرب لگنے سے انسان مرجاتا ہے، محفوظ رکھیں۔ اس احتشا کے ساتھ ہر عضو پر حد جاری کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سزا میں ہر عضو اپنے سزاوار حصّہ پالے۔ اس حد میں تازیانہ استعمال کیا جائے۔ کوڑا نہ ہو ورنہ مرجائے گا اور نہ بالکل آہستہ ماریں کہ چوٹ ہی نہ لگے اور

درد ہی نہ ہو۔ سزائے تازیانہ کے ساتھ جلاوطن کرنے کے متعلق
اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ صرف تازیانہ کی سزا ہے
امام مالکؒ فرماتے ہیں مرد کو جلاوطن کیا جائے عورت کو نہ کیا جائے
امام شافعیؒ مرد و عورت دونوں کو ایک سال کے لئے کم از کم ایک
دن رات کی مسافت پر جلاوطن کرنے کا حکم دیتے ہیں چونکہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لو مجھ سے قانون سنو اللہ تعالیٰ نے
ان کے لئے راستہ نکال دیا۔ بکر بکر سے زنا کرے تو سو تازیانے
اور ایک سال جلاوطنی۔ ثیب ثیب سے زنا کرے تو سو تازیانے
اور رجم کافر و مسلمان کی حد تازیانہ اور جلاوطنی میں امام شافعیؒ کے نزدیک
مساوی ہے غلام اور جو غلامی کے حکم میں ہوں جیسے مدبر۔ مکاتب
ام داران سب کی حد زنا پچاس تازیانے یعنی حر کی سے نصف ہے
کیونکہ غلامی کی وجہ سے ناقص ہے ان کو جلاوطن کرنے میں اختلاف
ہے ایک قول یہ ہے کہ جلاوطن نہ کیا جائے اس میں ان کے آقا کا
نقصان ہے یہی قول امام مالک کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حر کی طرح
ایک سال کے لئے جلاوطن کر دیا جائے امام شافعیؒ کا ظاہر مذہب
یہ ہے کہ تازیانوں کی طرح جلاوطنی بھی نصف یعنی نصف کی جائے
محصن وہ ہے جو نکاح صحیح کر کے اپنی زوجہ سے جماع کر چکا ہو۔
اس کی حد رجم ہے یعنی پتھروں یا اُن کے قائم مقام چیزوں سے
اتنا ماریں کہ مر جائے۔ اس کو قتل سے بچانا ضروری نہیں۔ کیونکہ رجم
سے مقصود قتل ہے رجم کے ساتھ تازیانے لگائے جائیں۔ داؤد
کہتے کہ سو تازیانے لگا کر رجم کیا جائے۔ تازیانہ کی سزا محصن کے حق میں

منسوخ ہوگئی ہے ماعز رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف رجم کیا تھا جلد (سزائے تازیانہ) نہیں فرمایا تھا۔ احصان کیلئے اسلام شرط نہیں لہٰذا کافر کو بھی مسلم کی طرح رجم کیا جائے۔ امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک اسلام شرط ہے۔ لہٰذا اگر کافر زنا کرے تو جلد کیا جائے رجم نہ کیا جائے۔

زنا کا ثبوت اقرار سے ہوتا ہے یا بینہ سے۔ اقرار کے متعلق یہ ہے کہ اگر عاقل بالغ خود بخود ایک مرتبہ زنا کا اقرار کرے تو اس پر حد جاری کی جائے۔ امام ابوحنیفہ رح فرماتے ہیں کہ جبتک چار مرتبہ اقرار نہ کرے قابل مواخذہ نہیں۔ ہے۔ جب اقرار سے حد واجب ہو جائے اور حد کے جاری کرنے سے پہلے رجوع کرلے تو حد ساقط ہو جاتی ہے۔

اور بینہ کی صورت یہ ہے کہ چار شاہد عدل مرد (عورت نہیں) ملزم کے خلاف فعل زنا کی شہادت دیں اور بیان کریں ہم نے اس کے ذکر کو اس کی فرج میں اس طرح داخل ہوتے دیکھا ہے جس طرح سلائی سرمہ دانی میں اگر اس کیفیت سے نہ دیکھا ہو تو شہادت نہیں ہو سکتی۔ ادائے شہادت کے لئے خواہ ایک ساتھ آئیں یا متفرق طور پر دونوں طرح قبول ہے۔ امام ابوحنیفہ رح اور امام مالک رح فرماتے ہیں اگر متفرق ادا کریں تو میں قبول نہیں کرتا ان کو قاذف (تہمت باندھنے والا) قرار دیتا ہوں۔

اگر ملزم ممکن اشتباہ مثلاً نکاح فاسد بیان کرے یا اپنی بیوی کے ساتھ مشتبہ ہونا بیان کرے یا نو مسلم ہو کر زنا کی حرمت سے واقف

نہ ہو تو حد ساقط ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے حدود کو شبہات سے ساقط کر دو۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر اجنبی عورت سے بیوی کا اشتباہ ہوا تو یہ شبہ نہیں ہے۔ حد لگائی جائے۔ اگر اپنی محرم سے نکاح کر کے جماع کر بیٹھا تو حد لگائیں چونکہ اس کی تحریر منصوص ہے اس لئے عقد نکاح حد ساقط کرنے کے لئے شبہ نہیں ہے امام ابو حنیفہؒ شبہ قرار دے کر حد کو ساقط کرتے ہیں۔

ذاتی یا غیر ذاتی کی حد ساقط کرانے کے لئے سفارش کرنا جائز نہیں نہ حاکم کو سفارش قبول کرنا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

من یشفع شفاعة حسنة یکن له نصیب منها ومن یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها۔

ترجمہ:۔ جو شخص نیک امر میں سفارش کرتا ہے اور اس میں حصہ دار ہے اور جو برائی میں سفارش کرتا ہے وہ اس میں حصہ دار ہے۔

سرقہ کی سزا اگر کسی محفوظ مال کو جس کی قیمت بقدر نصاب ہو کوئی عاقل بالغ جسے نہ مال میں شبہ ہو نہ اس کی حفاظت میں چرالے تو اس کا دایاں ہاتھ پہنچے پر سے قطع کر دیا جائے اس قطع کے بعد پھر اسی محفوظ مال سے یا کسی اور سے چرائے تو بایاں پیر ٹخنے پر سے قطع کیا جائے۔ تیسری مرتبہ چوری کرے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس میں قطع نہ کیا جائے اور امام شافعیؒ کے نزدیک تیسری مرتبہ میں بایاں ہاتھ اور چوتھی مرتبہ میں دایاں پیر قطع کرے پانچویں مرتبہ چوری کرے تو تعزیر کیا جائے قتل نہ کیا جائے۔ اگر قطع سے پہلے چند مرتبہ سرقہ کر چکا ہے تو ایک ہی قطع واجب

مقدار نصاب میں جس سے قطع لازم ہو فقہاء کا اختلاف ہے امام شافعیؒ کے نزدیک جس کی قیمت ربع دینار یا اس سے زیادہ ہو مقدار نصاب ہے۔ اور دینار کا اعتبار ہے جو کھرا اور مروج ہو امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ دس درہم یا ایک دینار ہے اس سے کم قطع نہ کیا جائے ابراہیم نخعی چالیس درہم یا چار دینار قرار دیتے ہیں۔ ابن ابی لیلیٰ پانچ درہم امام مالکؒ تین درہم قرار دیتے ہیں۔ داؤد کہتے ہیں نصاب کچھ نہیں قلیل وکثیر سب میں قطع واجب ہے۔ اس میں فقہا کا اختلاف ہے امام شافعیؒ کی رائے ہے کہ ہر اس مال میں قطع واجب ہے جو چور پر حرام ہو امام ابوحنیفہؒ کہتے کہ جس کی اصل مباح ہو اس میں قطع نہ کیا جائے گا۔ جیسے شکار۔ لکڑی۔ گھاس۔ امام شافعیؒ کے نزدیک جب ان کا کوئی مالک ہو جائے قطع واجب ہے امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ تر طعام میں قطع نہ کیا جائے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں اس میں قطع کیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں سارق مصحف قطع نہ کیا جائے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک قطع کیا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مسجد کی قندیل یا کعبے کے پردے چرانے پر قطع نہ کیا جائے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک قطع کیا جائے۔ اگر صغیر سن غلام کو جو نا سمجھ ہو یا عجمی چرالے تو امام شافعیؒ کے نزدیک قطع کیا جائے امام ابوحنیفہ کے نزدیک قطع نہ کیا جائے اگر چھوٹے بچے کو چرالے تو قطع نہ کیا جائے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ قطع کیا جائے۔

اگر نقب میں دو آدمی شریک ہوں اور مال تنہا ایک اٹھائے تو اٹھانے والے کو قطع کیا جائے شریک نقب کو قطع نہ کیا جائے۔ اگر اس طرح

شریک ہوں کہ ایک صرف نقب دے دوسرا صرف مال اٹھائے تو دونوں میں سے کسی کو قطع نہ کیا جائے۔ ایسی ہی صورت کے لئے امام شافعیؒ کا قول ہے کہ ظریف چور قطع نہ کیا جائے۔

اگر چور کو قطع کر دیا جائے اور مال موجود ہو تو مالک کو واپس دیا جائے قطع کے بعد پھر اس مال کو محفوظ جگہ سے چرالے تو پھر قطع کیا جائے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایک مال پر دو مرتبہ قطع نہ کیا جائے۔ اگر چرانے کے بعد مال کو ہلاک کر دے تو قطع بھی کیا جائے اور تاوان بھی لیا جائے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ قطع ہو تو تاوان نہیں۔ اور تاوان لیں تو قطع نہیں ہے اگر مال مسروقہ چور کو ہبہ کر دیا جائے تو قطع ساقط نہیں ہوتا امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ ساقط ہو جاتا ہے۔

معاویہؓ کے سامنے چند چوروں کو پیش کیا گیا جب سب کے ہاتھ قطع کر چکے اور ایک باقی رہ گیا اس کو قطع کے لئے آگے کیا گیا تو اس نے یہ شعر پڑھے۔

یمینی امیر المومنین اعیذھا بعفوک تلقی نکالا یبینھا
یدی کانت الحسناء لو تم سترھا ولا تقدم الحسناء عیبا یشینھا
فلا خیر فی الدنیا و کانت خبیثة اذا ما شمال فارقتھا یمینھا

ترجمہ:۔ اے امیر المومنین میں اپنے ہاتھ کو عذاب سے بچانے کے لئے آپ کی پناہ میں دیتا ہوں کاش میرا خوبصورت ہاتھ پورے طور پر پردے میں رہتا اور اس سے یہ عیب سرزد نہ ہوتا دنیا اس وقت کس کام کی بلکہ بہت بری ہو گی جبکہ بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ سے جدا ہو جائے گا۔

حضرت معاویہؓ نے فرمایا یہ کیسے ہو سکتا ہے تیرے ساتھیوں کے ہاتھ قطع ہو چکے ہیں - اس کی ماں نے کہا یہ گناہ آپ اپنے ان گناہوں میں سمجھیں جن سے آپ اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں گے - یہ سن کر اس کو چھوڑ دیا یہ پہلی حد ہے جو اسلام میں ترک کی گئی - قطع سرقہ میں مرد، عورت، حر، غلام مسلمان کافر سب برابر ہیں - بچے کو قطع نہ کیا جائے - مدہوش بحالت مدہوشی چوری کرے تو قطع کیا جائے - غلام اپنے آقا کے مال کی چوری کرے - یا باپ کے مال کی چوری کرے تو قطع نہ کیے جائیں - داؤد کہتے ہیں کہ دونوں کو قطع کیا جائے -

---

احتساب

احتساب امر بالمعروف کو (جبکہ معروف (نیک کام) متروک ہو جائے اور نہی عن المنکر کو (جبکہ منکر یعنی برا کام ہونے لگے) کہتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر)

ترجمہ:۔ تم میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی ہونا چاہیئے جو خیر کی طرف لوگوں کو دعوت دے۔ نیک کام کرنے کے لئے حکم دے اور برے کاموں سے روکے)

یہ کام اگرچہ مسلمان کرسکتا ہے لیکن متطوع (غیر تنخواہ دار) اور محتسب (تنخواہ دار) میں دو وجہ سے فرق ہے۔

(۱) یہ کہ محتسب پر بحیثیت عہدہ فرض ہے اور دوسروں پر فرض کفایہ ہے۔

(۲) یہ کہ محتسب پر یہ ایسا حق ہے جس سے تغافل جائز نہیں اور متطوع

کے لئے از قبیل نوافل ہے اس کو اس کے علاوہ اور کام میں مشغول ہونا جائز ہے ۔

تیسری یہ کہ محتسب کو اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس سے منکرات کی شکایت کی جائے اور متطوع اس لئے نہیں ہوتا ۔

چوتھی یہ کہ محتسب پر شکایت کنندہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے متورع پر ضروری نہیں ۔

پانچویں یہ کہ نیک و بد کاموں کی تحقیق و تفتیش کرتا ہے تاکہ بدکاموں کو بند کرے اور نیک پر پابند کرے ۔ اور متطوع کے ذمے یہ نہیں ہے ۔

چھٹی یہ کہ محتسب منکرات کی بندش کے لئے اعوان (پولیس) طلب کر سکتا

ساتویں یہ کہ وہ منکرات پر حدود سے کم سزا دے سکتا ہے اور متطوع نہیں دے سکتا ۔

آٹھویں یہ کہ محتسب کو بیت المال سے منصب احتساب کی تنخواہ دیجائے اور متطوع کو تنخواہ دینا جائز نہیں ۔

نویں یہ کہ جن امور کا تعلق عرف سے ہے شریعت سے نہیں ان میں اپنے اجتہا د رائے سے کام کر سکتا ہے ۔ مثلاً بازاروں میں بیٹھنے کی جگہیں اور چھجے بنانا اگر مناسب ہو تو باقی رکھے ورنہ روکدے اور متورع کو یہ اختیار نہیں ہے ان وجوہ سے معلوم ہوگیا کہ اگرچہ متطوع امر بالمعروف کر سکتا ہے لیکن اس میں اور محتسب میں بڑا فرق ہے ۔ لہٰذا محتسب میں حسب ذیل شرائط ہونا ضروری ہے ۔ حر ۔ عدل ۔ ذی رائے و ذی عزم اور دین میں متشدد ۔ اور منکرات سے واقف ۔

محتسب اور مجتہد جاننا چاہیئے کہ احتساب محکمۂ قضا اور محکمۂ مظالم کے درمیان ایک محکمہ ہے اس کو محکمۂ قضا سے یہ نسبت ہے کہ دو باتوں میں اس کے برابر ہے اور دو میں اس سے کم اور دو میں اس سے زائد ہے۔

جن میں برابر ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ حقوق انسان میں سے تین قسم کے دعوے محتسب کے ہاں کئے جا سکتے ہیں اور محتسب سماعت کر سکتا ہے۔

(۱) ناپ تول کی کمی کا دعویٰ

(۲) مبیع یا ثمن میں دخل اور کھوٹ کا دعویٰ۔

(۳) واجب الادا دین کو باوجود قدرت کے نہ دینے اور ٹالنے کا دعویٰ

یہ تین دعوے ایسے ہیں کہ ان کا تعلق منکرات ظاہرہ سے ہے۔ اور چونکہ محتسب کا فرض منصبی یہ ہے کہ دینداری کی باتیں جاری کرے اور بری باتوں کا استیصال کرے بلکہ حسب ضرورت پولیس سے امداد دے۔ ان تینوں دعوؤں کی سماعت کرے ان کے علاوہ اور احکام اور انفصال مقدمات کرنے کا مجاز نہیں۔

دوسری بات جس میں یہ محکمۂ قضاء کے برابر ہے یہ ہے کہ محتسب مدعا علیہ کو حق واجب شدہ سے عہدہ برآ ہونے پر مجبور کرے مگر یہ صرف ان حقوق میں کرنے کا مجاز ہے جن کے دعاوی کی سماعت کرنے کا اسے حق ہے اعتراف و اقرار کے بعد اگر ممکن و سہل ہو تو مقر کو چاہیئے کہ حق فوراً صاحب حق کے حوالے کر دے۔ کیونکہ تاخیر حق منکر ہے اور محتسب اس کے ازالہ کے لئے مامور ہے اور جن دو باتوں میں محکمۂ احتساب محکمۂ قضاء سے کم ہے ان

میں سے پہلی بات یہ ہے کہ محتسب کو عام دعوؤں کی سماعت کا حق نہیں منکرات ظاہری کے علاوہ عقود و معاملات ۔ حقوق و مطالبات کے تمام دعوے اس کے اجلاس میں نہ کئے جائیں نہ وہ اس قسم کے دعوؤں میں احکام نافذ کرنے کا مجاز ہے ۔ قلیل و کثیر حتیٰ کہ ایک درہم کے متعلق بھی کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا ہاں فرائض احتساب پر اگر یہ مزید اختیارات بصراحت دیئے جائیں تو عہدہ قضا اور عہدہ احتساب دونوں کو جامع ہو گا اس صورت میں ضروری ہے کہ اہل اجتہاد ہو اور اگر ایسا نہ کیا جائے صرف احتساب کے لئے مامور ہو تو جملہ مقدمات کے انفصال کا تعلق قضات اور حکام سے ہوتا ہے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ محکمۂ احتساب کی کارروائی ان امور میں نافذ ہوتی ہے جن کا مجرم اعتراف کرے اور جن امور میں طرفین انکار و تجاہد کریں ان میں محکمہ احتساب کو ہاتھ ڈالنا جائز نہیں ۔ کیونکہ یہ سماع بینہ اور حلف دینے پر موقوف ہیں اور یہ دونوں احکام اور قضات سے متعلق ہیں ۔

احتساب و قضاء جن دو باتوں میں محکمہ احتسابت محکمہ قضا رسے زائد ہے کہ محتسب خود تلاش و تجسس کر کے ایسے مقدمات پکڑ سکتا ہے جن کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعلق ہے یہ ضروری نہیں کہ کوئی آن کر دعویدار ہو اور قاضی تا وقتیکہ کوئی دعویدار اور داد خواہ نہ ہو ایسا نہیں کر سکتا ۔ اگر کوئی قاضی ایسا کرے تو وہ ظالم اور حدود و اختیارات سے باہر قدم رکھنے والا ہے ۔ دوسری بات یہ ہے ۔ کہ محتسب اپنے فرض منصبی کو انجام دینے اور ازالہ منکرات میں سلطنت کے دباؤ اور سختی کو کام

میں لاسکتا ہے ایسا کرنے سے جابر و ظالم نہیں ہوتا اور قاضی کا منصب عدل و انصاف ہے اس کے کام میں تحمل و وقار کی ضرورت ہے لہٰذا وہ اگر ایسا کرے ظالم و جابر ہوتا ہے محکمۂ احتساب اور محکمۂ مظالم میں مشابہت بھی ہے اور فرق بھی مشابہت دو حیثیت سے ہے۔

ایک تو یہ ہے کہ ان دونوں کی وضع میں سلطنت کا مخصوص رعب اور ہیبت داخل ہے۔

دوسری یہ کہ ان دونوں محکموں کو از خود ظلم کھلا تعدی کا روکنا اور نیک چلنی اور امن قائم کرنا جائز ہے۔

اور فرق بھی دو حیثیت سے ہے۔

(۱) یہ کہ محکمہ مظالم ان امور کے لئے ہے جن سے قاضیوں کو روک دیا جائے یہی وجہ ہے کہ والی مظالم کا رتبہ اعلیٰ ہے اور محتسب کا رتبہ ادنیٰ لہٰذا والی مظالم قاضی اور محتسب کو فرمان بھیجے تو جائز ہے اور قاضی و والی مظالم کو فرمان نہیں بھیج سکتا محتسب کو بھیج سکتا ہے اور محتسب ان دونوں میں سے کسی کو نہیں بھیج سکتا۔ اس ثانی فرق کا حاصل یہ ہے کہ والی مظالم حکم کر سکتا ہے اور محتسب (فیصلہ) نہیں کر سکتا۔

وضع اور فرق احتساب اور قضار و مظالم کی وضع اور فرق سمجھنے کے بعد جاننا چاہئیے کہ احتساب کی دو فصلیں ہیں۔

(۱) امر بالمعروف

(۲) نہی عن المنکر۔

امر بالمعروف کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) حقوق اللہ سے متعلق۔

(۲) حقوق العباد سے متعلق۔

(۳) مشترک حقوق سے متعلق حقوق اللہ کی دو نوع ہیں۔

ایک یہ کہ امر بالمعروف کا لزوم افراد کے لئے نہ ہو بلکہ جماعت کے لئے ہو جیسے وطن سکونت میں جماعت کا ترک کرنا پس اگر اتنے آدمی ہوں کہ بالاتفاق ان سے جمعہ منعقد ہو سکتا ہے مثلاً چالیس یا اس سے زائد تو ان کو قائم کرنے پر مجبور و مامور کرے اور کوتاہی کرنے پر تادیب کرے اور اگر چالیس سے کم ہوں کہ ان سے جمعہ منعقد ہونے میں اختلاف ہو تو ان کی چار حالتیں ہیں۔

(۱) حالت یہ ہے کہ محتسب اور قوم کے مذہب میں اتنے لوگوں سے سے جمعہ منعقد ہو جاتا ہے اس صورت میں محتسب پر واجب ہے کہ ان کو انعقاد جمعہ کا حکم دے اور ان پر تعمیل ضروری ہے ان میں کوتاہی کرنے والوں کو سزا دی جائے مگر نہ اتنی جتنی کہ بالاجماع وجوب کے تارکین کو۔

(۲) حالت یہ ہے کہ دونوں کے نزدیک اتنے افراد سے جمعہ منعقد نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں انعقاد کا حکم نہ دے بلکہ اگر منعقد کریں تو منع کرنا بہتر ہے۔

(۳) حالت یہ ہے کہ قوم کے نزدیک منعقد ہوا اور محتسب کے نزدیک نہ ہوا اس صورت میں کچھ تعرض نہ کرے نہ انعقاد کا حکم دے کیونکہ خود اس کے نزدیک اتنے افراد سے منعقد نہیں ہوتا۔ اور نہ ممانعت کرے کیونکہ وہ اپنے ذمہ فرض سمجھتے ہیں۔

(۴) حالت یہ ہے کہ محتسب کے نزدیک اپنے افراد سے جمعہ کا انعقاد

ضروری ہو اور قوم کے مذہب میں ضروری نہ ہو اس صورت میں باوجود امتداد زمانہ اور افراد کی کمی بیشی ہوتے رہنے کے جمعہ کا ترک بالاستمرار لازم آتا ہے تو کیا ایسی حالت میں انعقاد کے لئے مامور کر سکتا ہے یا نہیں؟ علمائے شافعیہ کے دو قول ہیں۔

(۱) یہ ہے اور یہی ابوسعید اصطخری کے قول کا اقتضا ہے کہ بلحاظ مصلحت انعقاد کا امر کر سکتا ہے تاکہ آنے والی نسلیں قلت عدد کی طرح کثرت عدد کی صورت میں بھی جمعہ کو ساقط نہ سمجھنے لگیں۔ کیونکہ زیاد نے بصرہ و کوفہ کی جامع مسجدوں میں اس قسم کی بات ملحوظ رکھی ہے لوگ جب صحن میں نماز پڑھتے تو سجدے سے اٹھ کر اپنی پیشانیوں سے مٹی صاف کیا کرتے زیاد نے صحن میں کنکریاں ڈلوادیں اور یہ کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ امتداد زمانہ کے بعد آئندہ نسلیں سمجھیں گی کہ پیشانیوں کو صاف کرنا نماز میں مسنون ہے۔

(۲) قول یہ ہے کہ ان سے کچھ تعرض نہ کرے کیونکہ اپنے مذہب و اعتقاد پر مامور کرنے اور اجتہادی مسئلے میں اپنے اجتہاد پر مواخذہ کرنے کا حق نہیں درآنحالیکہ ان کا اعتقاد یہ ہو کہ اعداد کی کمی جمعہ کی صحت کو مانع ہے۔

محتسب کا تعرض وہ اگر شخصی طور پر افراد نماز جمعہ یا اپنی نماز کے لئے اذان و اقامت ترک کر دیں تو جبتک عادتاً ایسا نہ کرے محتسب کوئی تعرض نہ کرے کیونکہ ان سے مندوبات اعذار سے ساقط ہو جاتے ہیں اور اگر شک یا عادت کی وجہ سے ایسا کرے یا اندیشہ ہو کہ دوسرے اس کی اقتدا کریں گے تو مصلحتاً اس کو ادائے سنن میں

سستی کرنے پر زجر کرے زجر کے مراتب اس کے حالات کے اعتبار سے ہونے چاہئیں جیساکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ نے فرمایا کہ میرا ارادہ ہوا کہ میں صحابہ کو لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں اور پھر حکم دوں کہ اذان واقامت کے ساتھ نماز پڑھیں اور خود ان لوگوں کے گھروں پر جاکر جو نماز میں شریک نہیں ہوئے آگ لگا دوں۔

اور وہ امور جن کے مامور افراد ہیں جیسے نماز میں اتنی تاخیر کرنا کہ وقت نکل جائے۔ اس کے متعلق یہ ہے کہ اس کو یاد دلایا جائے اور ادا کرنے کا حکم دیا جائے اگر یہ جواب دے کہ میں بھول گیا تھا تو تادیب نہ کرے یاد آنے پر پڑھنے کی تاکید کرے اور اگر کہے کہ میں نے کسل وسستی سے چھوڑی ہے تو تادیب کرے اور پڑھنے پر مجبور کرے۔ اور جو شخص تاخیر کرے اور وقت باقی ہو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیونکہ تاخیر کی فضیلت میں فقہا کا اختلاف ہے۔

امر بالمعروف امر بالمعروف جو حقوق العباد سے متعلق ہے اس کی دو نوع ہیں۔

(۱) عام

(۲) خاص

عام کی مثال یہ ہے کہ کسی شہر کی نہر وغیرہ بند ہو جائے یا شہر پناہ گر جائے یا حاجت مند مسافر گزریں اور ان کی اعانت نہ ہو ایسی صورت میں اگر بیت المال میں سرمایہ موجود ہو اور اس کے خرچ کرنے سے مسلمانوں کو مضرت نہ پہنچے تو اس کے روپے سے نہر کی اصلاح اور شہر پناہ کی تعمیر اور مسافروں کی حاجت روائی کا حکم دے۔ کیونکہ یہ حقوق بیت المال

پرواجب ہیں ان لوگوں پر نہیں ہیں - یہی حکم مساجد اور جامع مساجد کے منہدم ہونے پر ہے اور بیت المال میں سرمایہ نہ ہو تو ان تمام امور کا اہتمام عام اہل وسعت پر عائد ہوتا ہے کسی خاص شخص کے ذمے نہیں اگر یہ لوگ اس کو انجام دینے لگیں تو محتسب سے فریضۂ امر ساقط ہو جاتا ہے ان لوگوں کو مسافروں کی اعانت اور منہدم شدہ عمارتوں کی تعمیر کے لیے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں - ہاں اگر پرانی یا شکستہ عمارت کو گرا کر از سر نو تعمیر کرنا چاہیں تو جن کا تعلق عام اہل شہر سے ہے جیسے شہر پناہ یا جامع مسجد تو بلا اذن والی حکومت نہیں کر سکتے محتسب کی اجازت کافی نہیں - تاکہ وہ گرانے کے ان کو تعمیر کرنے کا ذمہ دار کر دے اور محلوں کی مساجد والی حکومت سے اجازت لینا لازمی نہیں - جن مساجد کو لوگ منہدم کریں ان کو پھر بنانے پر محتسب مجبور کرے جدید مسجد تعمیر کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا -

حقوق اللہ اور حقوق العباد

امر بالمعروف جو حقوق اللہ اور حقوق العباد میں مشترک ہے - اس کی مثال یہ ہے کہ اگر بیوہ عورتیں نکاح کی طالب ہوں تو اولیاء کو حکم دیں کہ کفو میں شادی کریں - ایسے ہی جن عورتوں پر عدت واجب ہو ان کو عدت کے احکام کا پابند کرے اور خلاف ورزی کرنے والی کو سزا دے - لیکن اگر عورتوں کے ولی نکاح کرانے کی ذمہ داری کو ادا نہ کریں تو ان کو تادیب نہیں کر سکتا - جو شخص اپنے بچے کے نسب کی نفی کرے اور بحکم الولد للفراش نسب اس سے ثابت ہو تو اس سے باپ کے احکام جبراً پورے کرائے اور نفی کرنے پر تادیبًا سزا دے - اگر غلام اور باندیوں

پر زیادتی ہو تو ان کے آقاؤں سے مواخذہ کرے اور حکم دے کہ ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیں۔ اسی طرح اگر مالک اپنے جانوروں کو پوری خوراک نہ دیں یا طاقت سے زیادہ کام لیں تو ان سے مواخذہ کرے۔ جس شخص کو لقطہ (پڑی ہوئی شے) ملے اور وہ اس کی کفالت میں کوتاہی کرے تو اس کو حکم دے کہ یا تو اس کے اٹھانے کے حقوق کفالت وغیرہ پوری پوری ادا کرو یا کسی کفالت کرنے والے کے حوالے کرو۔ اسی طرح بھٹکے ہوئے جانور کی کفالت اس کے پانے والے سے کرائے اگر جانور اس کی کوتاہی سے ہلاک ہو جائے تو وہ ضامن ہوتا ہے اور لقطہ ضائے ہو جائے تو ضامن نہیں ہوتا۔ اگر بھٹکا ہوا جانور کسی کو دے دے تو ضامن ہوتا ہے اور لقطہ کسی کو دینے سے ضامن نہیں ہوتا۔ حقوق مشترکہ کے امر بالمعروف کو اس پر قیاس کرو۔

نہی عن المنکر نہی عن المنکرات کی تین قسمیں ہیں۔ حقوق اللہ سے متعلق۔ حقوق العباد سے متعلق اور مشترک حقوق اللہ سے متعلق کی تین قسمیں ہیں۔ عبادات سے متعلق۔ محظورات سے متعلق۔ معاملات سے متعلق۔ عبادات سے متعلق کی یہ صورت کہ مثلاً کوئی عبادات کے طرز و طریقہ اور ان کے اوصاف مسنونہ میں تبدیلی کرے مثلاً جہری نماز میں اسرار یا سری نمازوں میں جہر کرنے لگے یا نماز و اذان میں غیر مسنون ادعیہ زیادہ کرے۔ محتسب کو چاہیئے کہ اگر وہ فعل کسی امام واجب التقلید کا قول نہ ہو تو مرتکب کو روکے اور معائد کو سزا دے علیٰ ہذا القیاس اگر بدن کپڑے اور نماز کی جگہ ٹھیک طور سے پاک نہ کرے اور بالتحقیق معلوم ہو تو اس کو روکے

محض کسی کے متہم کرنے اور گمان کرنے پر مواخذہ نہ کرے جیسا کہ ایک محتسب کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک شخص مسجد میں جوتے پہنے داخل ہوا ہے؛ اس نے انکار کیا تو کہا قسم کھاؤ لیکن یہ جہالت اور احکام احتساب میں تعدی اور سوء ظنی ہے۔

اسی طرح اگر منتسبین علم میں سے کوئی شخص بدعت پھیلائے اجماع اور نص کے خلاف باتیں کرے اور علمائے عصر اس کے خلاف ہوں تو ممانعت کرے اور دھمکائے اگر اس سے باز آجائے تو فبہا ورنہ سلطان کا کام ہے کہ دین کی حفاظت کرے۔

اگر کوئی مفسر قرآن کی ظاہری تاویل سے عدول کر کے بے تکلف نئے معنی گھڑ کر بیان کرے یا کوئی راوی منکر احادیث روایت کرنے میں متفرد ہو اور دل ان سے متنفر ہوں تو اس کو روکنا اور منع کرنا محتسب کا فرض ہے اس صورت میں محتسب کو روکنے کا اس وقت حق ہے جبکہ خود عالم ہو اور حق و باطل معانی و روایات سے واقف ہو یا علمائے عصر بالاتفاق اس کا ابطال کریں اور اس کے قول کو بدعت کہیں اور محتسب کو توجہ دلائیں تو ان کے بالاتفاق قول پر اعتماد کر کے منع کرے۔

محظورات محظورات سے متعلق نہی کی یہ صورت ہے کہ لوگوں کو محل شبہ اور تہمت سے روکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شبہ والی چیز کو چھوڑ کر غیر شبہ والی کو اختیار کرو۔ تادیب میں جلدی نہ کرے اس سے پہلے منع کرنا چاہیئے۔ ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے لوگوں کو عورتوں کے ساتھ پھرنے کی ممانعت کی تھی ایک شخص کو عورتوں کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھا تو اس کو

درّے لگائے اس نے کہا خدا کی قسم اگر میں نے اچھا کام کیا تو تم نے مجھ پر ظلم کیا اور اگر میں نے بُرا کام کیا تو تم نے مجھے اطلاع نہ کی تھی۔ آپ نے فرمایا کیا تو میری ہدایت کے وقت موجود نہ تھا۔ اس نے کہا ہاں میں موجود نہ تھا۔ آپ نے دُرّہ اس کے سامنے ڈال دیا اور کہا مجھ سے بدلہ لے لے اس نے کہا آج نہیں لیتا آپ نے فرمایا اچھا معاف کر اس نے کہا معاف بھی نہیں کرتا۔ اس کے بعد دونوں جدا ہو گئے اگلے دن وہ شخص پھر ملا حضرت عمرؓ کا رنگ بدل گیا۔ اس نے کہا امیر المومنین! شاید آپ پر میری بات کا اثر ہوا ہے آپ نے فرمایا ہاں۔ اس نے کہا میں خدا کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے آپ کو معاف کیا۔

اگر کسی مرد کو ایسے راستے میں عورت کے ساتھ کھڑا دیکھے جس میں لوگوں کی آمد و رفت ہو اور کوئی شک پیدا نہ ہو تو زجر و انکار نہ کرے کیونکہ اس کے بدون لوگوں کو چارہ نہیں۔ اور اگر خالی راستے میں دیکھے تو خالی ہونا شبہ پیدا کرتا ہے لہٰذا ان کو اس سے روکے تادیب میں جلدی نہ کرے۔ ممکن ہے اس کی محرم ہو اس سے کہدے اگر تیری محرم ہے تو اس کو محل تہمت سے بچا اور اجنبی ہے تو اللہ سے ڈر بچا و اس کے ساتھ خلوت کرنے سے معصیت میں مبتلا ہو جائے اور زجر علامات کے اعتبار سے کم و بیش کرے ابوالازہر بیان کرتے ہیں ابن عائشہ نے ایک شخص کو راستے میں ایک عورت سے باتیں کرتے دیکھ کر کہا اگر یہ تیری محرم ہے تو بڑے شرم کی بات ہے کہ تو سب کے سامنے اس سے باتیں کر رہا ہے اور اگر محرم نہیں تو یہ سب سے بدتر ہے یہ کہہ کر آپ واپس آ گئے کر

جب محتسب منکرات کو دیکھے تو تامل اور تفتیش سے کام لے اور
شواہد حالات سے اندازہ کرے تحقیق سے پہلے تعرض نہ کرے جیسا ابن
ابی زناد وہشام بن عروہ سے راوی ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ
طواف کر رہے تھے ایک شخص کو دیکھا کہ ایک خوبصورت عورت اپنے
کاندھوں پر چڑھائے طواف کر رہا ہے اور یہ پڑھتا جاتا ہے۔

قدت لهذی جملا ذلولا　　موطأ اتبع السهولا
اعدلها بالكف ان تميلا　　احذر ان تسقط او تزولا
ارجو بذاک نائلا جزيلا

ترجمہ:۔ اس کا سدھا ہوا مطیع اونٹ ہوں۔ ہر جگہ بے تکلف
جاتا ہوں اور اس ڈر سے کہ یہ گر نہ پڑے اپنے کندھوں پر اس
کا وزن برابر سنبھالتا ہوں اور اپنے اس کام سے مجھے بڑے
صلہ کی توقع ہے۔

حضرت عمر رضؓ نے فرمایا اللہ کے بندے یہ کون ہے جس کو تو نے
اپنا حج بخشدیا اس نے امیر المومنین! یہ میری بیوی ہے آپ نے فرمایا
اس کو طلاق کیوں نہیں دیدیتا عرض کیا یہ خوبصورت اور بچوں کی ماں
ہے علیحدگی ممکن نہیں آپ نے کہا تیری مرضی۔ ابو زید کہتے ہیں کہ یہ مرغا
یعنی مختلط الحواس تھا آپ نے تفتیش سے پہلے اسے کچھ نہیں کہا جب
شبہ جاتا رہا تو آپ نرم پڑ گئے اگر کوئی علی الاعلان شراب رکھے تو اگر
مسلمان ہو تو اس کی شراب بہا دے اور اس کو تادیب کرے۔ اور
ذمی ہو تو علی الاعلان رکھنے پر سزا دے اور گرانے میں فقہا کا اختلاف
ہے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں نہ گرائی جائے کیونکہ امام موصوف

کے نزدیک یہ ذمیوں کا حق اور مال مضمون ہے اور امام شافعیؒ کا مذہب
ہے کہ گرادی جائے ان کے نزدیک نہ مسلمان کے لیے مال مضمون
ہے نہ کافر کے لیے۔

نبیذ اور نبیذ کو علی الاعلان رکھے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک
اس پر مسلمانوں کی ملک ثابت ہو سکتی ہے لہٰذا گرانا ممنوع
ہے البتہ اظہار پر تادیب کر سکتا ہے۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک
کی طرح مال نہیں ہے گرا دے تو ضمان لازم نہیں آتا۔ لہٰذا محتسب
اہد حال کا لحاظ رکھ کر اظہار پر ممانعت کرے اور شراب بنانے کے واسطے
تو زجر کرے اور جبتک اہل اجتہاد حاکم، گرانے کا حکم نہ دے نہ گرائے
مرافعہ کیا جائے تو اس کو ضمان نہ دینا پڑے اگر کوئی ذمی نشے میں مست
کر باہر پھرے اور بکواس کرے تو نشے اور بکواس پر بے احتیاطی کی وجہ سے
یری سزا دے حد کی سزا نہیں دے سکتا۔

محظورات (بدافعالیاں) جب تک ظاہر نہ ہوں محتسب ان کا تجسس اور
پردہ دری نہ کرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس شخص سے کوئی
فعالی سرزد ہو تو وہ اللہ کے پردہ سے پوشیدہ رکھے۔ کیونکہ جو شخص اپنی کرتوت
رے سامنے ظاہر کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی انتقامی حد اس کے لیے موجود
ہے اگر آثار و علامات سے کسی کا چپکے چپکے بدافعالی کی تیاری کرنا معلوم
اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے ایسی حرمت کے ضائع ہوتے
ل کہ اس کی تلافی نہ ہو سکے مثلاً ایک سچے اور معتبر شخص کی زبانی معلوم ہو
آدمی ایک عورت کے پاس خلوت میں ہے اور زنا کیا جاتا ہے
قتل کیا جاتا ہے ایسی صورت میں محتسب کو تجسس اور تفتیش و تحقیق

کرنا جائز ہے تاکہ ناقابل تلافی جرم اور ناموس وری نہ ہونے پائے۔ متطوع بھی ایسے معاملات کی چھان بین اور روک تھام کرسکتا ہے۔ مغیرہ بن شعبہ کے متعلق بعض لوگوں کا بیان ہے کہ بصرہ میں ان کے پاس بنو ہلال کی ایک عورت مسماۃ ام جمیل بنت مُجم بن افقم آیا کرتی تھی اس کا شوہر قبیلہ ثقیف کا ایک شخص مسمی حجاج بن عبید تھا اس کی اطلاع ابو بکرہ بن مسروح سہل بن معبد۔ نافع ابن حارث اور زیاد بن عبید کو ہوئی تو وہ گھات میں لگے رہے ایک روز جب وہ مغیرہ کے پاس آئی تو ایک دم اندر گھس گئے اور پھر انھوں نے جو شہادت حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کی وہ مشہور ہے حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کے ایسا کرنے پر ناخوشی کا اظہار نہیں کیا البتہ شہادت مکمل نہ ہونے کی وجہ سے حد قذف جاری رکھی۔

تجسس دوسری قسم وہ ہے جو اس درجہ کی نہ ہو اس میں تجسس اور پردے کھولنا جائز نہیں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ایک مجلس میں داخل ہوئے لوگوں کو دیکھا کہ شراب نوشی کر رہے تھے اور جھونپڑیوں میں آگ روشن کر رکھی تھی۔ آپ نے فرمایا میں نے تمہیں شراب پینے سے روکا تھا تم باز نہ آئے اور جھونپڑیوں میں آگ روشن کرنے کی ممانعت کی تھی تم نے پھر روشن کی۔ انھوں نے کہا اے امیرالمومنین! اللہ نے آپ تجسس سے روکا ہے آپ تجسس کرتے ہیں۔ بلا اجازت مکان میں داخل ہونے کی ممانعت کی ہے اور بلا اجازت داخل ہوئے آپ نے فرمایا اچھا دونوں قصور ان دونوں کے عوض سمجھو اور واپس ہو گئے اگر کسی کے مکان سے کسی جماعت کی نامناسب آوازیں اور شور سننے میں آئے تو ان کو باہر سے منع کرے اندر داخل نہ ہو کیونکہ امر منکر ظاہر ہے اس کے علاوہ اندرونی حالت سے تعرض کرنا اس کے

ذمہ نہیں ہے۔

منکرات

جو منکرات محض حقوق الناس سے متعلق ہیں ان کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ہمسائے کی حد یا مکان کے صحن میں کچھ تعمیر کرے یا اس کی دیوار پر شہتیر رکھے اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک وہ استغاثہ نہ کرے محتسب کچھ دخل نہ دے کیونکہ یہ اس کا اپنا حق ہے۔ معاف بھی کر سکتا ہے اگر استغاثہ کرے اور آپس میں منکر حقوق نہ ہوں تو محتسب انتظام کرے تعدی کرنے والے سے اس کا حق دلائے اور اگر ضرورت ہو تو حسب حال تادیب بھی کر سکتا ہے اور اگر منکر حقوق ہوں تو ان کا مقدمہ حاکم طے کرے اگر ہمسایہ اس کی تعدی تعدی کو باقی رکھے اور اس کے گرانے کے متعلق اپنے حق کو معاف کر دے تو اسے اس کے بعد بھی اس مطالبہ کا حق رہتا ہے اگر پھر مطالبہ کرے تو تعدی کرنے والے کو حکم دیا جائے کہ اپنی تعمیر منہدم کر دے۔

اور اگر ابتدا ہی اس کی اجازت سے تعمیر کی ہے یا شہتیر رکھا ہے تو اب اس کو اپنی اجازت سے رجوع کرنے کا حق نہیں ہے لہٰذا التعمیر وغیرہ گرانے کا حکم نہیں دیا جا سکتا۔ اگر درخت کی شاخیں ہمسائے کے مکان پر پھیل جائیں تو وہ محتسب سے کہہ کر ان کو قطع کرانے پر مجبور کر سکتا ہے اس میں سزا کچھ نہیں کیونکہ شاخوں کا پھیلنا اس کا فعل نہیں ہے۔ اور اگر درخت کی جڑیں پھیل کر ہمسائے کی زمین میں داخل ہو جائیں تو ان کو قطع کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ ہاں اپنی زمین ہر طرح کا تصرف کر سکتا اگر کوئی شخص اپنی زمین میں تنور لگائے اور اس کے دھوئیں سے ہمسائے کو اذیت ہو تو اعتراض یا ممانعت کا حق نہیں۔ اسی طرح اگر مکان میں چکی

نصب کرے یا لوہاروں اور دھوبیوں کو رکھے تو ممانعت نہیں کر سکتے کیونکہ ہر شخص کو اپنی ملک میں تصرف کرنے کا حق ہے اور ان کاموں کے بدون چارہ بھی نہیں۔

اگر کوئی شخص اجیر پر زیادتی کرے مثلاً اجرت کم دے یا کام زیادہ لے تو محتسب ایسا کرنے سے روکے اور دھمکانے کے مراتب حالات کے اعتبار سے (شدید و خفیف) ہوں۔ اگر زیادتی اجیر کی طرف سے ہو مثلاً کم کام کرے اور اجرت زیادہ مانگے تو اس تو اس کو بھی روکے اور دھمکائے اور اگر ایک دوسرے کی بات کا انکار کریں تو فیصلے کا حق حاکم کو ہے۔

تین قسم کے پیشہ وروں کی نگرانی بھی محتسب سے متعلق ہے ایک وہ جن کے کام میں افراط و تفریط کا اندیشہ ہو۔ دوسرے وہ جن کے کام میں امانت و خیانت کا پہلو ہو۔ تیسرے وہ جو کام کو عمدہ اور ردی کر سکیں۔ پہلی قسم میں طبیب اور معلمین ہیں کیونکہ طبیب کی افراط و تفریط سے مرض کا اشتداد یا جان ضائع ہو جاتی ہے اور معلمین کی تربیت پر بچوں کی آئندہ اچھی بری زندگی اور عادات و اخلاق کا مدار ہے کہ اس کے بعد تبدیل ہونا سخت دشوار ہے لہٰذا جو شخص خوب عالم و دیندار اور اچھی خصائل سے آراستہ ہو اس کو برقرار رکھے اور جو ایسا نہ ہو اس کو ممانعت کر دے ورنہ خباثت نفس اور بد خصائل کی تخم ریزی اور اشاعت ہوگی

دوسری قسم میں سنار جلاہے دھوبی رنگریز داخل ہیں یہ بعض مرتبہ لوگوں کی چیزیں لے کر فرار ہو جاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ معتبر امانت داروں کو اپنا پیشہ کرنے دے اور جس کی ایک مرتبہ خیانت ظاہر ہو

اسے ممانعت کردے اور اس کے فعل کو مشہور کر دے تاکہ لوگ ناواقفی سے اس کے دھوکے میں گرفتار نہ ہوں ایک قول یہ ہے کہ ان کا انتظام محکمہ پولیس سے متعلق ہو تو بہتر ہے لبظاہر صحیح بھی ہے کیونکہ خیانت سرقہ کے تابع ہے اور تیسری قسم یعنی جو کام کو عمدہ اور ردی کر سکیں ان کا انتظام صرف محتسب کے ذمے ہے ہٰذا علی العموم سب کو خراب اور ردی کام کرنے کی ممانعت کرے اس کے لئے کسی کا شکایت کرنا شرط نہیں اگر کوئی خاص پیشہ ور کام خراب کرنے کا عادی ہو جائے تو استغاثہ کرنے پر اس سے مواخذہ کرے اگر تاوان دلانے کی صورت ہو تو اگر اس شئے کی قیمت کسی اندازے پر موقوف ہو تو یہ کارروائی محتسب کے اختیارات سے باہر ہے اور یہ قاضی کے اختیارات میں ہے البتہ قیمت کے اندازہ کرنے کی ضرورت نہ ہو بلکہ اس کی مثل شے دینی ہو کہ جس میں اجتہاد یا نزاع نہیں ہوتا تو محتسب کی کارروائی درست ہے اس پر تاوان عائد کرے اور اس جرم کی سزا دے کیونکہ محتسب کا کام ہے کہ وہ حقوق کی نگہداشت کرے۔ اور تعدی پر سزا دے۔

ذمی ایسی باتوں کی ممانعت جو حقوق اللہ اور حقوق العباد میں مشترک ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ لوگوں کے گھروں کی طرف جھانکنے کی ممانعت کی جائے جس کا مکان بلند ہو اس پر اپنی چھت کی چہار دیواری بنانا لازم نہیں لیکن یہ لازم ہے کہ دوسروں کی طرف نہ جھانکے۔ ذمیوں کو مسلمانوں سے بلند مکانات تعمیر کرنے کی ممانعت کی جائے اور اگر اونچے مکانات کے مالک ہو جائیں تو رہنے دے لیکن مسلمانوں کے مکانات کی طرف دیکھنے کی ممانعت ہو ذمیوں سے شرائط معاہدہ پوری

کرائی جائیں مثلاً لباس اور ہیئت میں فرق رکھنا عزیرؑ و مسیحؑ کے متعلق علی الاعلان کچھ نہ کہنا۔

اگر کوئی ذمی مسلمان کو گالی دے یا اذیت پہنچائے تو اس کو منع کیا جائے اس کے خلاف کرنے والے کو تادیب کی جائے راستے کی مسجدوں اور جامع مسجدوں کے امام اگر قرائت اتنی طویل کرتے ہو کہ ضعیف برداشت نہ کر سکیں اور لوگوں کے کاروبار میں حرج واقع ہو تو ممانعت کی جائے معاذ بن جبلؓ اپنے لوگوں کے ساتھ نماز میں طویل قرارت پڑھتے تھے شکایت کی گئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معاذ کیا تم فتنہ پھیلاتے ہو۔ اگر امام باز نہ آئے تو سزا دینا جائز نہیں اس کو علیحدہ کر کے دوسرے کم پڑھنے والے کو مقرر کرے۔

اگر قاضی اپنے دروازوں پر دربان مقرر کرے۔ داد خواہ مقدمات لیکر آئیں اور تصفیہ نہ کرے اور اس سے تاخیر میں خلل داد خواہوں کو مضرت ہو تو محتسب کو حق ہے کہ بلا عذر ایسا کرنے والے سے باز پرس کرے اور فرائض منصبی کو انجام دینے کی تاکید کرے اور رفعت مراتب کا خیال کر کے اس کی کوتاہی سے چشم پوشی نہ کرے ابراہیم بن بطحا محتسب بغداد ابو عمر بن حمار کے مکان سے گذرے جو اس وقت قاضی القضات تھے اہل مقدمات کو دیکھا کہ ان کے انتظار میں دروازہ پر بیٹھے ہیں۔ دن چڑھ گیا۔ دھوپ میں گرمی آگئی دربان کو بلا کر کہا کہ قاضی القضات سے جا کر کہو کہ اہل مقدمات دھوپ میں بیٹھے ہوئے آپ کے انتظار کی تکلیف اٹھا رہے ہیں یا تو اجلاس میں آکر کام کیجئے یا ان کو عذر سے آگاہ کیجئے تاکہ پھر کسی وقت آئیں۔

غلام اور آقا اگر کسی غلام کا آقا اس سے اتنا کام لے کر وہ اسے ہمیشہ انجام دینے سے عاجز ہو تو جب تک غلام استغاثہ نہ کرے بطور نصیحت کے روکے اور جب محتسب سے داد خواہ ہو اس وقت سختی سے ممانعت اور تنبیہ کرے۔ مواشی سے اگر ایسا کام لیا جائے کہ دوامًا اس کو نہ کر سکیں تو اس کا انسداد اور آئندہ کو ممانعت کر دے اگرچہ کوئی استغاثہ یا شکایت نہ کرے۔

ملاحوں کو کشتیوں میں اتنا لادنے کی وسعت نہ ہو اور غرق ہونے کا خطرہ ہو ممانعت کر دے اسی طرح شدید ہوا کے وقت نہ چلنے دے اگر کشتی میں مرد اور عورتیں دونوں سوار ہوں تو دونوں کے درمیان پردہ ڈلوا دے اور کشتیوں میں وسعت ہو تو عورتوں کے لئے بول و براز کی جگہ بنوا دے تاکہ ضرورت کے وقت بے پردہ نہ ہوں۔

اگر معمولی بازاروں میں کوئی ایسا شخص ہو کہ اس سے صرف عورتیں معاملہ کریں تو محتسب تحقیق کرے اگر نیک چلن ثابت ہو تو تعرض نہ کرے اور اگر بدچلن معلوم ہو تو سزا دے اور ان سے معاملہ کرنے کی ممانعت کرے ایک قول یہ ہے کہ سزا افسران پولیس دیں اور ممانعت محتسب کرے کیونکہ یہ فعل زنا کے توابع میں سے ہے راستے کی دکانوں کے متعلق محتسب یہ انتظام کرے کہ جن سے گذرنے والوں کو تکلیف نہ ہو ان کو رہنے دے اور جن سے مضرت ہو ان کو اٹھا دے یہ استغاثہ پر موقوف نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ استغاثہ پر موقوف فرماتے ہیں راستے میں عمارت بنانے کی ممانعت کر دے اگرچہ راستہ وسیع ہو اگر کوئی بنائے تو منہدم کرا دے خواہ مسجد کیوں نہ بنائیں۔ کیونکہ راستے چلنے

منفعت کے لئے ہوتے ہیں۔ تعمیرات کے لئے نہیں ہوتے

اگر لوگ بوقت ضرورت سڑک پر اپنی چیزیں یا سامان عمارت ڈالیں تاکہ وہاں سے تھوڑی دیر بعد منتقل کریں اور اس سے چلنے والوں کو مضرت نہ ہو تو ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ اگر مضرت پہنچے تو ممانعت کر دی جائے اسی طرح چھجے نکالنے چھتے بنانے پر نالے لگانے سنڈاس کے کنوئیں بنانے کا حکم ہے مضرت نہ ہو تو رہنے دیں اور مضرت ہو تو ممانعت کر دے اور مضرت و عدم مضرت محتسب اپنے اجتہاد سے معلوم کرے کیونکہ اجتہاد عرفی ہے۔ شرعی نہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اجتہاد شرعی وہ ہے کہ اس کی اصل کا حکم شریعت سے ثابت ہو اور اجتہاد عرفی وہ ہے کہ اس کی اصل کا حکم عرف پر مبنی ہو اور یہ فرق ان مثالوں کے فرق سے زیادہ واضح ہوتا ہے جس میں محتسب کا اجتہاد چلتا ہے اور جس میں نہیں چلتا۔

جب مردے مملوکہ زمین یا مباح زمین میں دفن کر دیئے جائیں تو پھر محتسب وہاں سے منتقل نہ کرنے دے اور اگر منصوبہ زمین میں دفن ہو تو مالک زمین منتقل کرا سکتا ہے اور اگر زمین میں سیلاب یا پانی آجائے تو منتقل کرنے کے جواز میں اختلاف ہے زبیری جائز اور دوسرے علماء ناجائز کہتے ہیں۔ آدمیوں اور چوپایوں کو خصی کرنے کی ممانعت کر دے اگر اس سے قصاص یا دیت واجب ہو تو صاحب حق کو دلائے بشرطیکہ انکار و نزاع نہ ہو (اور اگر انکار و نزاع ہو تو حاکم فیصلہ کرے)

خضاب سیاہ خضاب کی ممانعت کر دے البتہ مجاہدین کے لئے اجازت ہے اور عورتوں کے لئے بھی اس قسم کے

خضاب بنانے والے کو سزا دے۔ یا مہندی اور کتم کا خضاب جائز ہے کہانت (غیب کی باتیں بتلاکر) اور کھیلوں سے کمانے کی ممانعت کر دے اور دینے اور لینے والوں دونوں کو سزا دے۔

اس فصل کو بسط سے بیان کرنا مشکل ہے کیونکہ منکرات کی جزئیات غیر محصور ہیں تاہم ہمارے مختصر بیان سے باقی تمام صورتوں کے احکام روشنی میں آسکتے ہیں احتساب درحقیقت اساس دین ہے صدر اول کے ائمہ عام فوائد اور اجر جزیل کے خیال سے اس کے فرائض خود بنفس نفیس انجام دیتے تھے لیکن جب سلاطین نے چھوڑ کر معمولی لوگوں کے حوالے کر دیا تو کھانے کمانے اور رشوت لینے کا ذریعہ ہو گیا لوگوں کے دلوں سے اس کی عظمت و ہیبت جاتی رہی۔

لیکن کسی قانون پر عمل نہ رہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا حکم ساقط ہو گیا فقہا نے اس کے بیان میں نامناسب بے توجہی سے کام لیا ہے اگرچہ ہماری اس کتاب میں بیشتر مباحث ایسے ہی ہیں۔ جن سے فقہا نے یا تو قطعاً اعراض کیا ہے یا پوری طرح ذکر نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ محض اپنے احسان و کرم سے ہمارے ارادے اور مقصود کو پورا فرمائے وہ ہمارے لئے کافی اور بہتر وکیل ہے۔